کشمیر اُداس ہے

محمود ہاشمی

قومی کتب خانہ نیا بازار راولپنڈی

قیمت 3 ۲.۰۰ روپے

کشمیر اداس ہے

محمود ہاشمی

پبلشر
قومی کتب خانہ راولپنڈی

بار اوّل ۱۵۰۰
قیمت تین روپے
۱۹۵۰ء

امتیاز کے نام

"ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو"

اعتراف

اگر پروفیسر محمود احمد اس کتاب کا بنیادی خیال نہ سمجھاتے ۔ تو یہ کتاب معرضِ وجود ہی میں نہ آتی ۔

اگر "نیا دور" اس کے ایک طویل باب کو چھاپنے کے بعد اصرار کر کے دوسرا تیسرا اور پھر چوتھا باب لکھنے کی متواتر ترغیب نہ دیتا تو غالباً یہ کتاب کبھی مکمل نہ ہو سکتی ۔

اگر "حلقہ اربابِ ذوق کراچی" نے اس کے تین باب تین نشستوں میں کچھ اس انداز سے نہ سنے ہوتے ۔ جیسے سننے والوں کے صبر کے امتحان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا ۔ تو مجھے شاید یہ کتاب چھپوانے کی ہمت نہ پڑتی

ترتیب

کچھ اس کتاب کے بارے میں

ا۔ تعارف

ب۔ پس منظر

تعارف

"کشمیر اُداس ہے" کے بارے میں یہ دو جملے لکھتے ہوئے مجھے کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی ——————

"کشمیر اُداس ہے"۔ اُردو کا بہترین رپورتاژ ہے۔

"کشمیر اُداس ہے"۔ ایک سچا رپورتاژ ہے۔

محمود ہاشمی کا یہ رپورتاژ پڑھنے کے بعد پہلی بات کے ماننے میں آپ کو کوئی تامل نہ ہوگا۔ دوسری بات کے بارے میں شاید آپ یہ کہیں کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ کسی رپورتاژ کو سچا رپورتاژ کہا جائے۔ رپورتاژ کا وصف ہی یہ ہے کہ اس میں حقیقی گزرے ہوئے واقعات ہوں۔ اور وہ سادگی سے اسی طرح بیان کئے جائیں جیسے کہ وہ گزرے ہوں۔ تاہم کسی رپورتاژ کے سچا ہونے میں واقعات کی صحت ہی نہیں صداقت بیان کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ بعض باتوں کو مصلحتاً دبانا، بعض کو عمداً اُبھارنا،

کسی بات کو دوسرے ہی رنگ میں پیش کرنا، غلط تفسیر اور بیان میں کچھ اس طرح کے اشارے کہ غلط اثر پیدا ہو —————— اسے علم قانون (JURISPRUDENCE) کی اصطلاح میں (SUPPRESSIO) اور SUGGESSTIO کہتے ہیں۔ یہ سچ کی صورت کو اس طرح مسخ کر دیتے ہیں کہ وہ سچ نہیں رہتا۔ کرشن چندر کے رپورتاژ "پودے" میں سچ کی صورت اسی طرح مسخ ہوئی ہے۔ رپورتاژ میں رنگ آمیزی مجرمانہ بن جاتی ہے۔ کیونکہ لکھنے والا اسے سچ کہہ کر پیش کرتا ہے۔ اور پڑھنے والا اسے سچ سمجھ کر پڑھتا ہے۔ اس لئے یہاں ادیب کی ذمہ داری دوچند بڑھ جاتی ہے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات آنا بڑا بھیانک سچ تھے۔ لیکن کیا فسادات پر لکھی گئی بیسیوں چیزیں سچی تھیں؟ یہاں ہمارے ادیبوں نے ذہنی ایمانداری سے کام نہیں لیا تھا۔ بس اس سے سروکار رہا کہ کہیں ہم پر جانب داری کا الزام نہ لگ جائے۔ اکثر افسانوں میں مصلحت اور ریاکاری صاف نظر آتی تھی۔ تخیّل، بنے گھڑے پلاٹ، مصنوعی توازن، یہ سب ہی سچ سے فرار کی راہیں تھیں۔

کشمیر کا مسئلہ بھی ایسا تھا کہ یہاں پھونک پھونک قدم رکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ایک طرف مصلحت اور ریاکاری سے اور دوسری طرف نفرت کے بے پناہ سیلاب سے بچ کر ایسی معروضیت قائم رکھنا کوئی معمولی اور آسان بات نہ تھی۔ لیکن یہ کتاب پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہاشمی صاحب نے کس فنی ضبط کا ثبوت دیا ہے۔ جموں والا حصہ کیسا نازک مرحلہ تھا!

"کشمیر اداس ہے"۔ اپنے مواد میں اتنا متمول ہے کہ اس سے ایک ناول کی تخلیق

ہو سکتی تھی۔ وسیع سیاسی پس منظر اتنے زیادہ اور ایسے متنوع کردار ڈرامائی موقعے اور داستان کی اثر انگیزی یقیناً ایک فنی تخلیق کے لوازم بن سکتے تھے۔ یہ بات بھی نہیں کہ ہاشمی صاحب میں قوتِ تخلیق نہیں۔ انہوں نے اگر "کشمیر اداس ہے" کا سارا پورتاژ لکھا ہے تو "انارکلی کی واپسی" کی سی شاندار فینٹسی بھی اردو ادب کو دی ہے۔ اور خود "کشمیر اداس ہے" میں ہمیں قدم قدم پر فنی شعور ملتا ہے۔ پھر بھی یہ ناول یا افسانہ یا ڈرامہ ہوتا تو یہ شک ضرور رہتا کہ ممکن ہے فلاں واقعہ یا کردار تخیل کی پیداوار ہو یا فلاں بات یونہی اثر بڑھانے کے لئے یا اپنے نظریے کو تقویت دینے کے لئے اپنی طرف سے بڑھائی گئی ہو۔ "کشمیر اداس ہے" رپورتاژ ہی کی صورت میں سچ ہونے کی وجہ سے زیادہ قیمتی بن گیا ہے۔

سچ میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ گو یہ ٹھیک ہے کہ فن حقیقت کو اس شکل میں ڈھال سکتا ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ اثر پیدا ہو۔ واقعات پر کہیں سایہ ڈال کر کہیں تیز روشنی پھینک کر، خاص ترتیب سے آگے بڑھا کر کئی اور طریقوں سے اثر بڑھایا جا سکتا ہے۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ صناعی کے بغیر سیدھے سادے سچ میں آرٹ سے زیادہ اثر انگیزی کی قوت ہوتی ہے۔ سامرسٹ ماہم اپنی WRITERS NOTEBOOK میں جو ابھی ابھی شائع ہوئی ہے ڈائریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ JULES RENARD میں تخلیقی قوت کچھ اس طرح مفقود ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ وہ ادیب بنا ہی کیوں؟ اس کے نہ تو ڈرامے اچھے ہیں۔ اور نہ ناول۔ ناولوں میں صرف ایک ناول اچھا ہے جو آٹو اگرانک ہے۔ اور اس ناول میں رینارڈ کا انداز نگارش جس میں کوئی صناعی نہیں زندہ نہیں،

اثر پیدا کرنے کی قوت نہیں، اپنی انتہائی سادگی میں [illegible] کو اور بڑھا دیتا ہے۔ اور جب رینارڈ کی وہ ڈائری جو وہ بیس سال سے لکھتا رہا تھا Journale کی صورت میں چھپی۔ تو معرکہ آرا چیز نکلی اور فرانسیسی ادب کا ایک چھوٹا سا ماسٹرپیس بن کر آئی۔

ڈائری ایک مستند ریکارڈ ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں وقت کی بات اسی وقت نوٹ کی جاتی ہے۔ اور کسی خاص وقت کا تجربہ اسی وقت لکھا جاتا ہے۔ ڈائری کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے۔ کہ ڈائری گویا اپنے لئے لکھی جاتی ہے اس میں لکھنے والا اپنے آپ سے مخاطب ہوتا ہے۔ دوسروں پر اس کی اشاعت اس کے لئے اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔ اور اگر رکھتی ہے تو اس صورت میں کہ اس کا لکھنے والا اپنے پیچھے یہ "سچ" چھوڑنا چاہتا ہے۔ جرنلز اکثر اس وقت شائع ہوتے ہیں جب انہیں لکھے ہوئے سال ہا سال گذر گئے ہوں۔ ڈائریاں تو مصنفوں کی موت کے بعد بھی چھپی ہیں، ڈائریاں موت کے منہ میں رہ کر بھی لکھی گئی ہیں جولیس فیوچک نے UNDER THE GALLOWS پھانسی کے سائے میں لکھی تھی۔ آرتھر کوسلر نے جب DIALO WITH DEATH لکھا وہ واقعی موت سے ہمکلام تھے۔ (یہ الگ بات ہے کہ وہ بعد میں رہا ہو گئے) ہاشمی صاحب نے یہ ڈائری نوٹس دشمن کے جنگل میں رہ کر لکھے ہیں۔ جس ماحول میں اور جن حالات کے تحت یہ نوٹ لکھے گئے ظاہر ہے، ان کا شائع ہونا ایک ناممکن امر تھا چنانچہ اب بچ کر آزاد کشمیر میں پہنچنے کے بعد ہی ان کے لئے یہ ممکن ہوا کہ ایک خاص ترتیب اور تسلسل سے یہ ڈائری نوٹس "کشمیر اداس ہے" کی صورت اختیار کر گئے

یہ ڈائری اسی وقت لکھی گئی تھی جب کشمیر میں آگ لگ چکی تھی۔

"کشمیر اداس ہے" ایک CRISIS کی پیداوار ہے۔ ہنگاموں کے دوران میں عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ تخلیقی تحریروں کی بجائے صحافت نگاری' اور صحافت نگاری اور فکشن کے درمیان کی چیزیں جیسے رپورتاژ ـــــ وغیرہ زیادہ رواج پاتی ہیں دوسری جنگ عظیم کے دوران میں کچھ نہیں تو انگریزی ادب ہی میں رپورتاژ اس کثرت سے لکھے جانے لگے تھے۔ کہ جان لیہمن لکھتے ہیں۔ انہیں خوف ہونے لگا تھا کہ کہیں انگریزی ادب میں ہمیشہ کے لئے یہی صنف حاوی نہ ہو جائے۔ پھر تو یہ ادب کے لئے ٹریجڈی ہو جائے گی۔ نیو رائٹنگ کے لئے ان کے پاس بے حساب رپورتاژ آتے تھے۔ "رپورٹ اوف دی ڈے" ایک مستقل عنوان بن گیا تھا۔ یہاں فسادات کے دوران میں ہر کسی کو رپورتاژ لکھنے کا خیال ہو گیا تھا جنگ انقلاب یا کسی اور قسم کے ہنگاموں کے دوران میں اچھے ادب کی تخلیق نہیں ہوتی۔ بلکہ جو چیزیں اس دوران میں اس ہنگامے پر لکھی جاتی ہیں۔ ان میں بھی وہ بات نہیں آنے پاتی جو مناسب زمانی فاصلے کے بعد لکھی گئی چیزوں میں ہوتی ہے۔ وقت اور ذہنی سکون مفقود ہوتا ہے۔ جو احساسات اور تجربات کو ایک ادبی حیثیت میں سمونے کے لئے از بس لازمی ہے۔ Emotion Recollected in Tranquility ان میں ٹھہراؤ ہوتا ہے' لیکن ہنگامہ کے دوران میں کہنے کو بہت کچھ ہوتا ہے۔ فوری طور پر کہہ دینے کی بے قراری ہوتی ہے اور لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کا موڈ ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے اردگرد کی اصل حقیقت دیکھنا اور دکھانا چاہتے ہیں۔ اور اس وقت فکشن کے جامے کے بغیر عریاں حقیقت میں اپیل ہوتی ہے

ویسے رپورتاژ بھی گزرے ہوئے واقعات کی روکھی پھیکی اخباری رپورٹ نہیں ہوتا۔ ایک اچھے رپورتاژ کو یقیناً ایسا ہونا بھی نہیں چاہیئے۔ ایک ہی واقعہ تین چار آدمیوں کے سامنے گزرتا ہے' اگر وہ سب اسے الگ الگ بیان کرنے لگیں تو ایک ہی واقعے کے بارے میں ہونے کے باوجود ان کے بیان ایک جیسے نہیں ہوں گے' اور یہ فرق صرف ان مختلف لکھنے والوں کے زبان اور اسلوب کا نہیں ہوگا ROBERT LIDDLE کی کتاب TREATISE ONTHE NOVEL میں ایک جگہ ایسی مثال ہے جہاں تین مختلف آرٹسٹ ایک اپاہج کے دیکھنے کا واقعہ بیان کرتے ہیں (یہ یاد رہے کہ یہ بیانات ان کے ناولوں سے نہیں لئے گئے ہیں بلکہ خطوں وغیرہ سے) پہلے فن کار نے اپاہج کی قابل رحم حالت کا نقش کھینچا ہے لیکن بیان میں ایک طرح کی کراہیت کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ اپاہج بھی کبھی تندرست رہا ہوگا' اس نے یہی گیت کبھی خوشی سے گایا ہوگا دوسرے فن کار کی توجہ اپاہج کے مردانہ حسن کی طرف جاتی ہے اور وہ اس میں وہ حیوانیت دیکھتا ہے جس کی طرف عورتیں کھنچ جاتی ہیں۔ تیسری آرٹسٹ اپاہج کو گاتے ہوئے دیکھ کر یہ زندگی کا تضاد محسوس کرتی ہے کہ زندگی کتنی نادر ہے۔ تلخ اور شیریں کرب ناک اور مسرت انگیز! پہلا آرٹسٹ سٹیونسن ہے' دوسرا جیسا یہ ظاہر ہے' ڈی ایچ لارنس ہے۔ اور تیسری آرٹسٹ کیتھرائن مینسفیلڈ۔ تینوں بیانوں میں کتنا نمایاں فرق ہے۔ یہ بیان مختلف اس لئے ہیں کہ ان فن کاروں کے موڈ' جذبات و احساسات' تاثر اور رد عمل سب مختلف ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح صرف ایک ایک پیراگراف میں ان کی شخصیتیں کھنچ

آئی میں آرٹسٹ کا ذہن ایک واقعہ کا جس طرح اثر قبول کرتا ہے۔ بیان اس کا عکس ہوتا ہے۔ اور جو چیز واقع کے ساتھ بیان میں شامل ہو جاتی ہے۔ وہ ہے لکھنے والے کی شخصیت۔ "خارجی" (Objective) رپورتاژ بھی جو کچھ گذرے۔ صرف اس کا بیان نہیں ہوتا۔ اور "داخلی" (Subjective) رپورتاژ میں تو واقعات کے علاوہ ان واقعات سے متعلق لکھنے والے کے اپنے تاثرات، جذبات و محسوسات بھی ہوتے ہیں۔ اس میں فن کار کی شخصیت کا پرتو اور زیادہ واضح ہوتا ہے "کشمیر اُداس ہے"۔ داخلی اور خارجی رپورتاژ کا بڑا حسین امتزاج ہے۔ اس میں یہ دو کولی عناصر بڑی خوبی سے ملے ہوئے ہیں۔ مصنف کے خیالات، محسوسات اور تاثرات کے بیان میں واقعات کی اہمیت کو کہیں نظر انداز نہیں کیا گیا۔ یہ محض ذاتی تاثرات اور محسوسات کا اکتا دینے والا بیان نہیں "کشمیر اُداس ہے" میں تو اس وقت کے کشمیر کا موڈ کھنچ آیا ہے۔ اور ایک رپورتاژ میں "وقت کے موڈ" کو گرفت میں اس طرح لے آیا۔ کہ یہ ایک دور کا آئینہ بن جائے ایک بڑی بات ہے۔

عام طور پر ہمارے یعنی اُردو کے رپورتاژ اگر خارجی کے تحت آتے ہیں تو ان کی صورت یہ ہوتی ہے۔ کہ بس بڑے کچے انداز میں بھونڈے پن سے واقعات بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ واقعات اہم ہوں یا بیکار، تفصیلیں جیسی کیسی بھی ہوں، سب شامل کر لی جاتی ہیں۔ اور رپورتاژ یونہی گھسٹتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر جب یہ داخلی ہوں تو تاثرات اور احساسات میں سستی جذباتیت ہوتی ہے اور ہسٹریائی رقت کا اُبال!

مغربی ادب میں تو خیر اچھے رپورتاژ کی کئی مثالیں ملتی ہیں یہاں ان کا ذکر یا ان کے نام گنوانا مقصود نہیں البتہ اردو کے رپورتاژوں پر آپ ایک نظر ڈالتے چلیے۔

سب سے پہلے کرشن چندر کے "پودے" ہی کو لیں۔ کیونکہ بعض لوگوں کے خیال میں یہ اردو کا پہلا رپورتاژ ہے میرے خیال میں تو "پودے" سرے سے رپورتاژ ہے ہی نہیں نہ یہ کوئی آرٹ فارم معلوم ہوتا ہے۔ جیسے "کشمیر اُداس ہے" پڑھ کر یہیں احساس ہوتا ہے کہ اسے محض رپورتاژ کہنا ناانصافی ہے۔ بلکہ یہ تو آرٹ فارم ہے لیکن "پودے" میں سنٹمنٹ فلموں کی سی بات ہے۔ سستی جذباتیت سستا مزاح، سرکس کے مسخروں کے سے کردار اور پھر ایک مرکزی کردار کو پہلے ولین بنانے کی پوری کوشش کے بعد اچانک اچھال کر رات کی رات ہیرو بنا دیا گیا ہے۔ رنگ آمیزی کے لئے ڈیڑھ صفحے کی شفق کی منظر کشی ہے، مجبو باؤں کے لئے مراد آبادی پاندان اور پھولوں کے گجرے خریدے جا رہے ہیں، سرد آہیں بھری جا رہی ہیں۔ اور یہ رپورتاژ ہے جو ادیبوں کی ایک کل ہند کانفرنس کے متعلق ہے! ادیبوں کی یہ کل ہند کانفرنس اکتوبر ۱۹۴۵ء میں حیدر آباد دکن میں منعقد ہوئی تھی۔ یہ ایک کافی بڑی اور اہم کانفرنس تھی۔ اور اس میں عصر حاضر کے تقریباً سبھی چھوٹے بڑے ادیب شریک تھے۔ ایک ادبی کانفرنس کے بارے میں رپورتاژ سے یہ توقع۔ کہ یہ کوئی مرزا فرحت اللہ بیگ کے ۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ کی سی چیز ہوگی۔ اور اگرچہ کرشن چندر سے "دلی کا مشاعرہ" کے پایہ کی چیز کی توقع رکھنا بے کار تھا، تاہم توقع صرف اس کی تھی کہ نوعیت کے اعتبار سے یہ رپورتاژ ایسا ہوگا۔

"...... دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ میں شاعرے کا جو نقش کھینچا ہے۔ وہ ایک جواب اور زندہ نقش ہے۔ اس میں دلی، وہ دلی کی تہذیب ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے

اس میں دہلی کے آخری دور کے شعرا کو جمع کیا ہے۔ اس میں بہادر شاہ ظفر بھی ہیں اور غالب ذوق، مومن سے لے کر سبھی چھوٹے بڑے شعرا موجود ہیں۔ فرحت اللہ بیگ تمہید میں لکھتے ہیں "ان چراغ ہائے سحری کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اُردو کے لئے ان سے ایک ایسا چراغ روشن کر لوں جس کی روشنی میں آنے والی نسلیں زبان اُردو کے ان محسنوں کی شکلیں دیکھ سکیں"۔ اور یہ واقعی ایک ایسا چراغ ہے اور ان خفتگان خاک کاملین فن کا ایک ایسا مرقع ہے جو بزم اُردو میں سجانے کے قابل ہے۔ لباس، وضع، قطع، شکل وصورت، نشست وبرخاست کے طریقے، حرکات و سکنات، آواز کی کیفیت، اور اُن کی طبائع کے رنگ سے یہ سب شاعر زندہ ہو کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ شاندار مشاعرہ اتنا حقیقی معلوم ہوتا ہے کہ ہم اسی دھوکے میں رہتے ہیں کہ یہ مولوی کریم الدین ہی کا بیان ہے جنہوں نے یہ مشاعرہ منعقد کیا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ محض بزرگوں کی سنی سنائی باتوں سے اس زمانے کے ایک دو مشاعروں کا حال پڑھ کر ان میں سے چند شعرا کی تصویریں دیکھ کر یہ نقش کیسی خوبی سے کھینچا گیا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے ایک فرضی مشاعرے کو اپنی قوت تخلیق اور کمال بیان سے ایک زندہ حقیقت بنا دیا ہے لیکن کرشن چندر نے حقیقت کو سٹنٹ فلم میں تبدیل کر دیا ہے۔ کرشن چندر ادیبوں کا تعارف یوں کراتے ہیں کہ فلاں کی مسکراہٹ میں چاندنی ہے، نور ہے، کنول ہیں۔ فلاں کی مسکراہٹ میں دوشیزگی ہے۔ فلاں سرمئی کبوتر ہے۔ اور فلاں مجسم تنا ہوا اُمنگا۔ کانفرنس کا نقش اس میں کہیں کھنچا ہی نہیں۔ کراؤن ایک چوتھائی سائز کے بائیس صفحات کے رپورتاژ میں آدھے سے زیادہ صفحات

محض سفر اور واپسی کی تفصیلات اور چند دوسری غیر ضروری تفصیلات سے پر ہو گئے ہیں۔ کانفرنس کے لئے صرف تین چار صفحے ہی کافی سمجھے گئے ہیں چنانچہ جب کرشن چندر سٹیج پر آ کر اپنی تقریر سے جادو جگاتے ہیں اور ہزاروں سامعین کو مسحور کر کے سٹیج سے چلے جاتے ہیں تو پھر آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ "دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ تیسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ چوتھے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ اور قصہ ختم۔

پودے کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سچا رپورتاژ ہے خصوصیت سے وہ لوگ جو اس کانفرنس کے دوران میں کرشن چندر کے ساتھ رہے ہیں خوب جانتے ہیں۔ کہ اس میں سچائی نہیں بلکہ یہ وہ چیز ہے جو قانون کی نگاہ میں جھوٹ ہی کی دوسری صورت ہے ——— SUPPRESSIO VERI اور SUGGESSTIO FALSI۔ سچ کہ ریاکاری سے اتنا بعد ہے جتنا شاید جھوٹ سے بھی نہیں۔ ادیب راجہ شام راج کے ہاں مدعو ہیں۔ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ ایک جاگیردار نے اس طرح سے اُن کی توہین کی ہے۔ وہ بے چین اور مضطرب ہیں کہ ایک جاگیردار کی دعوت میں آگئے ہیں عرق انفعالیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کی بُری حالت ہوئی جا رہی ہے ——— تو صاحب گئے ہی کیوں؟ آخر یہ ریاکاری کیوں؟ ——— اور رپورتاژ کے آخر میں جہاں کرشن چندر نے ایک بڑی قربانی سے جذباتی بلندی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ہمیں اس کا اور بھی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ریاکاری اپنی انتہا پر پہنچ گئی ہے۔

کرشن چندر کے لئے ایک انسانی زندگی کتنی سستی ہے!

ای۔ ایم۔ فارسٹر نے ایک جگہ کہا ہے "اپنے ملک سے غداری یا اپنے دوست سے غداری اگر مجھے ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو تو میں یقیناً اول الذکر کا انتخاب کروں گا"

ای۔ ایم۔ فارسٹر نے ایک انسانی زندگی کی قیمت بہت اونچی رکھی ہے اگر واقعی ملک و قوم کا سوال ہو تو فارسٹر سے ہمیں اتفاق نہیں لیکن پردے میں کوئی میدانِ کارزار تو تھا نہیں کہ ایک طرف قوم و وطن اور دوسری طرف ایک انسانی زندگی کا سوال پیدا ہوتا۔ بات صرف اتنی تھی کہ ایک صاحب کانفرنس کے انتظامات ہی میں لگے رہے جب کہ اُن کی بہن بسترِ مرگ پر تھی اور بالآخر وہ مر گئی۔ کرشن چندر نے اپنی طرف سے یہ تشریح کی ہے کہ ادیبوں کی اس کانفرنس کے لئے، لہٰذا ادب کے لئے ایک انسانی جان کی قربانی دی گئی" اس کی بہن مر جائے لیکن غالب زندہ رہے اس کی بہن مر جائے لیکن اقبال زندہ رہے اس کی بہن مر جائے لیکن ٹیگور زندہ رہے اس کی بہن مر جائے لیکن ادب زندہ رہے فی الحال اس سی بات سے قطع نظر کہ اس کانفرنس کے موقعہ پر ایک لڑکی کی موت میں اور ان بڑے ادیبوں کے اور ادب کے زندہ رہنے میں کیا رشتہ ہو سکتا ہے یوں بھی کرشن چندر کی یہ تشریح قبول کرنے سے پہلے کئی سوال ہمارے ذہن میں آتے ہیں ——

۱۔ کیا کانفرنس کے انتظامات اور ادیبوں کو سیریں کرانے اور پارٹیوں میں لے جانے کے انتظامات کسی اور کے سپرد نہیں کئے جا سکتے تھے۔ اور اتنا چندہ جو کہ صاحب نے دیا کہیں اور سے فراہم نہیں ہو سکتا تھا؟

۲۔ اگر یہ قربانی ہی تھی تو آخر کس کے لئے دی گئی؟ ادب کے لئے یا اپنے لئے؟ زیادہ چندہ دینا اور کانفرنس میں سامنے سامنے رہنا زیادہ اہم تھا یا ایک مرتی ہوئی بہن کا علاج اور دیکھ بھال؟

۳۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ یہ قربانی کانفرنس اور ادیبوں کے لئے ہی تھی تو کیا یہ ادیب جو کانفرنس میں شریک تھے، انسانیت کے اتنے بڑے محسن تھے جو ان کے لئے ایک انسانی جان کی قربانی حق بجانب تھی؟

اور کرشن چندر نے اس قربانی کو حق بجانب ہی نہیں قابلِ ستائش بھی قرار دیا ہے۔ یہ تو صریحاً غلط اقدار قائم کرنا ہے۔ ایک انسانی جان کی قربانی کس لئے؟ محض اس لئے کہ ادیب چند دن وہاں موج اڑائیں؟ کاروں میں سیریں کریں؟ ٹی پارٹیاں اور ڈنر اڑائیں؟ کس اطمینان سے کرشن چندر نے یہ قربانی قبول کی ہے۔ کس بے حسی بلکہ بے دردی سے ایک انسانی جان کی قیمت چکائی ہے! —— قحطِ بنگال میں لاکھوں تڑپ تڑپ کر مرے۔ ایک افسانے کے لئے بہت اچھا موضوع ہاتھ آیا۔ فسادات میں لاکھوں مرے وحشیانہ طور پر قتل کئے گئے۔ اس سے ایک مجموعے کے لئے مواد فراہم ہوا۔ اور اگر ملک پر کوئی دشمن حملہ کر دے۔ تو پھر کیا کہنے ادب پر بہار ہی آ جائے۔

جب عسکری نے کرشن چندر کا یہ جملہ منٹو کے "سیاہ حاشیے" کی حاشیہ آرائی میں لکھا تھا۔ تو ہمارے کچھ بھائی "شکر خورے کو شکر" والی تشبیہ پر تنبا کر ان پر پل پڑے۔ اور انہوں نے طرح طرح سے اُن پر حملے کئے لیکن کسی کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ عسکری صاحب سے صاف صاف پوچھ ہی لیں کہ کیا کرشن چندر نے واقعی

یہ جملہ کہا تھا اور اگر کہا تھا تو یہ رد یہ کس قدر انسان کش ہے!

لگے ہاتھوں کرشن چندر کا ایک اور جملہ بھی سُن لیجئے۔ یہ ایک ترقی پسند رسالے میں بھی، بڑے اہتمام سے چھپ بھی چکا ہے۔ جب کرشن چندر کو یہ بتایا گیا کہ فسادات کے دوران میں شاہد احمد دہلوی ایڈیٹر ساقی کے بارے میں جو افواہ اڑی تھی وہ غلط تھی اور شاہد صاحب زندہ ہیں تو کرشن چندر کا پہلا جملہ یہ تھا کہ "ارے بھئی بہت اچھا کیا جو تم نے بتا دیا ورنہ میں ایک مضمون لکھنے والا تھا جس کا عنوان ہوتا "آہ شاہد احمد دہلوی!" کرشن چندر کے لئے انسانوں کی موت ہمیشہ صرف ایک موضوع رہی ہے، صرف ایک عنوان، صرف ایک سرخی ——— پودے میں کرشن چندر کہتے ہیں۔ ایک لڑکی کے زندگی کے لہو نے ادب کو سرخ کر دیا۔ اور کچھ ہوا ہو یا نہیں کرشن چندر نے ایک پھیکے سے رپورتاژ میں اس لہو سے رنگ بھرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔

بعض لوگوں کی نظر میں پودے کی عظمت" کا جو راز تھا اس کی حقیقت یہ ہے پھر بھی تعجب ہے کہ احتشام حسین کے سے نقاد نے "پودے" کو ایک اچھا اور بہت اہم رپورتاژ قرار دیا اور "کشمیر اداس ہے" کے ایک باب "پیر پنجال کے قیدی" کی اہمیت کو مانتے ہوئے بھی اسے "پودے" کے مقابلے میں ثانوی حیثیت دی حالانکہ "پودے" کا "کشمیر اداس ہے" یا اس کے کسی ایک حصے سے بھی کوئی مقابلہ نہیں۔ "پودے" کو لوگوں نے اردو میں ایک بالکل نئی چیز، ایک نیا اور اہم تجربہ اور اردو کا پہلا رپورتاژ سمجھا۔ پھر کیا تھا، رپورتاژ لکھے جانے لگے۔ اور بالکل اسی انداز میں۔ اسی طرح ٹرین کے سفر سے آغاز ہونے لگا۔ ہر رپورتاژ کا موضوع بھی کوئی نہ کوئی کانفرنس بنی۔

کبھی رائے پور کی کانفرنس کبھی احمد آباد کی کانفرنس بھوپال کی کانفرنس امن کانفرنس وغیرہ وغیرہ بلکہ ایک رپورتاژ میں تو اس طرح کی ایک اور قربانی بھی دلائی گئی (اب کے پھوٹے بھائی تھے) بہرحال جیسا نمونہ تھا۔ ویسی ہی سستی نقلیں بنیں! فسادات کے بارے میں البتہ دو ایک اچھے رپورتاژ اور چند وقتی اثر انگیز افسانے لکھے گئے۔ جو ادبی اور فنی لحاظ سے بھی اچھے تھے ——— مثلاً قدرت اللہ شہاب کا افسانہ "یا خدا" اور شاہد احمد کا رپورتاژ "دلی کی بپتا"۔ دلی کی بربادی اور دلی کی آٹھ سو سالہ تہذیب کی موت کی یہ درد انگیز تصویر کھینچنے میں شاہد احمد نے اپنی طرف سے اثر بڑھانے یا فنی انداز اختیار کرنے کی کہیں کوشش نہیں کی۔ جو چیز "دلی کی بپتا" کو ممتاز بناتی ہے وہ اس کی سادگی، سچائی اور بے پناہ خلوص اور سچا درد ہے۔ جب نیا دور نے "دلی کی بپتا" کو رپورتاژ کہا تو شاہد صاحب نے کہا مجھے نہیں معلوم یہ رپورتاژ ہے یا کیا۔ یہ بس ایک سچی داستان ہے۔ ذاتی داستان ہونے کے باوجود اس میں کمال ضبط، نظم اور توازن ہے۔ اور شاہد صاحب کی زبان و اسلوب کے تو کیا کہنے! فکر تونسوی کے "چھٹا دریا" میں بس جذباتیت ہی جذباتیت ہے۔ تاجور سامری کا "جب بندھن ٹوٹے" گو ہے تو سپاٹ بیانیہ اور Daily mail کی رپورٹ۔ لیکن جہاں کہیں تاجور سامری نے اپنی طرف سے اثر بڑھانے یا افسانویت یا ڈرامائیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہاں اثر اور کم ہو گیا ہے۔ غالباً ان کے لئے سیدھا سادھا بیان ہی موزوں تھا۔ اس رپورتاژ کے وہی حصے موثر بھی ہیں جن میں واقعات کا سیدھا سادھا بیان ہے۔ ابراہیم جلیس کا "شہر" اور دوسرے رپورتاژوں میں وہی گھسنے

"کشمیر اُداس ہے" ایک اچھا بیانیہ (Narrative) ہے۔ اچھے بیان اور Daily mailish تحریر میں بہت فرق ہے۔ بیان مصوری کی طرح ایک تیسرا بُعد تلاش کرتا ہے جس طرح مصوری میں تناظر (Perspective) ہوتا ہے بیانیہ کے فن میں فضا ہوتی ہے۔ ایک اچھے بیانیہ میں ماضی منظروں کے ذریعہ حال میں تبدیل ہوتا ہے۔ "کشمیر اُداس ہے" میں یکے بعد دیگرے منظر (scenes) کھنچتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں بیان گویا صاف روشن، vivid تصویروں کا ایک سلسلہ ہے اور "فضا" (atmosphere) جو "کشمیر اُداس ہے" میں ہے، ہرگز ایک رپورتاژ میں پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ اور نہ کردار اس طرح ابھر سکتے تھے۔

کردار کی تخلیق آرٹ کی ایک اور پہچان ہے۔ "کشمیر اُداس ہے" میں بے شمار بھانت بھانت کے کردار ہیں ——— ہوم گارڈز ہیں، ہندوستانی فوجی ہیں، نیشنل کانفرنس کے افسر ہیں، کٹر ہندو ہیں، مسلمان عوام ہیں ——— اور ان سب کو کامیابی سے سنبھالا گیا ہے۔ ہر کردار کی اپنی اپنی جگہ ہے۔ اور چند ایک مرکزی کردار تو خوب ابھرے ہیں۔ مثلاً اپورب۔ اپورب ایک مکمل ہیرو ہے ——— ایک ٹریجک ہیرو۔ ایک اپورب کی تخلیق فن ہی کر سکتا تھا۔ (کرداروں کے ذکر کے ساتھ ایک اور بات ہماری توجہ کے قابل ہے۔ اردو کے رپورتاژوں میں لکھنے والے خود اپنے کردار کو ایک فکشن توائے اصلی

لے

آندرے مالرو نے یہاں ٹی ای لارنس کے بارے میں لکھتے ہوئے کہ کیسے عرب بغاوت پر اُن کی کتاب Pillars of wisdom اچھا دستاویزی بیان ہے لیکن بڑا بیانیہ نہیں، اچھے بیانیہ کی خصوصیات گنائی ہیں

کا انداز ہے۔ البتہ ان کے "دو ملک ایک کہانی" کا جو حصہ چھپا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رپورتاژ کافی اچھا اور اثر انگیز ہوگا (ڈانٹنے ڈپٹنے کے بدلے اسے چمکاری سمجھ لیجئے)۔

اُردو میں جیسے رپورتاژ لکھے گئے ہیں اس کے پیش نظر یہ کہنا کہ "کشمیر اُداس ہے" اُردو کا بہترین رپورتاژ ہے اس کے لئے کوئی ایسا compliment نہیں "کشمیر اُداس ہے" کا مقام اُردو کی چند ایک بہت اچھی تخلیقی تحریروں کے ساتھ ہے اور دراصل "کشمیر اُداس ہے" محض رپورتاژ ہے بھی نہیں۔

اُسے محض رپورتاژ کہہ کر محمود ہاشمی صاحب نے خاکساری برتی ہے۔ ورنہ یہ اچھا خاصا افسانہ ہے ——— حسن عسکری نے "نفرت کے درمیان" کے بارے میں کہا۔ اور صمد شاہین نے "پیر پنچال کے قیدی" کے بارے میں کہ اس رپورتاژ پر اس کے تسلسل، تواتر اور ترتیب سے ایک مکمل افسانے کا گمان ہوتا ہے ——— اور اب "کشمیر اُداس ہے" کو اپنی تکمیل میں دیکھ کر بھی یہی احساس ہوتا ہے کہ یہ محض رپورتاژ نہیں، اس سے اونچی چیز ہے، یہ آرٹ کی سطح پر ہے۔

"کشمیر اُداس ہے" میں سیاست اور تاریخ فن میں پیش ہوئی ہے۔ جہاں سیاست اور تاریخ سے واسطہ ہو وہاں عموماً یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والے کی انقلابی شخصیت جمالیاتی شخصیت پر فتح پا جاتی ہے، اور دستاویزی عنصر فنی عنصر پر حاوی ہو جاتا ہے ہم محسوس کرتے ہیں کہ فلاں چیز اچھی تاریخ ہے، اچھا ادب نہیں۔ "کشمیر اُداس ہے" میں یہ دونوں باتیں ہیں۔ دستاویزی حیثیت سے بھی یہ کچھ کم اہم نہیں کیونکہ سیاسی اعتبار سے کوئی ایسی اہم بات نہیں جس کی طرف محمود ہاشمی نے اشارہ نہ کیا ہو۔ لیکن یہاں فن نے دستاویز سے شکست نہیں کھائی۔ اس میں ڈوکیومنٹری اور آرٹ کا صحیح امتزاج ہے۔

نام ہوئے کہ صیغہ واحد غائب میں رکھنے کا ہو گیا ہے چنانچہ اپنے آپ کو سب سے اوپر اور سب کے سامنے سامنے رکھتے ہیں لیکن اس رپورتاژ میں دیکھئے۔ محمود ہاشمی نے اپنے آپ کو کس طرح بہت پیچھے پس منظر میں رکھا ہے۔)

"کشمیر اداس ہے" میں حسن ہے۔ حسن "احتیاط" سے ایک تناسب اور ہیئت دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ایک کم کامیاب فن کار کے ہاتھوں یہ احتیاط "دقت" کا احساس دلاتی ہے۔ اور جب دقت کا احساس ہو تو پھر اس میں حسن باقی نہیں رہتا۔ "کشمیر اداس ہے" میں احتیاط کے ساتھ ساتھ ایک ایسا فطری بہاؤ اور خود روی Spontaneity ہے، جو اس میں حسن پیدا کر دیتی ہے۔ سب کچھ جوڑ کر بنے بنائے سانچے میں بٹھانے سے ایک "پیاٹرن" کا احساس تو ہوتا ہے۔ "فارم" کا نہیں لیکن "کشمیر اداس ہے" میں فارم ہے۔ اور یہ سب باتیں اسے ایک رپورتاژ کی سطح سے بلند کر کے تخلیقی تحریر کے قریب لے آتی ہیں۔

"کشمیر اداس ہے" کو اس نوع کی تحریر کہا جا سکتا ہے جو تخلیقی تحریر اور رپورتاژ کی درمیانی چیز ہوتی ہے۔ یہ نوع اپنی بہترین صورت میں ہمیں کرسٹوفر اشروڈ کے ہاں نظر آتی ہے۔ اشروڈ نے ایسی تحریر کو بالکل اپنا لیا ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثال ان کی "گڈ بائی ٹو برلن" GOOD BYE TO BERLIN کی کہانیاں ہیں "کشمیر اداس ہے" میں اور "گڈ بائی ٹو برلن" میں کچھ ایسی مناسبت اور مشابہت ہے کہ فوراً ہی ان کی یاد آ جاتی ہے۔ یہ فرق ضرور ہے۔ کہ "کشمیر اداس ہے" میں سب کچھ سچ ہے۔ اشروڈ کی تحریر پر بھی سچ کا گمان ہوتا ہے۔ اور کہانی میں خود اشروڈ کی موجودگی اور بالکل ذاتی داستان کا سا انداز بیان دلکشی پیدا کرنے کے علاوہ اسے بالکل حقیقی

رنگ دیتا ہے۔ لیکن اصل میں بات یہ ہے۔ کہ ان کا صرف پس منظر حقیقی ہوتا ہے اس پس منظر پر جو کچھ وہ ابھارتے ہیں۔ وہ ان کی اپنی تخلیق ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ان داستانوں میں خود اشروڈ کا کردار بھی بالکل اصلی نہیں۔ بلکہ کہانیوں کا کردار ہے۔ محمود ہاشمی کے طرز نگارش میں اشروڈ کا رنگ ہے۔ وہی حساس تحریر، وہی چاشنی، وہی روانی، تازگی، شگفتگی پھر شوخی اور شرارت کے ساتھ بلا کی معصومیت اور بھولپن بھی ہے ان کی بات بظاہر تو بڑی ہلکی پھلکی، لطیف اور مزاحیہ سی ہوتی ہے لیکن اصل میں یہ بڑی گمبھیر اور بھرپور ہوتی ہے۔ مثلاً "بھونچال کے قیدی" میں "اپورب" ان سے پوچھتا ہے۔ کہ گندے انڈوں کا کیسے پتہ چلایا جاتا ہے۔ ہاشمی بڑے ہی بھولپن سے جواب دیتے ہیں۔ "پانی میں ڈال کر۔ عام طور پر اچھے انڈے زیادہ ہوتے ہیں، اگر زیادہ انڈے ڈوب جائیں تو ڈوبنے والے اچھے ہیں، اگر زیادہ تیرتے رہیں تو سمجھو کہ یہی اچھے ہیں" ——— کتنا اہم سیاسی اشارہ ہے! اپورب کی گندے انڈوں سے ففتھ کالمسٹ مراد تھے ہاشمی انڈوں ہی کی اصطلاح میں اسے یہ سمجھاتے ہیں کہ اگر کشمیری عوام کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ وہ پاکستان سے وابستہ ہیں، کشمیر پاکستان کا ایک حصہ ہے۔ تو اکثریت ہی راستی پر ہے۔ پھر ہم خواہ مخواہ یہ کیوں سمجھیں کہ ساری سچائی اور اچھائی ہماری طرف ہے؟۔

اشروڈ کی طرح اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے ڈائلاگ ہی ڈائلاگ میں کرداروں کی زبانی بہت کچھ واضح کر دینا بھی محمود ہاشمی کا خاصہ ہے اور پھر اشروڈ کی تحریروں کی طرح ہم "کشمیر اداس ہے" میں ہلکے پھلکے معصوم انداز کے پیچھے بڑی بڑی اہم حقیقتیں دیکھتے ہیں اور ذاتی داستان کے پیچھے ہمیں ایک بڑا وسیع سیاسی پس منظر بھی نظر آتا ہے۔ "گڈ بائی ٹو برلن" میں شلر

سے پہلے کے برلن کی بھرپور تصویر ہے' نازیت کا آغاز ہے۔ جرمنی کے عام لوگوں کے لئے وہاں کی سیاست کیا معنی رکھتی تھی۔ ان کی روزمرہ کی زندگی پہ اس کا کیا اثر پڑا تھا۔ یہ سب کچھ ہے...... 'کشمیر ایک قیامت سے گذر رہا تھا۔ ایک طرف ظلم اور استبداد' دوسری طرف محکومیت اور مظلومیت' پھر آزادی کی جدوجہد' اس جدوجہد اور عوام کی قوت کو کچلنے کی کوششیں ہیں' ان قوتوں میں تصادم ہے' جنگ ہے ——— یہی کیفیت 'کشمیر اُداس ہے' کی بھی ہے وہ کشمیر جو ابھی آزاد نہیں ہوا ہے۔ ایک آہنی گرفت میں تھا۔ وہاں نعرے لگ رہے ہیں' بلند بانگ دعوے کئے جا رہے ہیں۔ پروپیگنڈا زوروں پر ہے۔ عوامی راج' عوامی راج کی دُہائی دی جا رہی ہے۔ لیکن کشمیر کیا محسوس کر رہا ہے؟ کشمیری عوام کی کیا حالت ہے وہ اس ہنگامے میں' ان نعروں میں' ان دعووں میں حصہ نہیں لے رہے۔ ان کے لئے دکھ ہیں۔ اور مصیبتیں ہیں۔ بے بسی' مجبوری اور خاموشی ہے ——— یہی چیز ہے جسے ہاشمی گرفت میں لائے ہیں۔ ہاشمی نے اپنی طرف سے نہ کوئی سیاسی تھیوری پیش کی ہے اور نہ داستان کو سیاسی COMMENTS سے بوجھل کیا ہے۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں' وہ کرداروں کی زبان سے جانتے ہیں' ہاشمی سیدھے سادے روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات بیان کرتے چلے گئے ہیں' لیکن انہیں ان واقعات کی اہمیت اور وقعت کا احساس ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہم ان کے ہاں وہاں کی اصل زندگی سے دوچار ہوتے ہیں' وہاں کی اصل حالت دیکھ پاتے ہیں۔ اور ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس جانب کے پروپیگنڈے کی چیخ و پکار اور آہنی پردے کے اندر کیا کچھ ہو رہا ہے۔ "یہیں ہم اس دھوکے کو پوری طرح بے نقاب پاتے ہیں

جو وہاں کے عوام کو دیا گیا ——— جو ایک حقیقی انقلاب اور عوام کی نمائندہ اور محبوب حکومت کے نام سے دیا گیا۔ 'کشمیر اُداس ہے' اس سراب کی بھرپور تصویر ہے۔

یہاں ہمیں شیخ عبداللہ کے ایک ہوم گارڈ ہی کے بیان میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عبداللہ کی ہوم گارڈ بھی کتنا بڑا شو تھی ڈمی بندوقیں لئے پریڈ کرتی لڑکیاں' فیکٹریوں کے مزدور جو چند ٹکوں کی آس میں ہوم گارڈز میں اس لئے بھرتی ہو گئے تھے۔ کہ فیکٹریاں بند ہو جانے پر وہ بے روزگار تھے۔ ہوم گارڈز کی اکثریت مسلمان تھی لیکن ان پر افسر ہمیشہ ہندو رکھے جاتے تھے۔ کہ کہیں یہ سارا گروہ غداری نہ کر بیٹھے۔ اور حملہ آوروں سے نہ جا ملے۔ جہاں کہیں بھی یہ ہوم گارڈز جاتے تھے' بےکار اور معطل رہتے تھے' اور لوگ ان سے نفرت کرتے تھے مسلمان اس لئے کہ یہ ان میں سے نہ تھے' ان کے جذبات واحساسات کی نمائندگی نہ کرتے تھے ہندو اس لئے کہ یہ ان کے اس کام میں رکاوٹ تھے جو انہوں نے سیوک سنگھیوں کے ساتھ مل کر شروع کر رکھا تھا۔ ہوم گارڈز کے بھیس میں راشٹریہ سیوک سنگھیوں کی پریڈ کرائی جاتی تھی۔ ہم یہاں اُن ہندوستانی فوجیوں سے بھی ملتے ہیں جو کشمیری عوام کو قبائلی حملہ آوروں سے آزاد کرانے کے لئے آئے ہیں۔ لیکن جن کا سلوک وہاں کے لوگوں کے ساتھ ایسا ہے جیسا کسی OCCUPATION ARMY کا ہو سکتا ہے۔ وہ عوام کو اسی طرح لوٹ رہے ہیں۔ ان کے لئے لوگوں سے کھانے پینے اور دوسری ضروریات کی چیزیں چھینی جا رہی ہیں۔ ہندوستانی مقبوضہ کشمیر میں عوام بھوکوں مر رہے ہیں۔ کیونکہ سب کچھ ہندوستانی

فوجیوں نے لئے سٹور کیا جا رہا ہے۔ حکومت کے افسر اور نیشنل کانفرنسی اُن کی آؤبھگت اور خوشامد میں لگے ہیں۔ اور عوام؟ عوام ان سے ڈرے سہمے ہیں، اور دل ہی دل میں ان سے نفرت کرتے ہیں، ان فوجیوں کی باتوں سے ہندوستانی فوج کے موریل Morale کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ پھر ہم یہاں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جہاں دو قوموں کی تھیوری کی اس زور شور سے مذمت کی جا رہی ہے۔ وہاں دو مختلف قوموں کا احساس کتنا گہرا ہے۔ کیسے چھوٹی سی چھوٹی بات میں ہندو مسلمان کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ اور یہ ڈھونگ محض اس لئے رچایا جا رہا ہے۔ کہ ایک قوم اور وہ بھی اتنی بڑی اکثریت والی قربان کر دی جائے پھر ہمیں اس ریاکاری، اس نقاب اور اس دھوکے سے ہٹ کر خود کشمیر کے عوام کے جذبات و احساسات کا اندازہ بھی لگتا ہے۔ کہ وہ کس طرح اس محکومی سے آزاد ہونا چاہتے ہیں، اور اپنے مستقبل کو پاکستان سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ہمسایہ ملک کے وہ سامراجی اور جارحانہ عزائم بھی بے نقاب ہوتے ہیں، جن پر بلند آدرشوں کا نقاب اُڑھایا گیا ہے ——— کشمیری عوام کی حفاظت، سرزمین کشمیر کو "حملہ آوروں" سے پاک کرنے کا عزم مذہبی تفریق اور "دو قوموں کی تھیوری" کی مذمت اور انسانیت اور بھائی چارے کا پرچار ——— سامراجی قوتیں اپنے جارحانہ عزائم پر اسی طرح بلند آدرشوں کا نقاب اڑھاتی ہیں، اور اس طرح اچھے آدمیوں کے شریفانہ جذبات کو اُکسا کر اپنا کام نکالتی ہیں کتنی بڑی ٹریجڈی ہے۔ کہ یہ لوگ اپنے خواب اپنے آئیڈیلز، اپنی امید دل کو ان سے وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ ان "بلند آدرشوں" کے لئے لڑ بھی رہے ہیں۔

لیکن جب انہیں ان بلند آدرشوں کے پیچھے سامراجیوں کے اصل ارادے نظر آتے ہیں تو ——— یہ ٹریجڈی اپوربا میں مجسم ہو گئی ہے۔ اپوربا جو آئیڈیلسٹ ہے ان باتوں پر ایمان لے آتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ نیشنل کانفرنس سیدھے راستے پر ہے، شیخ عبداللہ کی حکومت عوامی حکومت ہے، اور ہندوستان کشمیری عوام کی حفاظت کر رہا ہے۔ اور وہ سب ایک صحیح مقصد لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ محمود ہاشمی کو برسرِ اقتدار میں لانے کا ذمہ دار بھی اپوربا ہے۔ شروع شروع میں اپوربا کو گندے انڈوں کا خیال بھی پریشان کرتا ہے...... لیکن آہستہ آہستہ اس پر اصل حقیقت واضح ہوتی جاتی ہے، یہ کتنا بڑا دھوکہ تھا، محض ایک سراب! چنانچہ آخر میں وہ اپنی حالت کو غالب کے ایک شعر کے مصداق بتاتا ہے۔ ؎

مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

اس وقت اپوربا ایک سازِ شکستہ ہے۔ اپوربا ایک ایسا کردار ہے۔ جس سے ہمیں محبت ہو جاتی ہے (اپوربا اور دینو بھائی پنت میں ہم کو کشمیر کے نیک نیت، غیر متعصب اور روشن خیال ہندوؤں کے ردِعمل کا بھی پتہ چلتا ہے۔

یہ مایوسی یہ Disillusionment اور شکست کا احساس اس وقت اور بھی شدید ہو جاتا ہے جب یہ لوگ جموں پہنچتے ہیں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ جموں پر کیا قیامت گزر چکی ہے۔ اور اپوربا کراہتا اٹھتا ہے ——— آج کے جموں کی تاریخ کبھی نہیں لکھی جا سکے گی جموں کی کائنات پر جو کچھ گزری، جموں کا ذرہ ذرہ اس وقت جو کچھ بیان کر رہا ہے، اس کی سچی تصویر کوئی نہیں کھینچ سکتا۔ آہ کے

جموں کی سچی تصویر کوئی اہل درد ہی کھینچ سکتا تھا۔ اور آج ہندوستان میں کوئی اہل درد نہیں رہا۔" ہاشمی یہاں جموں کے شاعر دینو بھائی پنت سے بھی ملتے ہیں۔ جو ایک اور ٹریجک شخصیت ہے۔ جموں کے اس شاعر نے جموں کے حسن اور جموں کی شان کے گیت گائے تھے۔ اس نے اپنی شاعری میں جموں کو زندہ جاوید بنانا چاہا تھا لیکن اب میری شاعری کا جموں مر چکا۔ یہ جموں نہیں جموں کا قبرستان ہے...... میری شاعری بڑی نازک تھی جموں کے ساتھ مر گئی۔ میں سخت جان تھا زندہ رہا......" شاعر کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ بہتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر ہاشمی بھی پھوٹ بہتے ہیں۔ اور ڈائری یہاں ہاشمی کے ذہنی کرب کا عکس بن گئی ہے جموں اے جموں میں PATHOS اور شدت intensity اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ یہ حصہ شاعری کو چھو لیتا ہے۔ یہاں خرابہ کی تصویر پوری ہو جاتی ہے اور مایوسی Dis- illusionment اور شکست کا احساس مکمل ہے۔ "ایک شہر تھا عالم میں انتخاب"۔ گویا اس ڈرامے کا آخری ایکٹ ہے۔

کشمیر اداس ہے کے آغاز ہی میں ایک ماہرانہ ضرب سے محمود ہاشمی نے آج کے کشمیر کی سیاست کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ ایک ساتھ کئی زاویوں سے روشنی پڑتی ہے ایک ساتھ ہم مختلف عناصر سے دوچار ہوتے ہیں اور آج کی سیاست کی ان سب پارٹیوں کو یکجا پاتے ہیں —— مہاراجہ ہری سنگھ، شیخ عبداللہ نیشنل کانفرنس مسلم کانفرنس اور وہ جو بڑھے چلے آ رہے تھے یعنی کشمیر کے عوام۔

یہ ایک زبردست ڈرامائی موقعہ ہے۔ مہاراجہ کا نذر دربار —— راجہ اور پرجا حاکم اور محکوم غلامی اور پستی کی انتہا انسان کو انسان کے سامنے جھکنا پڑ رہا ہے۔ درباری مہاراجہ کے سامنے سر جھکا رہے ہیں نذریں پیش کر رہے ہیں دربار ختم ہوتا ہے۔ اور —— اور اچانک راج محل میں اندھیرا چھا جاتا ہے سارا سری نگر اندھیرے کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ چشم زدن میں یہ اندھیرا کیسے چھا گیا؟ سری نگر کا بجلی گھر مہورہ میں تھا۔ اور وہ جو اوڑی میں تھے۔ اب مہورہ آ پہنچے تھے۔ اور روشنی "ان" کے ہاتھ میں تھی۔

ادب میں ایسے کنایاتی اور ڈرامائی ٹچس کا استعمال شدت تاثر بڑھاتا ہے لیکن یہاں یہ صرف استعارہ نہیں حقیقت ہے یہاں کتنا برجستہ اور موزوں استعمال ہوا ہے "راج محل میں اندھیرا تھا۔ اور روشنی کشمیر کے عوام کے ہاتھوں میں تھی جو آزادی کے مشعل لئے بڑھے چلے آ رہے تھے۔"

پھر منظر اندھیر نگر سری نگر سے دہلی منتقل ہوتا ہے۔ شیخ عبداللہ دہلی کے ایک شاندار ایسٹ ہوم میں "آزاد لب" بول رہے ہیں کہ ریاست کشمیر نے پونچھ میں ایک غیر دانشمندانہ پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ اس لئے وہاں کے عوام نے اپنی شکایات کے تدارک کے لئے ایک عوامی تحریک شروع کی ہے جس کی نوعیت فرقہ دارانہ ہرگز نہیں۔"

جلد ہی منظر پھر سری نگر مڑتا ہے۔ مہاراجہ عوامی طاقت کے اس چڑھتے ہوئے طوفان سے ہراساں ہو کر سری نگر سے بھاگا جا رہا ہے اپنی جائداد اور اپنے گرد دربار کشمیر کے ماسپوٹین کو ساتھ لئے ——

حالات نے بڑی تیزی سے پلٹا کھایا تھا۔

یہ صرف تین دن پہلے کی بات تھی۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی کے ایک شاندار ایٹ ہوم میں شیخ عبداللہ نے بیان دیا تھا (یہ بیان سوسیٹیڈ پریس آف انڈیا سے شائع ہوا تھا۔)

"پونچھ میں آج کل جو ابتری پھیلی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ریاست نے وہاں غیر دانشمندانہ پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ پونچھ کے لوگوں نے اپنے مقامی حکمران کے تحت بھی تکلیفیں اٹھائیں اور پھر کشمیر دربار بھی جو راجہ پونچھ کا حاکم اعلیٰ ہے۔ پونچھیوں کے لئے باعث مصیبت رہا اب وہاں کے عوام نے اپنی شکایات کے تدارک کے لئے ایک عوامی تحریک شروع کی ہے جو فرقہ وارانہ تحریک نہیں ہے۔ .... ریاست کشمیر نے اپنی فوجیں بھیج دیں۔ اور پونچھ میں اضطراب پھیل گیا۔ پونچھ کے لوگوں کی جہلم اور راولپنڈی کے لوگوں سے قریبی رشتہ داریاں ہیں چنانچہ انہوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو باہر نکال لیا، سرحد پار گئے اور اپنے ہمدردوں سے امداد حاصل کر کے واپس پونچھ پہنچ گئے۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ ریاست کی فوجوں کو بعض مقامات سے پسپا ہونا پڑا..........."

یہ اس وقت کا بیان ہے جب شیخ عبداللہ کو ابھی اقتدار حاصل نہیں ہوا تھا اسی لئے اس میں اصل صورت حال بیان ہوئی ہے۔ اس میں آپ دو قوموں کے نظریئے "قبائلی" اور "حملہ آور" کے الفاظ کہیں نہیں پائیں گے۔

لیکن تین ہی دن بعد سری نگر میں نیشنل کانفرنس کے جلوس نکل رہے تھے اور ان کے نعرے یہ تھے۔

"حملہ آور ہوشیار نیشنل کانفرنس ہے تیار"

اندر ہی اندر کوئی سازش رنگ لائی تھی۔ یہ اچانک تبدیلی ہندوستانی حکومت سے سازش کا نتیجہ تھی۔

سری نگر کی وہ یادگار رات! اس رات نیشنل کانفرنس کے جلوس نکلتے ہیں "حملہ آور ہوشیار نیشنل کانفرنس ہے تیار" اور یہاں ہندوستانی حکومت سے سازش کے بعد کی پالیسی کی اچانک تبدیلی کی طرف اشارہ ہے۔ تین دن پہلے شیخ عبداللہ نے دہلی میں یہ کہا تھا کہ مظلوم ستائی ہوئی رعایا اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ عوام نے مہاراجہ کے ظلم و استبداد کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا ہے ــــ "بول کہ لب ترے آزاد ہیں" لیکن اب انہیں عوام کو رات کی رات حملہ آوروں کا نام دے دیا جاتا ہے۔

کشمیر کے عوام ظالم ڈوگرا راج کے خلاف اس سے پہلے بھی اُٹھے تھے، لیکن اس جوش اور جذبۂ سرفروشی سے کبھی نہیں اُٹھے تھے۔ اب جب وہ اُٹھے تو اس طرح اٹھے کہ کشمیر چھوڑ دو ان کے لئے اب زبانی نعرہ نہیں رہا۔ وہ فوجوں کو پسپا کرتے جارحانہ راجدھانی کی طرف بڑھنے لگے۔

"راج محل اور سری نگر پر اندھیرا چھا گیا تھا اور روشنی ان کے ہاتھ میں تھی۔"

اس زبردست عوامی طاقت کی تاب نہ لاکر مہاراجہ لرزاں و ہراساں سری نگر سے بھاگ کھڑا ہوا کوئی دم میں ڈوگرا حکومت کا تختہ الٹنے والا تھا۔ جس کے تحت دو سال تک کشمیر کی جنت جہنم بنی رہی تھی۔ اتنے مختصر سے عرصے میں اتنا بڑا عوامی انقلاب ہو گیا تھا' وہ اب جہورہ میں آپہنچے تھے دو تین دن میں سری نگر پہنچ جائیں گے۔ سری نگر کے شہری چھپ چھپ کر یہ دیکھ آتے تھے۔ کہ وہ کب آرہے ہیں' سری نگر کے شہری ان کا انتظار کر رہے تھے۔ قیاس تھا کہ دو دن بعد عید کی نماز وہ سری نگر میں پڑھیں گے۔ لیکن وہ سری نگر نہ پہنچ سکے۔ عین وقت پر کچھ ہو گیا۔

باوجود اس کے کہ مہاراجہ کشمیر نے مطلق العنانی کا اعلان کیا تھا اور پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے ساتھ ساکن معاہدے کئے تھے، حکومت ہند سے درپردہ سازشیں چل رہی تھیں۔ اس سے بہت پہلے کانگریس کے کئی رہنما یکے بعد دیگرے کشمیر ہو آئے تھے۔ گاندھی جی، خان عبدالغفار خاں، اچاریہ کرپلانی۔ کشمیر چھوڑ دو کی تحریک کے موقع پر بھی صرف پنڈت نہرو جوش میں آگئے تھے۔ ورنہ دوسرے تجربہ کار کانگریسی لیڈروں کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ ان کا آئندہ چل کر اس میں فائدہ ہے۔ کہ کشمیر پر ہری سنگھ کا راج قائم رہے۔ اب جب کہ عوام اس طرح اٹھے تھے کہ راج بالکل ہاتھ سے جاتا نظر آرہا تھا۔ مہاراجہ کے سامنے ایک ہی صورت تھی عوام کے مقابلے کے لئے ہندوستان سے فوجی امداد طلب کرنا جو الحاق کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ اور ۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجہ نے ہندوستان سے الحاق کرایا۔

اسی دوران میں شیخ عبداللہ کو جیل سے رہا کر دیا گیا تھا۔ نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس دونوں کے لیڈر کم وبیش اسی وقت قید کر لئے گئے تھے۔ لیکن اب چوہدری غلام عباس اور مسلم کانفرنس کے لیڈر تو قید ہی میں رکھے گئے۔ لیکن شیخ عبداللہ کو رہا کر دیا گیا۔ شیخ عبداللہ اب کشمیر اور دہلی کے درمیان آجا رہے تھے۔ ہندوستان نے سیاسی بساط پر یہ چال چلی کہ شیخ عبداللہ کے ہاتھ میں اختیارات دے کر یہ ثابت کریں کہ کشمیر میں عوامی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ اور پھر ہندوستانی حکومت کو ایک قوم کے نظریے کو ثابت کرنے کے لئے بھی شیخ عبداللہ کی بڑی ضرورت تھی۔ مہاراجہ کی حکومت اور ہندوستان کی حکومت نے شیخ عبداللہ کو اس طرح آڑ بنائے رکھا۔

"کشمیر اداس ہے" میں ہم ایک ہوم گارڈ ہی کی زبانی یہ سنتے ہیں کہ یہ عوامی حکومت کیسی عوامی حکومت ہے۔ "نیشنل کانفرنس زندہ باد" "عوامی راج زندہ باد" یہ صرف نیشنل کانفرنسیوں کے نعرے ہیں۔ ورنہ وہاں کے عوام تو یہ سوچ رہے ہیں کہ "ان سے یہ مذاق کیوں کیا جا رہا ہے۔ یہ ہماری حرماں نصیبی کا مذاق اڑانا نہیں تو اور کیا ہے؟" شیخ عبداللہ کی مقبولیت پہلے بھی وادی کشمیر تک محدود تھی۔ اور اب تو وہاں بھی وہ مقبولیت کھو چکے ہیں۔ خود ہندوستان کے حق گو اور ترقی پسند اخبار اس دعویٰ کو چیلنج کر رہے ہیں کہ کیا واقعی شیخ عبداللہ کی حکومت عوام کی نمائندہ ہے عوامی حکومت ہے؟ "کشمیر اداس ہے" سے یہ بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ وہاں کے ہندو انہیں کس تحقیر سے دیکھتے ہیں۔ اور مسلمانوں کا رویہ تو ظاہر ہے اس شخص کے متعلق کیا ہوگا جو ایک قوم کی "تھیوری" کے جوش میں قرآن کی آیتوں کو "ضبط" کرنے سے بھی گریز نہ کرے۔ جاسوس مسلمانوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جیل بھرے جا رہے ہیں۔ اور اب تو یہ کھلا راز ہے۔ کہ شیخ عبداللہ کی حکومت عوامی حکومت نہیں ہے۔ وہ عوام کی بہبودی کو نظر انداز کر کے مہاراجہ کشمیر اور حکومت ہند کے اشاروں پر چل رہے ہیں۔ ان کے "اقتصادی بہتری" کے سارے پلان ہوائی قلعے تھے۔ اور دکھاوے کے لئے تھے۔ بہرحال اب شیخ عبداللہ عوام کے نمائندہ ہوں۔ یا نہ ہوں۔ یہ ڈھونگ رچانا ضروری تھا۔ اس لئے یہ ڈھونگ بڑی شدت سے رچایا جا رہا ہے۔ اور اس طرح کشمیر کے ان عوام کی آزادی کی راہ میں فسطائی طاقتیں گٹھ جوڑ کر کے طرح طرح کے روڑے اٹکا رہی ہیں۔ جو ظلم واستبداد کے خلاف برسر

ہے۔ اس رپورتاژ کی قدر و قیمت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کہ اس میں مستند تفصیلوں کے ساتھ اس پار کا حقیقی کشمیر نظر آتا ہے۔ جو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔

کسی کتاب کی قیمت کا اندازہ اس بات ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک وقت کا آئینہ ہے۔ اس لحاظ سے "کشمیر اداس ہے" ایک قیمتی کتاب ہے۔

کراچی فروری ۱۹۵۰ء

ممتاز شیریں

پیکار ہیں۔

کشمیری اپنی آزادی کا حق مانگنے کے لئے اُٹھے ہیں۔ اُنہوں نے آزادی کے لئے اپنا خون دیا ہے۔ اور اس وقت ہم ادیبوں اور فن کاروں کا فرض ہے۔ کہ ہم اُن کی اس جائز جدوجہد میں اُن کا ساتھ دیں۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ کہ ہمارے وہ فن کار جنہوں نے کسی زمانے میں اپنے افسانوں میں کشمیر کے حسن کا خوب خوب "استحصال" کیا تھا۔ اور جن کی شہرت اور مقبولیت خالصتاً اس وجہ سے تھی۔ کہ وہ کشمیر کے حسن سے اپنی تخلیقات کو رنگ دیا کرتے تھے۔ آج یوں خاموش ہیں۔ جیسے کشمیر کی زخمی روح کی آواز ان تک نہیں پہنچی اس کی آزادی کی امنگوں اور آزادی کی راہ پر اس کی قربانیوں نے ان کے دل کا کوئی تار نہیں چھیڑا۔ جہاں تک ہمارے پاکستان کے نام نہاد ترقی پسند بھائی بہنوں" کا سوال ہے۔ ان کا رویہ تو اور بھی عجیب اور مبہم سا ہے۔ وہ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتے کوئی صاف رویہ اختیار نہیں کرتے۔ کیونکہ احکام تو انہیں ہندوستان کے "ہیڈ کوارٹرز" سے آتے ہیں۔ پہلے پہل تو انہوں نے کھلم کھلا یہ کہا کہ شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھی ہی ترقی پسند ہیں (جیسے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے لئے غدر میں انگریزوں کا ساتھ دینے والے ترقی پسند ہیں) بلکہ مرحوم نیا زمانہ (ایڈیٹر سجاد ظہیر الحال سیکرٹری پاکستان کمیونسٹ پارٹی) نے یہاں تک لکھا کہ ہر ترقی پسند کا فرض ہے کہ وہ کشمیر کو ہندوستان میں ملانے کی جدوجہد کرے۔ اور اب جیسا کہ ان کی پالیسی ہمیشہ رنگ بدلتی رہتی ہے' وہ اچانک کشمیر

کے معاملے میں بالکل خاموش اور غیر جانبدار ہو گئے ہیں۔ یہ بے عمل بے یقین عناصر ہیں جو غیر جانبداری کے پیچھے پناہ لیتے ہیں۔ ہمیں کھلے طور پر عوامی قوتوں کے ساتھ جانبداری کا اعلان کرنا چاہیئے۔ ہمارے "ترقی پسند" دوست اپنی بے حسی اور خاموشی سے عوام دشمنی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی یہ جدوجہد اور زبردست انقلاب ان کیلئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کشمیر کے عوام نے جس طرح واقعی اپنے حصہ کا کشمیر مہاراجہ کی گرفت سے چھڑا لیا۔ آزادی کے لئے جس طرح اپنا خون بہایا۔ اور یہ نہتے عوام جدید ترین اسلحہ جات ٹینکوں اور بموں کا مقابلہ محض اپنے سنگین عزم سے کرتے سینہ سپر آگے بڑھتے گئے' یہ ایک ایسا سنہری کارنامہ ہے جسے تاریخ بھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ "ترقی پسند" کے لئے یہ کارنامہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ "ترقی پسند" پرچے یا تو "ایک طرف ہندوستانی افواج' دوسری طرف قبائلیوں کے لوٹوں کی گرد" کا ذکر کرتے رہے۔ یا بڑے مبہم اور غیر واضح الفاظ میں کچھ کہہ کر معاملے کو ٹالتے رہے۔ اور یہ بھولتے رہے کہ کشمیری عوام کے لئے زندگی اور موت کا سوال آن پڑا ہے؟

"کشمیر اداس ہے" میں محمود ہاشمی کا رویہ مبہم یا مصلحت آمیز نہیں۔ بالکل صاف ہے۔ انہوں نے کھلے طور پر عوام کا ساتھ دیا ہے۔ اور پہلو ہی یہ لیا ہے کہ آج کے حالات کا کشمیر کے عوام کی زندگی پر کیا "خوشگوار" اثر پڑا ہے۔ اور ہندوستانی مقبوضہ کشمیر میں وہ کس حال میں ہیں اور "عوامی حکومت" کے نام سے انہیں کتنا بڑا دھوکا دیا گیا۔ "کشمیر اداس ہے" نے اس سراب کو آئینہ دکھایا

پس منظر

ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ یا اس پانی میں سے سر نکالے ہوئے اوپر کو اُٹھتی ہوئی اونچی اونچی پہاڑیوں کی چوٹیاں۔ ان سے دُور کیلاش پربت پر رہنے والی پاربتی دیوی کی نگاہیں جب بھی ان پر پڑتیں۔ اس کا جی چاہتا کہ وُہ ان پانیوں پر اپنی کشتی چلائے۔ ان چوٹیوں پر آکے بیٹھا کرے۔ اور دھرتی کا یہ ٹکڑا اس کا ہو۔ اس زمانے کے مشہور رشی کشیپ کی بھی یہی آشا تھی۔ کہ یہ دھرتی اُس راکشس کے قبضے میں نہ رہے جس کا ان پانیوں پر راج تھا۔ اور جو کسی اور کو ان کے قریب پھٹکنے بھی نہ دیتا تھا۔ آخر کشیپ رشی کی تپسیا پوری ہُوئی۔ اور ایک دن شیو دیوتا مان گئے۔ چنانچہ انہوں نے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر اپنا ترسول مارا۔ اور اس میں ایک ایسا سوراخ کر دیا جس میں سے سارے کا سارا پانی بہ نکلا۔ اور یوں ستی سرنام والا یہ ٹکڑا سوکھ گیا۔ اب راکشس کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اس نے چٹانوں کے نیچے چھپنا چاہا۔ پر پاربتی دیوی نے فوراً چڑیا بن کر اور اپنی چونچ میں ایک تیز سی کنکری لے کر

اُس پر یہ کنکری دے ماری۔ جس سے وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اور یوں یہ سرزمین شیو اور پاربتی کے ہاتھ میں آ گئی۔ بہت سے دیوتا۔ اور رشی منی یہاں آ بسے۔ اور پھر ان کی دیکھا دیکھی ادھر ادھر سے اور لوگ بھی آنے شروع ہو گئے۔ اور یہاں ایک نئی بستی وجود میں آ گئی جس کا نام کشمیر ہُوا آہستہ آہستہ جس کے کئی شہر بنے۔ جن میں ایک پرور پور بھی ہے۔ جسے ہم لوگ سری نگر کہتے ہیں۔ اور جہاں کے ایک کالج کے اسٹاف روم میں بیٹھا ایک راوی۔ یہ ساری روایت بیان کرنے کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ اور محسوس کر رہا ہے۔ کہ چونکہ اکثر لوگوں کے لئے وہ اب بور بن رہا ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے۔ کہ وہ اب اپنی جغرافیہ دانی اور تاریخ دانی کو تہ کر رکھے۔ اور کسی اور بہتر لمحے کا انتظار کرے جب اُسے اچھے سامعین میسر ہونے کی توقع ہو........"

میرا دوست اپورب عام طور پر کشمیر کی پرانی تاریخ کو کچھ اسی انداز میں دھرایا کرتا تھا۔ اور پھر باوجود اس کے کہ اُس کے اس اندازِ بیان کی دلچسپی سب کو متوجہ رکھتی تھی۔ اکثر اسے ادھورا چھوڑ کے کوئی اور بات شروع کر دیا کرتا تھا۔

کسی اور ایسے ہی زرین لمحے میں جب اس پر مورخ بننے کا موڈ پھر طاری ہوتا۔ اور وُہ سمجھتا۔ کہ جس زرین لمحے کا اُس کو انتظار تھا۔ وہ آ پہنچا۔ اپورب کہا کرتا تھا: پہلے زمانے میں لوگوں کو چونکہ اپنے اوپر حکومت کروانے کا بڑا شوق ہوا کرتا تھا۔ اس لئے جب کشمیر کی دھرتی ظہور میں آئی۔ تو قدرتی طور پر یہاں لوگوں کو بھی پرجا بننے اور کسی کو راجہ بنانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے سب سے پہلے ان کی نگاہِ انتخاب اوتاروں میں سب سے بڑے اوتار اور راجاؤں میں سب سے بڑے راجہ رام چندر جی پر پڑی۔ اور اس کے بعد تو یہ کام خود بخود چل نکلا۔ راجہ رام چندر جی کے بعد چھ صدیاں اور تینتیس سالوں میں چھپتی رہے

یہاں راج کرنے کے لئے پیدا ہوئے۔ اور یوں کشمیر ایک باقاعدہ راج دھانی بن گئی جہاں ہر حصے میں ایک راجہ ہوتا تھا۔ اور اُس کی پرجا ہوتی تھی۔ اور ان کے درمیان راجہ اور پرجا کے سے تعلقات ہوتے تھے۔ راجہ عیش و عشرت کیا کرتا تھا۔ اور پرجا دُکھ سہا کرتی تھی۔ اور سمجھتی تھی۔ کہ یہی اس کا فرضِ عین ہے۔ . . . .

الیورب کہا کرتا تھا۔ یہ حسین و جمیل راج دھانی جو بڑے رومانوی انداز میں وجود میں آئی۔ اپنے ہاں بڑے عجیب عجیب مزاج کے راجوں مہاراجوں کو پالتی رہی۔ یہاں وزیر جھبر دھی آیا۔ جس نے اپنی حکمرانی کا سب سے بڑا کمال اسی میں جانا۔ کہ کسی دختر کے برہنے سے ایک دھڑلے کا عشق کرے۔ اور اسی کو اپنے عہدِ حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھے۔ یہاں ہُن خاندان کے نمائندہ ہرکل نے بھی حکومت کی جس کی پیشانی کی تیوریاں یہاں کی بہاریں فضائیں تک دور نہ کر سکیں۔ اور جو زندگی بھر میں ایک مرتبہ صرف اس دن مسکرایا جب وہ اپنے محل کی کھڑکی میں بیٹھا تھا۔ اور وہاں سے سامنے کی پہاڑی پر سے اس نے ایک ہاتھی کا پاؤں پھسلتے اور اُسے لڑھکتے دیکھا۔ ہاتھی کی چنگھاڑ اور پہاڑیوں میں اُس کی گونج اُسے بے حد پسند آئی۔ چنانچہ حکم دیا۔ کہ اور بھی ایک سو ہاتھی یونہی لڑھکائے جائیں۔ تاکہ اس کی مسکراہٹ ذرا طویل ہو سکے۔ اور اُسے موقع ملے۔ کہ اس دنیائے فانی میں کم از کم ایک مرتبہ تو وہ ذرا جی بھر کے مسکرا سکے۔ اور پھر یہاں مہاراجہ پرورسین نے بھی راج کیا۔ جس نے سری نگر آباد کیا۔ اور اس کا نام پرورپورہ رکھا۔ اور پھر للتا دتیہ بھی آیا جس نے مارتنڈ کا مندر بنوایا۔ اور ایک دن شراب کے نشے کی ترنگ میں حکم دے دیا۔ کہ شہر کو آگ لگا دی جائے۔ اور پھر جیسا کہ راجاؤں کا قاعدہ ہوتا تھا۔ نشہ اُترنے کے بعد اپنے اس حکم پر پچھتایا بھی۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر پر ایک دور وہ بھی آیا جب اس کی حکومت چند لٹیرے سپاہیوں کے ہاتھ آ گئی جنہیں ترکن

بکتے تھے۔ اس زمانے میں حکومت کی گدی کی وہ آپس میں آئے دن نیلامی کرتے رہتے تھے۔ جو زیادہ بولی دیتا۔ وُہ راجہ بن بیٹھتا اور جس کو پیسے کی ضرورت ہوتی۔ وُہ گدی کسی پیسے والے کے حوالے کر دیتا چنانچہ پورے دو سو سال یہاں کے بسنے والوں نے حکمرانی کا یہ چوچلا بھی دیکھا حتیٰ کہ وہ زمانہ آ گیا جب ہندوستان کے مہاراجہ ہرش کو شاید انسپائریشن حاصل کرنے کے لئے کشمیر حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ اس کو اپنا مشہور ڈرامہ رتنا دلی لکھنا تھا۔ اور پھر بدھ مت کے سلسلے میں لاٹھیں بنوانے کے لئے اشوک کو بھی یہاں حکومت کرنی پڑی اور پھر جب مسلمانوں کا دور دورہ ہوا۔ تو یہاں سلطان زین العابدین بھی آیا جس نے کچھ عرصہ اس معرکے کی حکومت کی۔ کہ کشمیریوں نے اُسے بڈ شاہ یعنی بڑا بادشاہ کہنا شروع کر دیا۔ لیکن آخر یہ بڈ شاہ بھی ہزاروں لاکھوں قسم کی ملکی اصلاحات کرنے اور آتشبازی کے موضوع پر ایک کتاب اور عربی زبان میں خدا کی تعریف میں ایک نظم لکھنے کے بعد دوسری دُنیا کو سدھارا۔ پھر یہاں مغل آئے۔ اور اکبر آیا۔ اور جہانگیر آیا جس نے اسے دیکھ کر کہا۔ کہ اگر فردوس بر روئے زمین است ہمین است و ہمین است و ہمین است۔ پھر یہاں اپنے لئے ایک عیش مقام بنایا۔ اور پھر جب یہ فردوس مقام بن چکا۔ تو سکھ بھی یہاں آئے جو اپنے ہاں کے علاقے علیحدہ طور پر مختلف صوبے داروں کو دے کر راج کرنے کے قائل تھے۔ اور جنہوں نے ایک انسان کی قیمت سولہ روپے مقرر کر رکھی تھی۔ ان دنوں جب کوئی کسی کو قتل کر دیتا تھا۔ تو اس کے جواز میں اسے سولہ روپے حکومت کے خزانے میں داخل کرنے پڑتے تھے جن میں سے اُس کے وارثوں کے آنسو پونچھنے کے لئے دو روپے یا بعض صورتوں میں چار روپے انہیں بھی دے دیئے جاتے تھے۔ اسی زمانے میں رنجیت سنگھ اپنے ایک ملازم گلاب سنگھ پر اتنا خوش ہوا کہ اس کی تنخواہ تین روپے سے بڑھا دی۔ پھر جب یہ ملازم نوازشاتِ شاہی سے

اس طور بہرہ یاب ہو چکا۔ تو اس کی اہمیت اتنی بڑھ گئی۔ کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد اس نے کشمیر کو اپنے نام بیع کروالیا۔ اور ۷۵ لاکھ روپے دے کر یہاں کے انسانوں کو سولہ روپے فی انسان سے کہیں کم قیمت پر خرید لیا۔ اور یہاں کا مہاراجہ بن گیا۔ اور اب اسی ۷۵ لاکھ روپے والے بیع نامے کی بدولت ہم پر ہز ہائی نس راج راجیشور مہاراج دھیراج شری مہاراجہ سر ہری سنگھ جی بہادر جی سی ایس آئی جی سی آئی ای۔ کے سی وی او۔ اے ڈی سی راج کر رہے ہیں اور ہم میں اتنی ہمت نہیں کہ اس کا تذکرہ تک کر سکیں اور اس وقت اگر میں مہاراجہ ہری سنگھ کے شری گباشی پتا امر سنگھ جی کے نام کو تازہ رکھنے والے اس سرینگر کالج کے اسٹاف روم میں بیٹھا یہ تذکرہ کر رہا ہوں۔ تو اپنی حماقت کا ثبوت دے رہا ہوں۔ اور یہ بھولتا ہوں۔ کہ میں اُن بزرگوں کی اولاد ہوں جن کی روایات کہتی ہیں۔ کہ تمہاری آنکھیں اگر بند نہیں رہ سکتیں۔ تو کم از کم زبان کو تو بند رکھو پستے رہو پر اُف نہ کرو اور زبان سے ایک لفظ نہ کہو۔۔۔ ایک لفظ نہ کہو۔۔۔ ایک لفظ نہ کہو۔۔۔"

اپورب کشمیر کی کہانی ہمیشہ غیر سنجیدہ انداز میں سنایا کرتا تھا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اسے سنجیدہ انداز میں سنایا جائے۔ تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کشمیر پر ہمیشہ ایسے لوگوں نے حکمرانی کی جنہیں یہاں کے عوام سے زیادہ یہاں کی مٹی عزیز تھی۔ یہاں کا پانی عزیز تھا۔ پہاڑ عزیز تھے۔ جھیلیں اور چشمے عزیز تھے۔ اور یا دولت عزیز تھی۔ ان سب نے یہاں کے مناظر کا طلسم پہچانا۔ پر کشمیر کی روح میں جھانکنے کی کسی نے کوشش نہ کی۔ کسی نے اس لحہ بہ لحہ گہری ہوتی ہوئی تہ کو کریدنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ جو کشمیر کی حسین وادی کا ناسور تھا۔ یہ جائے ناسور چپ چاپ پھیلتا رہا۔ بڑھتا رہا۔ بڑھتا رہا۔

جب نیا زمانہ آیا۔ اور پہلی جنگ عظیم کے بعد ساری دنیا میں بیداری کی ایک

نئی رو دوڑنے لگی۔ تو کشمیر کے لوگوں نے بھی غالباً یہاں کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اپنی آنکھیں کھولیں۔ اور اپنے ارد گرد دیکھنے لگے۔ پنجاب میں ان دنوں خلافت کی تحریک کے بعد شدھی اور سنگھٹن کے مظاہرے شروع ہو چکے تھے۔ اور سائمن کمیشن کی آمد آمد تھی۔ چنانچہ اس سیاسی ہلچل کا کشمیر پر بھی اثر پڑا۔ اور ۱۹۳۰ء کے دوران میں کشمیری عوام نے بھی صدیوں کے جمود سے ایک انگڑائی لی۔ یہ انگڑائی کچھ اس قسم کی تھی۔ اور صدیوں کے دبے ہوئے جذبات کے ابھرنے کا یہ انداز کچھ ایسا تھا۔ کہ اس سے نہ صرف ہری سنگھ کے محل کی بنیادیں لرز اُٹھیں۔ بلکہ دور نئی دہلی کی وائسریگل لاج میں بھی اس زلزلے کے جھٹکے محسوس ہونے لگے۔ میرپور اور پونچھ کے علاقوں سے ہوتا ہوا یہ طوفان۔ اوڑی، سوپور، بارہ مولا اور سری نگر میں پہنچا۔ سردی کے موسم کی وجہ سے کشمیریوں کے پاس اس وقت کانگڑیاں ہی تھیں چنانچہ جب پولیس سے ان کی ٹکر ہوئی۔ تو ان سے اور کچھ تو بن نہ پڑا۔ البتہ سلگتے ہوئے کوئلوں سے بھری ہوئی کانگڑیاں انہوں نے پولیس والوں پر ضرور پھینکیں۔ جو اس وقت بڑا کارآمد ہتھیار ثابت ہوا۔ مہاراجے کی پولیس اور فوج اس عوامی ہتھیار سے کچھ اس طور بوکھلائی۔ کہ مجبوراً انہیں حکومت ہند سے مدد مانگنی پڑی۔ وہاں سے فوج آئی۔ پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ اور جب اس امداد نے مہاراجہ کے کھوئے ہوئے اوسان ٹھیک کر دیئے۔ تو پھر پرانا غرور جاگا۔ اور اس نے اپنی فوج کے ایک دستے کو حکم دیا۔ کہ وہ ریاستی جھنڈا لے کر گلی گلی پھرے۔ اور جو شخص کہیں نظر آئے۔ اسے اس جھنڈے کے آگے جھکوائے۔ اور مہاراجہ کی جے بلوائے۔ چنانچہ یہ مظاہرہ بھی ہوا۔ زبردستی کے سلام کروائے گئے۔ ناکیں رگڑوائی گئیں۔ اور مہاراجہ ہری سنگھ نے ہر ممکن طور پر اپنی رعایا پر واضح کرنے کی کوشش کی۔ کہ ان کا فرض صرف ظلم سہنا ہے۔ ظلم کے خلاف

آواز بلند کرنا نہیں۔ اور ان کا نصیبہ وہی ہے۔ جو ان کے آباء و اجداد کا تھا۔ اور دستورِ زبان بندی میں ہی ان کی سلامتی ہے۔ لیکن اے کاش! مہاراجہ سمجھ سکتا۔ کہ اب وہ دور گذر چکا۔ اور سرکشی کچھ اور بڑھ جاتی ہے بظلم و جور سے۔

آگ دب ضرور گئی۔ پر بجھ نہ سکی۔ اس تحریک کے بعد اگرچہ کئی سال تک بظاہر جمود طاری رہا۔ لیکن اندر ہی اندر اس کی جڑیں مضبوط ہوتی گئیں۔ اب چودھری غلام عباس اور شیخ محمد عبداللہ کی رہنمائی میں کشمیری سیاسی طور پر اس حد تک بیدار ہو گئے۔ کہ جب ۱۹۴۶ء والا سال آیا۔ اور عہد نامہ امرتسر کو جو عہد نامہ سے زیادہ ایک بیع نامہ تھا۔ پورے ایک سو سال ہو گئے۔ اور کشمیر کے وہ چالیس لاکھ عوام جنہیں ۷۵ لاکھ کے عوض فروخت کر دیا گیا تھا محسوس کرنے لگے۔ کہ اب غلامی کی زنجیریں توڑنے کا وقت آگیا ہے۔

چنانچہ انہوں نے "کشمیر چھوڑ دو" کا نعرہ بلند کیا۔ اس میں شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھی پیش پیش تھے۔ لیکن کمزور عوام حکومت کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ پھر پولیس اور فوج نہتوں پر ٹوٹ پڑی۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ اور ۱۹۳۱ء والے واقعات ایک مرتبہ پھر دہرائے گئے۔ ڈوگرہ سپاہیوں نے سری نگر شہر کے ساتوں پلوں پر اپنی چوکیاں قائم کر لیں جو لوگ انہیں عبور کرنا چاہتے۔ انہیں حکم ملتا۔ کہ وہ پل پر سے گزرتے وقت اپنے ہاتھ اونچے کئے ہوئے گذریں۔ اور ساتھ ہی ساتھ مہاراجہ ہری سنگھ کی جے کا نعرہ بھی لگاتے جائیں بلکہ بعض پلوں پر تو لوگوں کو ایک ٹانگ پر چلا کر بھی انہیں ان کے محکوم ہونے کا یقین دلانے کی کوشش کی گئی۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ اور "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک ذرا قبل از وقت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے نتائج تسلی بخش نہ ہوئے۔ اور اسے یوں کچل ڈالا گیا اصل میں اس کا صحیح موقع ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد تھا۔ جب کہ انگریز جنہوں نے کہ معاہدہ امرتسر

کی طرح ڈالی تھی۔ جا رہے تھے۔ لیکن اس وقت بھی کاروبارِ خسروی نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ ہندو راجہ نے ہندو مت کی آڑ لی۔ اور ہندوستان سے ساز باز کرنے کے بعد سب سے پہلے تو یہ کیا۔ کہ باغی قرار دے کر جیل میں رکھے ہوئے شیخ عبداللہ کو ۲۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو رہا کر دیا۔ اور جس طرح بغیر کسی وجہ کے شیخ عبداللہ کو رہا کیا گیا۔ اسی طرح بغیر کسی وجہ ہی کے چودھری غلام عباس اور ان کے ساتھیوں کو رہا نہ کیا گیا۔ مہاراجہ نے بڑے پُراسرار انداز میں اسے نئی دہلی کی راہ دکھا دی۔ اور اس کے بعد جب کہ جب کہ شیخ عبداللہ دہلی کے بہت سے پھیرے لگا چکے۔ اور ریاست اور ہندوستان کے سرکاری حلقوں کے علاوہ ہندوستانی اخباروں میں بھی شیخ عبداللہ اور نہرو کی بڑی پرانی بڑی اخلاص والی۔ بڑی محبت بھری۔ اور کبھی نہ ٹوٹ سکنے والی دوستی کے بہت شدت کے ساتھ تذکرے ہو چکے اور ان دوستوں کے لئے اپنی دوستی ہر صورت میں اور ہر قیمت پر نبھانا لازمی قرار پا گیا۔ تو ایک دن موقع کو غنیمت جان کر یہ اعلان کر دیا گیا۔ کہ ریاست کو ہندوستان کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔ اس کی ساری سڑکیں پاکستان سے ملتی ہیں۔ ملتی رہیں اس کے سارے دریاؤں کا رُخ پاکستان کی جانب ہے۔ ہوتا ہے۔ اس کی پچاسی فیصدی مسلمان آبادی کے تمدن اور تہذیب کی سلامتی صرف پاکستان میں ہے۔ کوئی ہرج نہیں اور ریاست کو ہندوستان میں شامل کر دیا گیا۔ ریاست کا جغرافیہ بے سود بن کے رہ گیا اور ریاست کی مصلحتوں کی طرف کسی نے منہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اصول ٹوٹ گئے۔ پر دوستی پر ذرا کوئی آنچ نہ آئی۔ شیخ عبداللہ نے کم از کم پنڈت نہرو کے ساتھ اپنی دوستی کو نبھا تو دیا۔ چنانچہ سری نگر میں اب اخبار بیچنے والے لونڈے چلا چلا کر کہنے لگے۔ "تازہ خبر یہ آئی ہے۔ مہاراجہ ہمارا بھائی ہے"۔ مہاراجہ اور عبداللہ میں بھائی بندی کے

رشتے قائم ہو گئے۔ اور عبداللہ جس نے پچھلے سال سے عوام کے ساتھ بھی بھائی چارے کا ڈھونگ رچا رکھا تھا۔ اس رشتے کا مذاق اڑانے لگا۔ اور عبداللہ کے حواری سری نگر کی فضاؤں میں اس آواز کو بڑے زور و شور سے پھیلانے لگے۔ کہ "ہمارا راجہ ہمارا بھائی ہے اور تازہ خبر یہ آئی ہے۔"

پچھلے سال عبداللہ نے کہا تھا۔ کہ "معاہدہ امرتسر کی رو سے ایک ایک کشمیری کو تین تین پیسے میں بیچا گیا ہے۔ اور یہ سودا نہایت شرمناک ہے" ——— اور کشمیر کے لوگوں نے سمجھا تھا کہ عبداللہ کر انہیں غلامی کے اس سودے کے چنگل سے نجات دلوانا چاہتا ہے۔ اور ہری سنگھ نے بھی یہی سمجھا تھا۔ کہ عبداللہ اس معاہدے کو ختم کر کے اسے ختم کرنا چاہتا ہے اور یہی وجہ تھی۔ کہ اپنے نقصان سے ڈر کر اس نے عبداللہ کو قید کر لیا تھا لیکن آج عبداللہ رہا تھا۔ اور آج ہری سنگھ پر یہ انکشاف ہو چکا تھا کہ جب کوئی کسی سودے کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ تو ضروری نہیں ہوتا۔ کہ وہ اس سودے کو سرے سے ہی ختم کر دینا چاہتا ہو۔ بلکہ "آئینِ سوداگری" میں اس طرح کی آواز کسی نئے سودے کی تمہید بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آج دِلّی میں پرانے سودے کی تجدید ہو رہی تھی۔ اس سودے کا سا ایک اور سودا ہو رہا تھا۔ شاعر اقبال کا "دہقان و کشت و جوئے و خیابان فروختند قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند" والا شعر جو عبداللہ کو پچھلے سال بڑی اچھی طرح یاد تھا آج بھول چکا تھا۔ اور ہری سنگھ بھی جس کے دل کی دھڑکنیں اس شعر کو سن کر پچھلے سال تیز تر ہو گئی تھیں۔ آج مطمئن تھا۔ وہ جانتا تھا آج عبداللہ یہ شعر نہیں پڑھے گا۔ آج عبداللہ کو پرانی باتیں یاد نہ آ سکیں گی جس طرح آج سے سو سال پہلے اس سودے بازی میں اس کا دادا گلاب سنگھ جیتا تھا۔ آج وہ بھی جیتے گا آج اسے پچھلے سال کی طرح اپنے سامراج کی یہ کشتی ڈگمگاتی

نظر نہیں آئے گی۔ کیونکہ آج اسے سہارا دینے والے پیدا ہو چکے ہیں۔ آج مہر چند مہاجن اس کے ساتھ ہے۔ ماؤنٹ بیٹن اس کے ساتھ ہے پٹیل اور نہرو اس کے ساتھ ہیں۔ اور ثابت ہو چکا ہے۔ کہ عبداللہ نہرو کا دوست ہے یوں لئے عبداللہ بھی بالآخر اس کے ساتھ ہو گا ماؤنٹ بیٹن کی خون کی رشتہ داری اس کلائیو سے تھی جس نے مدتوں پہلے آئینِ جہانگیری کا ایک بہت بڑا تجربہ ہندوستان میں کیا تھا۔ اور مہر چند مہاجن کو بھی اس کے مہاجنی نام نے بتایا تھا کہ امی چند جس کی دوستی کلائیو سے تھی۔ کوئی غیر نہ تھا۔ بلکہ اس کے اپنے بزرگوں میں سے ہی ایک تھا۔ اور پٹیل بھی جانتا تھا۔ کہ تاریخ کے صفحات میں جہاں کہیں کلائیو اور امی چند ہیں۔ انہیں کوئی نہ کوئی میر جعفر بھی مل گیا ہے۔ اور یوں کاروبارِ شہریاری کا ایک بہت بڑا اصول پورا ہوتا ہے۔ اس لئے اب آزاد ہندوستان کی سب سے اونچی چوٹی پر بیٹھنے کے بعد ان سب کی نگاہ عبداللہ پر پڑی تھی۔ اس بہانے ہری سنگھ بھی سیراب ہو رہا تھا۔ طرفین کے عہد و پیمان پورے ہو گئے تھے۔ اور وہ ہری سنگھ جو اپنی رعایا سے ڈر کر سری نگر سے بھاگا تھا جموں کے محل میں بیٹھا پھر سے پرانے مرغزاروں کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اور اس کی شاہی لاری کشمیر کے باغوں کے تازہ تازہ سیب اس تک پہنچانے کے لئے پھر سے ہر روز جموں سے سری نگر میں احمد وائینڈ سنز والوں کے ہاں سے اس کے لئے خصوصیت سے تیار کی ہوئی محض چند ڈبل روٹیوں کی خاطر ہر روز کئی گیلن پٹرول صرف کیا جانے لگا تھا اور جموں سے سری نگر کے درمیان کے دو سو تین میل طے کرنے کے بعد یہ لاری اب پھر احمد وائینڈ سنز کے سامنے کھڑی ہوتی اور اس کے اردگرد عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کے والنٹیئر سرخ جھنڈے لگائے شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ زندہ باد اور عوامی راج زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے اور عوام سوچ رہے تھے۔ کہ آخر ان سے یہ مذاق کیوں کیا جا رہا ہے؟

سری نگر کے اڑھائی لاکھ باشندے عوامی راج۔ زندہ باد کہنے والوں سے یہ پوچھنا چاہتے تھے۔ پر اس کی اجازت نہ تھی۔

کوئی شخص کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ کوئی شخص کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کوئی شخص کسی سے کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا۔ سری نگر کے بازاروں میں گھومتے ہوئے۔ اور فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ہر ایک اس بارے میں باتیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ جنہوں نے سرخ بلے لگا رکھے تھے۔ جو نیشنل کانفرنس کے والنٹیر تھے۔ اور جنہوں نے مدت سے سوچنا بند کر رکھا تھا۔ اور صرف عبداللہ سے سننا ہی جانتے تھے ادھر ادھر گھوم رہے تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ ان کی طرح سب عبداللہ ہی سے سنیں اپنے طور پر کوئی کچھ بھی نہ سوچے۔ سوچنے والا ان کی نظر میں گردن زدنی تھا کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ کچھ کہہ سکے۔ یا کسی سے کچھ سن سکے۔

لیکن اس سب کچھ کے باوجود بے لگام سوچ ذہن کے تاروں پر بڑی شدت سے لرز رہی تھی۔ اب اس کو قابو میں کون کرے؟

کسی کو آج پچھلا سال یاد آ رہا تھا۔ عبداللہ کے پرانے نعرے یاد آ رہے تھے۔ اور وہ ان نعروں کا آج کی آوازوں سے ربط پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور کسی کو ۳۰ ستمبر کا وہ دن یاد آ رہا تھا جب عبداللہ نے اپنی رہائی کے بعد پہلی تقریر کی تھی اور کہا تھا ہم ذمہ دار نظام حکومت چاہتے ہیں۔ سردست ہمیں ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ الحاق سے کوئی دلچسپی نہیں" اور جملہ سننے کے بعد وہ اس پوسٹر کو دیکھتا رہا تھا۔ جس پر جواہر لال نہرو زندہ باد لکھا تھا اور

اسے عبداللہ کی تقریر کے اس فقرے اور اس پوسٹر کے تضاد پر حیرانی ہو رہی تھی لیکن آج وہ حیرانی مٹ چکی تھی آج وہ پوسٹر بامعنی بن چکا تھا —— آج سیاست کی زبان نے اس فقرے کے معنی سب پر واضح کر دیئے تھے اب ایک نیا کشمیر سامنے تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ کشمیر وہی پرانا تھا۔ وہی سو سال پہلے والا کشمیر۔ اور سیاست بھی وہی پرانی تھی۔ سو سال پہلے والی۔ صرف مہرے بدل گئے تھے۔ ورنہ بساط وہی تھی۔ کھلاڑی بدل گئے تھے۔ مگر کھیلنے کا ڈھنگ وہی پرانا تھا کشمیر کے چالیس لاکھ انسانوں کی قسمت کو تولنے والا وہ ترازو جو آج سے ایک سو برس پہلے امرتسر میں تھا۔ آج دلی میں تھا۔ اور پٹیل اور نہرو کے آستانے پر ہری سنگھ اور عبداللہ پہلو بہ پہلو بیٹھے اس ترازو کے پلڑے سنوار رہے تھے۔ اور تازہ خبر آ چکی تھی۔ کہ مہاراجہ ہمارا بھائی ہے"۔

یہ کتاب ان ہی دنوں کی ڈائری ہے جب کشمیر میں یہ نیا سیاسی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ جب کشمیر میں ہندوستانی فوجیں عبداللہ اور نہرو کی دوستی کا سہارا لے کر داخل ہو چکی تھیں لیکن نیشنل کانفرنس اب بھی۔ یہ ملک ہمارا ہے۔ اس کی حفاظت ہم کریں گے۔ اور عوامی راج زندہ باد" والے نعرے بلند کر رہی تھی اور یہ سیاسی مذاق عوام کی سمجھ سے بہت بالا تھا۔ جب کہیں سے یہ خبر آ چکی تھی کہ مہاراجہ ہمارا بھائی ہے لیکن اس کے باوجود یہ بھائی محض اپنی جان عزیز کو محفوظ رکھنے

کی خاطر سری نگر سے جموں بھاگ چکا تھا۔ جب "عوام۔ عوام" ہر کوئی پکار رہا تھا۔ لیکن عوام کا پُرسانِ حال کوئی نہ تھا۔ جب کشمیر میں "نیشنلسٹ" بنانے کی مہم زوروں پر تھی۔ پر نیشنلزم کا پردہ اتنا باریک ہو چکا تھا۔ کہ اس میں سے ہر شخص یا تو "ہندو نیشنلسٹ" نظر آتا تھا۔ یا "مسلمان نیشنلسٹ"...... اور جب ساری سیاست درہم برہم ہو رہی تھی۔ اور نا پختہ دماغ یہ سمجھنے لگے تھے کہ یہ انقلاب انقلابِ روس کا سا ہے۔ شہنشاہیت دم توڑ چکی ہے اور شخصی استبداد مٹ گیا ہے۔ لیکن بات صرف اتنی تھی۔ کہ کشمیر کے زار کا جسم سری نگر کی بجائے ذرا سی دیر کیلئے جموں میں منتقل ہو گیا تھا۔ حالانکہ اس کی روح اب بھی یہاں کارفرما تھی۔ اور عوام کا مقابلہ انہیں کے ہتھیاروں سے ہو رہا تھا۔ عوامی راج زندہ باد...... زندہ باد عوامی راج...

۱۹۴۷ء کے آخری مہینوں میں جب سیاست ہر نت نئے پینترے بدل رہی تھی" میں سری نگر کے امر سنگھ کالج میں پڑھایا کرتا تھا۔ پھر حالات نے مجھے بھی زمانے کی اس نئی رو کے ساتھ بہا دیا۔ اور میں ہوم گارڈز کے ایک نائب کمانڈر کی حیثیت میں نیشنل کانفرنس کے احکام کے تحت نومبر میں جموں کے صوبے میں امن کا پرچار کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ میرے ساتھ جو ہوم گارڈز تھے۔ وہ چونکہ سری نگر خاص کے رہنے والے تھے۔ اس لئے عام طور پر سارے کے سارے مسلمان تھے۔ اور ان پر نیشنلسٹ کا لیبل تازہ تازہ چسپاں کیا گیا تھا۔ اس دوران میں میرا ساتھی کمانڈر راج پورب تھا جو اس سے پہلے امر سنگھ کالج میں بھی

میرے ساتھ تھا۔ اور جس کے فرائض اسے شکسپیئر پڑھانے پر مجبور کرتے تھے۔ لیکن جو غالب پر جان دیتا تھا۔ اور اس لئے شکسپیئر پڑھانے سے زیادہ غالب پڑھنے کا قائل تھا۔ کشتواڑ۔ بھدرواہ۔ بٹوت۔ بانہال۔ اور میرپور۔ جموں وغیرہ میں ہم دونوں ایک ساتھ تھے۔ اور سچی بات تو یہ ہے اگر پورب کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید یہاں کے کئی پہلو کبھی نہ دیکھے جا سکتے۔ اور شاید اس صورت میں یہ کتاب لکھنے کا سوال بھی نہ پیدا ہوتا۔

یہ کتاب میرے ان ہی دنوں کے مشاہدات کا نتیجہ ہے۔ ان میں میرے تخیل کو ذرا بھی دخل نہیں۔ صرف طرزِ بیان میرا ہے۔ ان میں جن کرداروں کا ذکر آتا ہے وہ سارے اصلی ہیں۔ سارے میرے جانے پہچانے ہیں۔ میں ان کے ساتھ رہا ہوں۔ اس زمانے کے یہ سارے واقعات میرے ذہن پر نقش ہوتے رہے اور ذہنی طور میں اس کتاب کو اسی دوران میں ترتیب دیتا رہا لیکن اسے تحریری صورت دینا اس زمانے میں میرے لئے ممکن نہ تھا۔ کیونکہ وہاں کی سیاسی فضا کے "دستورِ زباں بندی" کا یہی تقاضا تھا چنانچہ اس کے لئے مجھے کسی موزوں وقت کا خاصا انتظار کرنا پڑا۔

جنوری ۱۹۴۸ء کا وسط تھا۔ جب میں نے ریاسی کے قریب بہنے والے دریائے چناب کو عبور کیا۔ اور اپنی ہوم گارڈز کی کمانڈری والی بندوق سمیت اس علاقے میں داخل ہو گیا۔ جہاں ہندوستانی طیارے دن رات بم برساتے تھے۔ اور کشمیر کے ان عوام کو نیست و نابود کر دینے کے درپے تھے۔ جو اب بھی ہری سنگھ کو کشمیر چھوڑ دو کہے جا رہے تھے۔ جنہوں نے اپنے حصے کا کشمیر ہری سنگھ سے چھڑوا لیا تھا۔ اور شیخ عبداللہ کے دوست نہرو کی فوجوں کی بندوقوں توپوں اور بمبار جہازوں کا مقابلہ صرف اپنے سنگین عزم سے کر رہے تھے۔ یہاں زندگی بڑی مصروف تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ گرچہ میں نے آتے ہی

اس کتاب کو لکھنا شروع کر دیا تھا۔ مگر اس کو ختم کرنا بڑا دشوار ہو رہا تھا۔ گو اس کتاب کے کچھ صفحے کراچی اور راولپنڈی کے پُرامن شہروں میں بھی لکھے گئے۔ لیکن اس کا زیادہ حصہ اتفاق سے مجھے تراڑکھل کے ان جنگلوں میں بیٹھ کے لکھنا پڑا۔ جہاں کشمیر کی نئی آزاد حکومت کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں۔ جہاں جنگلوں میں گھرے ہوئے اس نئی حکومت کے دفاتر تھے اور جہاں میں دیودار کے سایوں میں بیٹھ کر اپنا دفتری کام کرنے کے علاوہ یہ کتاب بھی لکھتا رہتا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان انقلاب کے پرستاروں کو بھی یاد کرتا رہتا تھا جنہیں میں نے سری نگر میں دیکھا تھا۔ اے کاش اگر یہ یہاں ہوتے تو انہیں ایک سچا اور اصلی انقلاب دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی۔ تاہم میں جانتا ہوں کہ اگرچہ وہ لوگ اس سچے اور اصلی انقلاب کو دیکھنے کے لئے یہاں نہیں آ سکے۔ پھر بھی ان کی خوش فہمی ان کا زیادہ دیر تک ساتھ نہیں دے سکی اور جلد ہی ان پر واضح ہو گیا کہ کشمیر میں جو انقلاب کے سے انداز کی شے انہیں نظر آئی تھی۔ وہ محض ایک سیاسی بلبلہ تھا۔ محض ان کے تخیل کی کرشمہ آرائی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ آہستہ آہستہ عوامی اخباروں میں اس انقلاب کے تذکرے مدھم پڑ گئے۔ "پیپلز ایج" میں مکتوب سری نگر چھپنا بند ہو گیا۔ اور جب کچھ دنوں کے بعد مہاراجہ ہری سنگھ جی پھر سے ڈل کے کنارے اپنے عظیم الشان محل میں جا براجمان ہوئے۔ اور لے دے کے یہ انقلاب صرف اتنی ہی تبدیلی لا سکا۔ کہ ہری سنگھ کی بجائے یوراج کرن سنگھ جی بہادر نے اپنے پرجیہ اور پتا جی کا وہ "تاج شاہی" پہن لیا تھا۔ جس کے ساتھ مدتوں پہلے ان کے بزرگوار گلاب سنگھ کے خریدے ہوئے چالیس لاکھ کشمیریوں کی قسمت وابستہ تھی۔ وہی قفس تھا۔ قیدی بھی اب تک پر بریدہ تھے۔ البتہ اس بستی میں ایک نیا ریڈیو سٹیشن ضرور کھل گیا تھا جس کا فرض یہ تھا کہ دن رات آزاد کشمیر کو [illegible]

کے نام نہاد آزاد کشمیر کہتا ہے۔ اور اپنی حکومت کی عوام دوستی کے ـــ بغیر کسی دلیل ہی کے ـــ گن گاتا ہے۔

[illegible] نے ایک مرتبہ غالب کی ٹھیک تائید کی تھی۔ اور غالب نے بھی یہ شعر شاید کشمیر کے ان ہی لوگوں کے بارے میں کہا تھا ـــ

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

اس کتاب میں چونکہ ایک آدھ جگہ چند ترقی پسند ادیبوں کی ان دنوں کی ایک کارگزاری کا بھی تذکرہ آیا ہے۔ اس لئے میں اس سلسلے میں یہ کہہ دینا بڑا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ اس سے ترقی پسندی کے خلاف کہنا ہرگز ہرگز مقصود نہ تھا۔ بلکہ یہ صرف اس افسوس کا اظہار ہے۔ جو اس احساس کی پیداوار تھا۔ کہ ہمارے ہاں بعض اوقات "ترقی پسندی" کا تصور اپنوں ہی کے ہاتھوں کس طرح خوار ہوتا ہے۔

اپنے ترقی پسند دوستوں سے اس معذرت کے علاوہ مجھے کچھ اور معذرتیں بھی کرنی ہیں۔ خصوصاً اپنے بعض ان دوستوں سے جن کا تذکرہ اس کتاب میں کچھ اس طور آیا ہے کہ سچائی کا کڑوا پن اپنا آپ دکھانے لگا ہے۔ ان سے مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ مقصود اس سے قطع محبت نہیں تھا۔ اور یہ کہ یہ تو محض سچ بولنے کا ایک تجربہ ہے۔

مظفرآباد مارچ ۱۹۵۰ء

محمود ہاشمی

چناروں کی آگ

(ا) ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی رات

(ب) ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کا دن

(ج) اور اس کے بعد ۲ نومبر ۱۹۴۷ء تک

(۱)

دو دن ہر سال بھر دسہرہ اور دسہرے کی شام کو مہاراجہ کا شاہی دربار —— جوتے یہیں اتار دیجئے اور راج محل کے سب سے پہلے دروازے پر درباریوں نے اپنے جوتے اتار دیئے اور پھر اُن کی سیاہ جرابیں سفید پاجاموں کے نیچے اور زیادہ نمایاں ہوگئیں۔ سیاہ جرابیں ان کے اوپر چوڑی دار پاجامے کی سلوٹیں، پھر چوڑی دار پاجامہ اس کے اوپر کسی نہایت شوخ رنگ کی ریشمی شیروانی، گاترا اس کے ساتھ لٹکتی ہوئی ایک تلوار اور سر پر ایک بڑا سا تربوزی رنگ کا صافہ۔

درباریوں نے جوتے اتارنے کے بعد پگڑیاں سنبھالنے کی ایک بے بس سی کوشش کی اور پھر جھجکتے ہوئے، شرماتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ ان کی جرابوں کے نیچے قالین تھے اور ان کے دائیں بائیں قدِ آدم آئینے جن میں نہایت مضحکہ خیز صورتیں

حرکتیں کرتی ہوئی اور آگے کو بڑھتی ہوئی، اور آگے کو بڑھتی ہوئی دکھائی دیں۔ یہ شیروانیاں مانگے کی ہیں۔ اور یہ صافہ بھی کسی اور سے بندھوا کے سر پر رکھا گیا ہے۔ ہر صورت دوسری بھی کہتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اور کوئی ہرج نہیں، کوئی ہرج نہیں۔ اس حمام میں سب ننگے ہیں"۔ کی تسلی کا لیبل بھی ہر چہرے پر نمایاں تھا۔

اور مہاراجہ کے محل کے اس حمام میں واقعی یہ سارے درباری ننگے دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں اپنے لباس کے بے ڈھنگے پن کا، اپنے کارٹونوں بنے ہوئے کا، اپنی بے لبسی کا، اور ساتھ ہی ساتھ اپنی اُس خودداری کا، جسے ہر سال وہ اس موقع پر مہاراجہ کی بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔ احساس ضرور تھا۔ مگر ہر سال کی طرح اس سال بھی وہ اسے راج محل کے سب سے پہلے دروازے پر چھوڑ آتے تھے اپنے جوتوں کے ساتھ گھر سے آتے ہوئے اور بازاروں میں سے گذرتے ہوئے جب تک کہ وہ تنہا ساری راہ وہ بے چینی محسوس کرتے گئے تھے۔ لیکن اب مرگِ انبوہ "ایک جشن" بن گیا تھا۔ اب یہ خیال کہ اپنی شیروانی کے نیچے اکثر نے صرف اس لئے دو سوئیٹر پہن رکھے ہیں کہ شیروانی مانگے کی ہے۔ اور اس لئے ان کے ڈھیلی ہے۔ اب انہیں پریشان نہیں کر رہا تھا۔ اور ان کا یہ احساس بھی راج محل کے اس ماحول میں آکے کہیں کھو گیا تھا۔ کہ ابھی تھوڑی ہی دیر بعد انہیں ایک خودکشی کرنی ہے۔ نہایت بے دلی سے انہیں اپنے ہی جیسے ایک انسان کے سامنے صرف اس لئے جھکنا، کہ وہ مہاراجہ ہے اور یہ خود مہاراجہ نہیں۔ اور صرف اس لئے کہ ایک مہاراجہ نے مدتوں پہلے ان ہی جیسے چند انسانوں سے جو مہاراجہ نہیں تھے کہا تھا کہ یوں ان کے سامنے جھکنے میں

ہی ہیں ان کی سلامتی ہے اور ان کی عزت ہے۔ اور سننے والوں میں سے کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کے کہے کو جھٹلا سکے۔ چنانچہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے یہ کہا تھا اور ان کے اجداد نے مانا تھا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے بھی یہ کہا تھا اور ان کے اجداد مان گئے تھے پھر اب جبکہ مہاراجہ ہری سنگھ بھی یہی کہتا ہے تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ بات اپنی اصلیت کھو چکی ہے۔ یہ مجبور ہیں کہ مہاراجہ کی بات کو اب بھی باتوں کی رانی سمجھیں اس لئے "مت آؤ۔ مت آؤ ہمارے قریب۔ اے نئے زمانے کی سوچو کہ تم ہمیں ورغلا رہی ہو اور ہم میں اتنی ہمت نہیں کہ ہم مہاراجہ ہری سنگھ کو جھٹلا سکیں" اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر پیدا کر کے ایک دوسرے سے خوشی کی باتیں بھی کر رہے تھے۔ مگر قد آدم آئینے بدستور ان کا منہ چڑا رہے تھے۔

اور پھر راج محل کے بڑے ہال کا دروازہ آگیا۔

دروازے کے سامنے ہال کے دوسرے سرے پر تخت تھا۔ شاہی کرسی تھی۔ اوپر نیچے دائیں بائیں ہر طرف سنہری جھالریں جھلملا رہی تھیں حکم تھا کہ شاہی کرسی اور تخت کو دروازے میں سے داخل ہوتے وقت جھک کر ہر درباری کورنش بجالائے۔ جس طرح مہاراجہ کی بات باتوں کی رانی ہوتی ہے اسی طرح ہر وہ شے جو مہاراجہ کی ہے قابل احترام ہے۔ اور اگر آپ اسے اپنے سر آنکھوں پر جگہ اس لئے نہیں دے سکتے کہ وہ آپ سے بہت دور ہے تو اس کی برتری اور اپنی خاکساری کے اعتراف کے طور پر کم از کم جھکئے تو۔ چنانچہ ہر ایک درباری جھکا۔ ہر ایک نے اپنی خاکساری کا اعتراف کیا۔ دروازے پر رکتے ہوئے دھڑکتے ہوئے دل اور سہمی ہوئی نگاہوں سے ہر ایک اپنا فرض بجالایا۔ اور اس کے بعد سہما سمٹا ہال میں چپ چاپ مم بخود سا ہو کر ہال کے فرش پر اس جگہ بیٹھ گیا

جو اس کے لئے مخصوص تھی۔ یہ سب رہی ہرسل کی برکت تھی۔ ورنہ اپنی نشست کا پتہ چلانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اور پھر یوں جھکنے کے آداب بجالانے کا سلیقہ بھی آسانی سے نہیں نبھا کرتا۔

ایک ایک کر کے سب درباری بیٹھ گئے۔

ہال میں سناٹا تھا اگر سوئی بھی گرتی تو آواز سنائی دیتی۔ کسی کو سرگوشی تک کرنے کی ہمت نہ تھی۔ "میرے ارد گرد کیا کچھ ہے بھلا دیکھوں تو" ہر دل میں اشتیاق تھا۔ مگر دربار۔ دربار کے آداب۔ راہ میں مزاحم رہا اور روایات کے بھوت خواہ مخواہ دلوں کی دھڑکنیں تیز کر رہے تھے کسی گردن میں جنبش نہ تھی۔ اور کوئی سر نہ تھا جو اٹھا ہوا ہو۔ مگر آہستہ آہستہ ذہن ماحول سے مانوس ہونے لگے۔ اور جھکے ہوئے سر اور جھکی ہوئی گردنیں ذرا ذرا اوپر کو اٹھتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ اور پھر نگاہوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔

شاہی کرسی اب تک خالی تھی البتہ اس کے گرداگرد دونوں طرف قوس کی سی شکل میں ننگی تلواروں والی گارڈ مستعد کھڑی تھی۔ گارڈ اٹین شن کی حالت میں تھی۔ اور اٹین شن کی حالت میں ہلنا ناممکن تھا۔ ہال کی چھت پر جہانگیر اور شاہجہان اور پرتاپ سنگھ و ہری سنگھ کی تہذیبیں گلے مل رہی تھیں منقش چھت کے ساتھ پرانی وضع کے فانوس لٹک رہے تھے جن میں جدید وضع کے بجلی کے قمقمے روشن تھے۔ ان سے ذرا پرے ہال کی چھت کے قریب چھوٹے چھوٹے بالکونی نما جھروکے سے تھے جن میں ہز ہائی نس مہاراجہ ہری سنگھ والئے ریاست جموں و کشمیر کے بہت سے مہمان اس کا طمطراق دیکھنے کیلئے بیٹھے تھے کہیں فوجی وردی میں کوئی انگریز لفٹننٹ کرنل تھا کہیں کسی دیسی ریاست کا کوئی راجہ تھا کہیں کوئی چرٹ پیتا ہوا نہ جانے کون۔ اور ایک طرف غرے سے لدی ہوئی بھاری بھرکم

ایک بوڑھی خاتون بھی تھی جو ایک پانچ چھ سالہ لڑکی کو اپنے ساتھ لگائے بیٹھی تھی۔ غالباً کوئی امیر بیوہ تھی جس کے ساتھ اس کی پوتی بھی آگئی تھی۔ بیوہ کا انداز یوں تھا جیسے وہ اپنی پوتی کو کسی چڑیا گھر میں لائی ہو۔ اور پوتی فرش پر بیٹھے ہوئے درباریوں کو یوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ کسی عجیب جدید قسم کے سرکس میں آئی ہو۔ یہ لوگ اپنا تماشہ کب شروع کریں گے۔ ہائے خدایا کھیل جلد کیوں نہیں شروع ہوتا؟ اور وہ بڑی بیتابی سے ہال کے اس دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں تھوڑی ہی دیر پہلے کھیل کا ابتدائی حصہ دکھایا گیا تھا۔ ان لوگوں نے ہال میں داخل ہوتے وقت کچھ اس انداز کا ایکٹنگ کیا تھا کہ اسے بیساختہ ہنسی آگئی تھی۔ اور اگر اس کی دادی اُسے فوراً نہ روک دیتی تو وہ ضرور تالیاں بجاتی لیکن اُسے روک دیا گیا تھا۔ اور اب وہ حیران ہو رہی تھی۔ کہ یہ سب لوگ جو مسخروں کا سا لباس پہن کر آئے ہوئے ہیں۔ اب چپ چاپ اس طرح منہ بنا کے کیوں بیٹھ گئے ہیں جیسے وہ مسخرے بالکل ہی نہ ہوں۔ اور کسی اُداسی کے کھیل میں کام کرنے والے اداکار ہوں۔ نہ جانے یہ تماشا کیسا ہوگا؟ ہائے اللہ یہ اسے شروع کیوں نہیں کرتے؟

اور اگر یہ تماشا تھا تو جلد ہی اس کے شروع ہونے کے انداز پیدا ہو گئے۔

دربار شروع ہو گیا۔

ایک اونچی کڑکڑاتی ہوئی آواز نے کہا "راجوں کے راجہ .... مہاراجہ ہری سنگھ جی پدھارتے ہیں"

اور ہال میں بیٹھے ہوئے سارے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر زور زور سے بینڈ بجنے لگا۔ اور اس کے بعد دروازے میں سے کچھ آدمی اور ایک مہاراجہ جو ہری سنگھ تھا جلوس کی صورت میں اندر داخل ہوئے۔

کھڑے ہوئے لوگوں کی آنکھیں نیچی ہو گئیں۔ اور اس وقت تک نیچی رہیں۔ جب تک کہ مہاراجہ اپنی کرسی پر نہ بیٹھ گیا۔ اور اس کے پاؤں سامنے کے زریں پائیدان پر نہ ٹک گئے اور ریاست کے ایک معزز گھرانے کا وزیر امین چند شاہی کرسی کے پیچھے اس جگہ کھڑا ہو گیا۔ جہاں کہ وہ شاہی مورچھل کو اس طور سے اپنے ہاتھ میں تھام کر کھڑا رہ سکتا تھا کہ مورچھل کا سایہ مہاراجہ کے سر پر پڑتا رہے۔ تاکہ مہاراجہ کا سایہ وزیر امین چند پر ہمیشہ رہ سکے۔ وزیر امین چند کے اس طرح کھڑا رہنے میں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ اس کڑے وقت میں دوسرے درباریوں کی بھی تھوڑی بہت اس طرح مدد کر سکتا تھا کہ وہ پختگی سالوں کے تجربے کے بل بوتے پر مہاراجہ کے دیکھے بغیر ہی بہت سے ناپختہ درباریوں کو اشارے اشاروں میں سمجھا دے۔ کہ بھئی اب تمہاری باری ہے۔ اٹھو۔ بڑھو۔ جھکو۔ پھر جھکو۔ پھر جھکو۔ اور اب جھک کر ریشمی رومال میں رکھ کر اپنی نذر مہاراجہ کے سامنے پیش کر دو۔

جب مہاراجہ تخت پر اور درباری فرش پر بیٹھ گئے تو کپڑوں کی ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی اور سامنے کی بالکونی پر مہارانی براجمان ہوتی نظر آئی۔ مہارانی اس کی سکھیاں اور اس کے گورو جی جن کے کندھے پر سے شال بار بار نیچے کھسک آتا تھا اور جسے اٹھانے کے لئے بار بار ہر سکھی کا ہاتھ بڑھتا لیکن اٹھانے کی سعادت صرف مہارانی ہی کو نصیب ہوتی

اس کے بعد دربار شروع ہو گیا۔ اور درباری نذریں پیش کرنے لگے۔

سب کے سب ذیلی تعظیمی سردار جھکتے جھکتے گئے۔ اور نذر دینے کے بعد اپنی پیٹھ سنبھالتے سنبھالتے لوٹے۔ مبادا پیٹھ مہاراجہ کی طرف ہو جائے۔ اور آداب و احترام میں فرق پڑے۔ اور وہ اس دربار سے نکال دیئے جائیں کیونکہ ہر سال دو ایک درباری اس بات کی احتیاط نہ کرنے کے جرم کی پاداش میں ضرور نکال دیئے جاتے تھے۔ ان سرداروں کے

بعد دوسرے کم رتبہ کے سرداروں کی باری آئی۔ اور اُنہوں نے بھی تسلیم و رضا کا ثبوت پورے طور پر دیا۔ قالین کے بیچوں بیچ جو راستہ تھا۔ اس پر تین بڑے بڑے پھول بنے تھے۔ اور درباریوں کو ان میں سے ہر پھول پر ٹھہرے ہو کر جھکنا پڑتا تھا۔ اور اس کے بعد مہاراج کے قدموں میں جا کر ان پر جھک کر نذر پیش کرنا ہوتی تھی۔ اور اس احساس کو اپنے دل کے کسی نہاں خانے میں دفن کر دینا تھا۔ کہ یوں اپنے جسم کے ساتھ وہ اس سنگھاسن پر اپنی روح کو بھی جھکا آئے ہیں۔ اور ریشمی رومال میں لپیٹ کر جب وہ ایک اشرفی کی نذر مہاراجے کو پیش کرتے ہیں تو ساتھ ہی ان کی خودداری کا جوہر بھی مہاراجے کے تخت کے پایوں سے ٹکرا کے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت شاعر کا یہ سوال کہ ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اور دور آسمانوں پر وہ فرشتے جنہوں نے کبھی آدم کو سجدہ کیا تھا کچھ اس انداز سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ جیسے ایک دوسرے کو کہہ رہے ہوں "کیا یہی وہ انسان ہے"؟

ہاں یہ وہی انسان ہے۔ صرف دور بدل چکا ہے۔ تاریخ نے پتھر، دھات اور اخلاق و تہذیب کے زمانوں کے بعد اس انسان کو اب مہاجنی دور عطا کیا ہے۔ اور مہاجنی دور کی یہی ریت ہے جس کے پاس چاندی ہے۔ اور سونا ہے۔ وہ تمہیں خریدے گا۔ اور پھر تم اسے پوجو گے۔ ایک صدی پہلے گلاب سنگھ نے ۷۵ لاکھ روپے میں ۳۰ لاکھ انسان خریدے تھے اور پھر اس کے بیٹوں پوتوں نے ان میں سے چند ایک کے دام انفرادی طور پر بڑھا دیئے۔ اور انہیں اور بھی زیادہ خرید لیا۔ کہا کہ تم سردار ہو۔ وزیر ہو۔ میرے گزیٹڈ افسر ہو اور اس لئے آؤ میرے سامنے جھکو اور مجھے پوجو"

چنانچہ وہ سب انہیں پوجتے رہے۔ اور اب مہاراجہ ہری سنگھ کو پوج رہے تھے۔

آخر کب تک انسان کو یوں انسان پوجتا رہے گا۔ کب تک ہم یوں جھکا کریں گے کب تک؟ —— ممکن ہے اس سے پہلے بھی ان درباریوں میں سے ہر ایک کے دل میں یہ سوال بارہا کھٹکا ہو مگر ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء والے دسہرے کی اس رات تو یقینی طور پر یہ سوال ان میں سے اکثر کے دل میں متواتر کھٹک رہا تھا۔ ہر درباری جب نذر دینے کے لئے اٹھتا تو قالین کے تین پھولوں پر اس کے پاؤں لڑکھڑا جاتے اور اس کا خیالات سے بوجھل ذہن اس کے سنبھالے نہ سنبھلتا۔ آخر کب تک اس سامنے بیٹھی ہوئی مورتی کو ہم پوجتے رہیں گے۔ کب تک ہم اپنی انسانی عظمت کو ایک حقیر سے سونے کے سکے کا روپ دے کر اس مورتی کی بھینٹ چڑھاتے رہیں گے......

ہر سال کی طرح اس سال بھی نذر دربار کے اس موقع پر بہت سے نو آموز اور گھبرائے ہوئے درباری نذر پیش کرنے کے آداب میں غلطیاں کر رہے تھے۔ جھکتے وقت زاویہ ٹھیک نہیں بناتے۔ قالین پر ان کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں اور انہیں یاد نہیں رہتا کہ دوسرا پھول کہاں تھا اور تیسرا کہاں ہے۔ اور زیاں کی وہ منزل جو مہاراجہ کے قدموں میں ہے۔ ان سے کتنی دور ہے۔ مگر اس سال مہاراجہ کی آنکھیں ان کے یہ سارے گناہ معاف کر رہی ہے۔ آج مہاراجہ کسی کو دربار سے نہیں نکال رہا۔ آج مہاراجہ خاموش ہے اور سوچ رہا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے میرپور اور پونچھ کے بعد پرسوں شام کو مظفرآباد پر حملہ کیا تھا اور جو آج اوڑی میں تھے۔ اس وقت کہاں ہوں گے، اے کاش یہ دربار

جلد ختم ہو جائے۔ اور میں جان سکوں۔ کہ وہ لوگ اس وقت کہاں ہیں! میرے اس راج محل سے کتنی دور ہیں؟"

دو دن پہلے کشمیر کا نیشنلسٹ لیڈر شیخ عبداللہ دہلی میں تھا۔ اور وہاں ایک دعوتِ طعام میں اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ "پونچھ میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ اس غیر دانشمندانہ پالیسی کا نتیجہ ہے جو حکومت نے اختیار کر رکھی ہے پونچھ کے لوگ جو مدتوں سے مقامی حکمران کے جور و ستم کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ اب ان پر مہاراجہ کشمیر کی طرف سے ظلم توڑے جا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے مطالبات منوانے کے لئے تحریک شروع کر رکھی ہے یہ تحریک فرقہ وارانہ نوعیت کی ہرگز نہیں۔ ریاست کشمیر نے پونچھ میں فوج بھیج دی ہے۔ جس سے سراسیمگی پھیل گئی۔ لوگ اپنے بال بچوں کو [illegible] گئے اور ان میں سے کچھ لوگ ہتھیار لے کر واپس آ گئے۔ اور انہوں نے لڑنا شروع کر دیا......"

اس شام کو جب کہ شیخ عبداللہ دہلی میں یہ کہہ رہا تھا۔ پونچھ کے بعد مظفر آباد میں حکومت کے اسی ظلم کا ردعمل ہو رہا تھا۔ ظالم راجہ کے خلاف جو نفرت پرجا کے دلوں میں تھی۔ اس کا لاوا پھوٹ رہا تھا۔ اور وہ بہتا ہوا اب وادیٔ کشمیر کی طرف آ رہا تھا۔ راستے میں مظلوموں کے آنسو اس آگ میں تیل بن بن کر شامل ہو رہے تھے۔ اور یہ طوفان اب اوڑی تک آ پہنچا تھا۔ اور یہاں سری نگر کی [illegible] سے بھی چنگاریاں سلگنے لگی تھیں اور انتظار ہو رہا تھا۔ آؤ۔ آؤ ظالم کے خلاف لڑنے والے ہمارے مددگار بھائیو! تم نے مظفر آباد سے آتے آتے دیر کیوں لگا دی۔ آؤ کہ ہم تمہارے منتظر ہیں۔ ظالم کا ہاتھ ہماری شہ رگ پر ہے اور اس لئے ہماری آواز گھٹی ہوئی ہے تم آؤ۔ ظالم کا ہاتھ کاٹ دو اور پھر دیکھو

کہ ہمارے بازو تمہارے ساتھ ہوں گے"

اور مہاراجہ یہ سب کچھ جانتا تھا آج تک جو بیج اس نے بوئے تھے اسے ان کا علم تھا مگر اس کی فصل کاٹنا اس کے بس کا روگ تھا۔ عبداللہ کی آواز دہلی میں گونج رہی تھی۔ اور پونچھ کے جانباز اپنی مدد آپ کرنے کے بعد اب اپنے دوسرے بھائیوں کی مدد کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ پونچھ کے مضافات اور مظفر آباد کے بعد اب اوڑی کے قرب و جوار میں غلامی کی وہ زنجیریں جنہیں مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کے اجداد نے مضبوط کیا تھا ٹوٹ رہی تھیں۔ اور ان کی آواز کشمیر کی ساری وادی میں گونج اٹھی تھی۔ مہاراجہ ہری سنگھ تم اور تمہارے اجداد نے جھوٹ بولا تھا کہ تم اپنی پرجا کی جان کے محافظ ہو۔ ان کی عزت کے ضامن ہو۔ اس زمین پر ہمارے خدا ہو۔ آج تک تم نے ہم سے کبھی ہمارا سکھ نہ پوچھا۔ تم ہمارے جھوٹے خدا تھے جس نے ہمیں اپنی خدائی کا ثبوت کبھی نہیں دیا صرف یہی چاہا کہ ہم پستیوں میں رہیں تاکہ تم بلندیوں پر بیٹھ سکو"

اس رات بھی مہاراجہ بلندیوں پر بیٹھا تھا۔ مگر آج اس دھوم دھام۔ جاہ و جلال اور شاہانہ رنگ روپ پر۔ کسی اداسی کا سایہ بھی نظر آ رہا تھا۔ اور اس کے قریب ہی اس کے قدموں میں پستیوں میں بیٹھنے والے سوچ رہے تھے کہیں آج کی رات قدرت کوئی مذاق تو نہیں کر رہی؟

اگر یہ مذاق تھا تو مذاق ختم ہو گیا۔

دربار ختم ہو گیا۔ سب سے پہلے مہاراجہ اٹھا۔ اور اہل نظر میں کہ وزیر امین چند کا موچھل اب بھی اس پر سایہ کئے رکھے وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا چلا گیا۔ مہاراجہ کے لب۔ بالکونی میں سے مہارانی۔ اس کی سکھیاں۔ اور اس کے گرد وہی اٹھے۔ اٹھتے اٹھتے۔ ان کا شال آخری مرتبہ کندھے سے گرا۔ سکھیوں کے ہاتھ بڑھے لیکن پہلے کی طرح

اب بھی یہ سعادت جہانی کو ہی نصیب ہوئی کہ وہ شال اٹھا کر گوروجی کے کندھوں پر رکھ دے۔ اس کے بعد بالکونی میں بیٹھے ہوئے شاہی مہمانوں کی باری آئی جس میں وہ المعٰر لٹ کی بچی بھی تھی جو اس دوران میں مسلسل سوچتی رہی تھی کہ یہ کیسا تماشہ ہے جس میں ایک ہی کھیل کو بار بار دہرایا جاتا ہے۔ "اٹھو جھکو۔ پھر جھکو اور پھر بیٹھ جاؤ۔" اس لئے اکتا کے وہیں کرسی کا آسرا لے کر وہ سو گئی تھی۔ اب جب اس کی بوڑھی دادی نے اُسے جگایا تو پھر بڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ "کیا شو ختم ہو گیا؟"

ہاں"—

اور اگر یہ شو تھا۔ تو شو ختم ہو گیا تھا۔

دربار ختم ہو گیا۔ اور درباری بھیڑیوں کے گلے کی طرح بڑے دروازے کی طرف گئے ایک دوسرے پر گرے جاتے تھے۔ آٹھ بجکر نیتیس منٹ ہو رہے تھے۔

عین اس وقت جب یہ درباری راج محل سے نکل چکے۔ تو یکایکی اندھیرا چھا گیا۔ ہری سنگھ ہائی اسٹریٹ جہاں سے کہ یہ لوگ گزر رہے تھے۔ دفعتاً بھوتوں کی بستی نظر آنے لگا جہاں سے صرف آوازیں ہی سنائی دے رہی ہوں۔ اور نظر کچھ نہ آ رہا۔ امیرا کدل میں پلیڈیم ٹاکیز اور سٹیڈیم ٹاکیز کے بعد مریش اور ریگل ٹاکیز کے سارے تماشائی یکایک اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے اپنے اپنے سینما ہال سے باہر نکل آئے تھے۔ اور حیران ہو رہے تھے۔ ذرا آگے نیڈوز ہوٹل بھی قصر ظلمات بن گیا تھا۔ اور ڈل گیٹ کے ہاؤس بھی اور رگھن کے مکانات بھی..........

یہ بجلی کہاں گئی؟

مگر یہ کوئی مانہ نہ تھا۔

اوڑی سے مہورہ دس میل دور ہے۔ اور مہورہ وہ جگہ ہے جہاں وہ بجلی گھر ہے جس کی بجلی کشمیر کی وادی کو روشن کرتی ہے۔ وہ لوگ جو صبح اوڑی میں تھے۔ اس وقت مہورہ میں تھے۔ اور روشنی ان کے ہاتھ میں تھی۔

اگر یہ بجلی آدھ گھنٹہ قبل بجھتی۔ اگر مہورہ پاور ہاؤس اب سے صرف آدھ گھنٹے پہلے ان کے ہاتھ میں آ جاتا تو راج محل کے فانوس اور راج محل کے قمقمے عین اس وقت بجھتے جب راجہ انسانیت کے ساتھ بلندی اور پستی کا یہ کھیل کھیل رہا تھا جب وہ ان بنیادوں پر تھا۔ جو اس نے اپنی پرجا کے خون کی بنیادوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ اور اس کے درباری ان پستیوں میں تھے۔ جہاں وہ چاہتا ہے کہ اس کی پرجا بیٹھے جہاں اس کی ساری پرجا بیٹھتی تھیں۔

اگر یہ بجلی آدھ گھنٹہ قبل بجھتی تو پھر کیا ہوتا۔ ایک درباری نے سوچا اور پھر اس کی نگاہ اس تلوار پر ٹک گئی۔ جو اس کی گود میں پڑی تھی۔ اور ساتھ ہی اسے اُن ان گنت تلواروں کا بھی خیال آ گیا جو راج محل کے اس ہال میں نذر دربار کے وقت درباریوں کے پہلو میں تھیں۔ تلواروں کو میان سے نکلتے دیر نہیں لگتی اور نفرت خواہ کتنی ہی دبی ہوئی کیوں نہ ہو۔ کبھی نہ کبھی تو ابھر سکتی ہے اور پھر وہ نفرت جس کا لاوا پونچھ سے پھوٹا، میرپور سے پھوٹا اور مظفرآباد پھوٹا، موقع پا کر یہاں سے بھی پھوٹ سکتی تھی۔ اور پھر اس رات اس کے علاوہ بھی اس رات سری نگر میں بہت کچھ ہوا۔ سری نگر میں اس رات خیالات اور جذبات کی چنگاریاں مختلف روپ میں سلگتی رہیں۔ ساری رات لوگ جاگتے رہے اور اپنی خوابگاہوں کی کھڑکیوں سے ان جلوسوں کو دیکھتے رہے۔ جو تھوڑے تھوڑے

وقفوں کے بعد وہاں سے گزرتے تھے اور ان نعروں کو بھی سنتے رہے جو ان جلوسوں سے بلند ہوتے تھے۔

ایک جلوس گزرا۔ اور نعرے بلند ہوئے۔

"یہ ملک ہمارا ہے۔ اس کی حفاظت ہم کریں گے۔ اس کی حکومت ہم کریں گے۔"

حملہ آور ہوشیار۔ نیشنل کانفرنس ہے تیار۔"

یہ نیشنل کانفرنسیوں کا جلوس ہے۔ اور یہ لوگ اپنی تیاریوں کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ مگر نیشنل کانفرنس کس کے لئے تیار ہے؟

کیا حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے؟

وہ لوگ جن کے ذہن میں شیخ عبداللہ کی دہلی کی دعوت طعام والی دو ہی دن پہلے کی تقریر ابھی تازہ تھی۔ یہ سن کر حیران رہ گئے۔ کیا نیشنل کانفرنس حملہ آوروں کا مقابلہ کرے گی۔ اور کیا یہ لوگ واقعی حملہ آور ہیں۔ یہی تو وہ لوگ ہیں جو کچھ دنوں پہلے پونچھ میں تھے اور جن کے بارے میں نیشنل کانفرنس کے صدر نے کہا تھا کہ ان پر دربار کشمیر کی طرف سے ظلم توڑے جا رہے ہیں۔ اور ان لوگوں نے اپنے مطالبات منوانے کیلئے تحریک شروع کر رکھی ہے۔ اور یہ فرقہ وارانہ نوعیت کی ہرگز نہیں۔ یہی وہ مظلوم تو ہیں جو کچھ روز پہلے پونچھ تھے پرسوں مظفرآباد تھے۔ جو آج صبح اُوڑی میں تھے۔ اور جو اب مہورہ میں ہیں۔ کیا عبداللہ نے ان کے بارے میں جو کچھ دہلی میں کہا تھا۔ وہ سری نگر کی اس نیشنل کانفرنس نے نہیں سُنا۔ اور کیا اس کے صدر کی آواز اُن کے کانوں میں اب تک نہیں پہنچی؟

نیشنل کانفرنس والے نعرے لگا رہے تھے: "حملہ آور ہوشیار نیشنل کانفرنس ہے تیار"

اور سری نگر کے لوگوں کو دہلی یاد آ رہی تھی۔ ہم آنے والے تو ہیں جنہیں نیشنل کانفرنس

کے صدر نے پرسوں دہلی میں مظلوم کہا تھا۔ اور جنہیں آج نیشنل کانفرنس سری نگر میں حملہ آور کہہ رہی ہے۔ یہ لوگ بھی اسی کشمیر کے ایک حصے کے بسنے والے ہیں۔ "آزاد کشمیر زندہ باد" ان کا نعرہ ہے۔ اور اس نعرے کا مطلب بھی وہی ہے جو نیشنل کانفرنس کے ایک نعرے کا ہے۔ "یہ ملک ہمارا ہے۔ اس کی حفاظت بھی ہم کریں گے اور اس کی حکومت بھی۔" تو پھر یہ نیشنل کانفرنس انہیں کیوں ہوشیار کر رہی ہے؟ یہ انہیں کیوں محض ایک حملہ آور سمجھ رہی ہے؟

مگر یہ بات کوئی نہیں بتاتا۔ وہ صرف نعرے لگا رہے ہیں۔ اور سری نگر کے گلی کوچوں میں پھر رہے ہیں۔ اور سری نگر کے مکانوں میں سری نگر کے رہنے والے انہیں دیکھتے ہوئے اور ان کے نعروں کو سُنتے ہوئے سوچ رہے ہیں۔ کیا نیشنل کانفرنس واقعی سچ کہہ رہی ہے۔ اور کیا اس کے صدر نے دہلی میں دو ہی دن پہلے جو کچھ کہا تھا۔ وہ غلط تھا؟

دُور ایک کھڑکی میں کھڑا جلوس کو دیکھتے ہوئے سری نگر کا ایک شہری سوچ رہا ہے کہ پچھلے سال انہیں فضاؤں میں "کشمیر چھوڑ دو" کا نعرہ گونجا تھا۔ برستی ہوئی گولیوں میں عوام "ہری سنگھ مردہ باد اور اس کا بیٹا کرن سنگھ مردہ باد" چلاتے تھے۔ اور اُن کا راہنما شیخ عبداللہ گرفتار ہو گیا تھا۔ اور لوگ سارا سال "باغی عبداللہ زندہ باد" کے نعرے الاپتے رہے تھے۔ مگر آج اسے بغیر کسی وجہ کے ہری سنگھ نے رہا کر دیا ہے اور ہری سنگھ کی اس نوازش نے نیشنل کانفرنس کو اس کے سارے پرانے نعرے بھلا دیئے ہیں۔ اور اگر اب انہیں کوئی اس طرح کا نعرہ یاد بھی دلاتا ہے جس میں مہاراجہ سے "کشمیر چھوڑ دو" کہا جا رہا ہو۔ اور جس میں غلامی کی زنجیریں توڑنے کا خواب لہرا رہا ہو۔ تو نیشنل کانفرنس اسے پسند نہیں کرتی۔ شاید یہی وجہ ہے۔ کہ آج "آزاد کشمیر زندہ باد" کا نعرہ اُسے بُرا

سمجھتے ہیں۔ کہ کبھی کبھار دبی زبان میں ذمہ دار نظام حکومت کا مطالبہ کر لیا جائے اور یوں عوام کو یہ تھپکی دے دی جائے۔ کہ اگرچہ ہم پر مہاراجہ مہربان ہو چکا ہے اور ہم بڑی بڑی اونچی اونچی محفلوں میں باریاب ہو چکے ہیں۔ تاہم غم نہ کرو ہم تمہیں اب تک نہ بھولے۔ اب نیشنل کانفرنس پر مہاراجہ کا سایہ ہے۔ اور باغی باغی نہیں رہے۔ اس لئے اب اگر نیشنل کانفرنس کے سامنے مسلم کانفرنس اپنی کوئی بات سنانا چاہے۔ تو نیشنل کانفرنس اُسے نہیں سننے دے گی۔ نہیں سننے دے گی۔

مسلم کانفرنسیوں کا جلوس چلا گیا۔ اور نیشنل کانفرنسیوں کے جلوس سے اب ایک اور نعرہ گونجا۔ "عوامی راج زندہ باد" اور اس وقت یوں محسوس ہوا جیسے سرینگر کے عوام کے منہ پر کسی نے زور سے ایک طمانچہ دے مارا۔

جب مسلمانوں کے بڑے بڑے رہنما جیلوں میں ہوں۔ یا ریاست بدر کر دیئے گئے ہوں کشمیری پنڈتوں کے پریم ناتھ بزاز اور پریم ناتھ کھنہ جیسے بڑے رہنماؤں کو صرف اس لئے جیل میں ٹھونس دیا گیا ہو کہ جب کشمیر کے عوام کشمیر بنے گا۔ پاکستان کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو وہ ناک بھوں نہیں چڑھاتے بلکہ مسکراتے ہیں۔ کشمیر ٹائمز کے ایڈیٹر اور اس کے ہندو سیکرٹری کو صرف اس لئے ریاست سے باہر نکال دیا گیا ہو کہ وہ اپنے اخبار میں عوام کے ان جذبات کی ترجمانی کرتے تھے۔ جن سے مہاراجہ کی نیندیں اچاٹ اور اس کے بہت سے خواب چکنا چور ہو چکے ہو جاتے تھے جب یہ سب کچھ نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہو تو اس وقت نیشنل کانفرنس کا اس انداز میں "عوامی راج زندہ باد" کا نعرہ بلند کرنا عوام کی حرماں نصیبی کا مضحکہ اڑانا نہیں تو اور کیا ہے؟ اور ایسے وقت میں اگر کشمیر کا کوئی حساس شہری یہ سوچ لے کہ کیا پریم ناتھ بزاز کی کسان مزدور کانفرنس مسلمانوں کی مسلم کانفرنس اور پریم ناتھ کھنہ

معلوم ہو رہا ہے کہ وہ لوگ جو "آزاد کشمیر زندہ باد" کہتے ہوئے سری نگر کی طرف بڑھے آ رہے ہیں۔ اس کی نظر میں محض حملہ آور ہیں، محض حملہ آور۔"

ایک اور جلوس گزرا "پاکستان زندہ باد" اور "کشمیر بنے گا پاکستان" کے نعرے لگاتا ہوا۔ یہ مسلم کانفرنسیوں کا جلوس ہے۔ یہ لوگ حکومت کرنے والے خواب کو حقیقت میں بدلنے کا انداز بھی بتا رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں۔ کہ کشمیر اگر پاکستان میں شامل ہو جائے۔ تو یہ عوام کی جیت ہو گی۔ اور ان ہندوؤں کو بھی جیت ہو گی۔ جو سیاسی پگڈنڈیوں کی بجائے سیدھی سڑک پر چلنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن ان مسلم کانفرنسیوں کی آواز کوئی نہیں سننے دیتا۔ یہ اپنی سنانا چاہتے ہیں۔ مگر فضائیں ان کے لئے سازگار نہیں۔ ان فضاؤں کو ان کے لئے ایک ایسا نقار خانہ بنا دیا گیا ہے جہاں ان کی آواز طوطی کی آواز بن جاتی ہے۔ ابھی یہ لوگ نعرے بلند کر رہے ہیں کہ نیشنل کانفرنس کا ایک اور جلوس آ جاتا ہے۔ "شیر کشمیر زندہ باد" اور "نیشنل کانفرنس زندہ باد" کے نعرے "کشمیر بنے گا پاکستان" والے نعروں کو دبا لیتے ہیں۔ اور مسلم کانفرنسیوں کی آواز مدھم پڑ جاتی ہے۔ اور یہ آواز مدھم کیوں نہ ہو جب ان کا سرپرست چوہدری غلام عباس ابھی تک جیل میں ہے۔ مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر چوہدری حمید اللہ کو ریاست سے نکال دیا گیا ہے۔ اور جواں سال رہنما سردار ابراہیم کیلئے بھی یہاں کی فضائیں تنگ قرار دی جا چکی ہیں۔ پھر آخر ان کی آواز مدھم کیوں نہ ہو — اور نیشنل کانفرنس کی آواز انہیں کیوں نہ دبائے جس کے رہنما کبھی باغی تھے۔ اور جیلوں میں تھے۔ مگر جنہیں جیلوں سے نکال دیا گیا ہے۔ اور جو اپنے آپ کو آج باغی کہلوانا پسند نہیں کرتے۔ اور اپنی لیڈری کے بھرم کو قائم رکھنے کے لئے اتنا ہی ضروری

کے پیو کشمیری پنڈت عوام میں شامل نہیں۔ اور کیا صرف وہ گنتی کے چند لوگ ہی عوام کے نمائندے ہیں جن کا کسی نہ کسی طور نیشنل کانفرنس سے تعلق ہے تو اس میں بیچارے شہری کا کیا قصور؟

اُس رات جب کہ جلوس آ رہے تھے۔ اور جلوس جا رہے تھے۔ نعرے بلند کئے جا رہے تھے۔ اور نعرے دبائے بھی جا رہے تھے۔ سری نگر کا ایک شہری نہیں۔ بلکہ اڑھائی لاکھ شہریوں میں سے بیشتر ایسی ہی باتیں سوچ رہے تھے۔

اور ان اڑھائی لاکھ شہریوں سے دور جھیل ڈل کے کنارے اپنے عظیم الشان محل میں مہاراجہ ہری سنگھ اُداس بیٹھا تھا اگرچہ اس شام کو اُس نے نذر دربار رچایا تھا۔ اور اس دوران میں اپنے آپ کو پورے طور پر یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ کہ وہ اب بھی اپنی پرجا کا معبود ہے۔ اب بھی اس کی پرجا اس کی غلام ہے وہ اسے اپنے سامنے جھکا سکتا ہے۔ اس سے اپنی پوجا کروا سکتا ہے۔ اور اگرچہ باغی عبداللہ بھی اب اُس کا بن چکا تھا اور عبداللہ کی نیشنل کانفرنس بھی اب عہدنامہ امرتسر توڑ دو۔ کشمیر چھوڑ دو کے نعرے بلند نہیں کر رہی تھی۔ اور آزاد کشمیر زندہ باد کہتے ہوئے کشمیر کے اس حملے کی طرف آنے والوں کو حملہ آور کہنے لگی تھی۔ لیکن پھر بھی اُسے اطمینان میسر نہ آسکا تھا۔ وہ اُداس رہا تھا۔ اب بھی اُداس تھا۔ اور یہ اُداسی بڑھتی جا رہی تھی۔ حملہ کرنے والے مہورہ تک پہنچ چکے تھے۔ کل وہ بارہ مولا پہنچ جائیں گے۔ اور پرسوں یہاں۔ افواہیں گرم تھیں

کہ وہ لوگ عید کی نماز سری نگر میں پڑھیں گے۔ اور اب یہ افواہیں سچ معلوم ہونے لگی تھیں مہورہ سے بارہ مولہ کچھ دور نہیں۔ اور بارہ مولہ سے سری نگر صرف [illegible] میل ہے اور پرسوں عید ہے اور کون کہہ سکتا ہے۔ سری نگر کے یہی لوگ جو آج شام کو اس کے سامنے جھکے رہے تھے۔ ان کے پیچھے ہی ان کی صفوں میں جا کھڑے ہوں۔ اور عید کی نماز ایک ساتھ ہی ادا کریں۔ ان کا معبود بھی وہی بنے۔ جو اُن کا ہے۔ اور یوں اس رات کی ابتدا میں جلوہ پرجا کا جو کھیل کھیلا گیا تھا۔ وہ محض ایک مذاق بن کر رہ جائے اور وہ مہاراجہ جس نے پرجا کے دلوں میں جھانکنے کی آج تک کبھی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ قدرت کے اس مذاق میں پس کر رہ جائے۔

مہاراجہ نے سوچا۔ وہ بھاگ جائے گا۔ سری نگر کی یہ نگری چھوڑ کر ڈل کے وسیع پانیوں کا یہ منظر چھوڑ کر اور یہ باغ دراغ چھوڑ کر وہ بھاگ جائے گا۔ آج تک وہ لوگوں سے یہ کہتا رہا تھا۔ کہ وہ ان کی جان و مال کا محافظ ہے۔ مگر آج اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اصل میں یہ لوگ ہی اس کی جان و مال کے محافظ تھے۔ چونکہ دل نے کبھی دل کو اپنایا نہ تھا۔ راجہ اور پرجا آج تک ایک دوسرے سے دور رہے تھے۔ اور سدا سکھ کے جھولے میں جھولنے والے راجہ نے کسی کے دکھ کی آہیں سننا کبھی پسند نہ کیا تھا۔ اس لئے آج بھی یہ دور ہی رہیں گے۔ پرسوں جب وہ لوگ جن کا خون مدتوں تک ظلم سہتے رہنے کے بعد اب کھول رہا ہے۔ عیدگاہ میں کسی بلند و برتر محبوب کے سامنے جھکیں گے۔ تو مہاراجہ ان کی نگاہوں میں ایک حقیر ذرہ ہوگا۔ اور اس حقیر ذرے کو ان کے پاؤں کی ٹھوکر اڑا دے گی۔ اور اسی لئے مہاراجہ نے سوچا۔ وہ بھاگ جائے گا۔ یہ بزدلی ہی سہی لیکن آخر وہ یہاں کس بل بوتے پر رہے۔ اپنا ماضی اُس کے سامنے تھا۔ اور اپنے بھیانک مستقبل کو دیکھنے کی اس میں تاب

نہ تھی۔ اور اس لئے صبح ہوتے ہوتے وہ بھاگ گیا اپنی مہارانی کو لے کر اور اپنے کچھ حواریوں کو لے کر وہ بھاگ گیا۔ اور لاریاں اور کاریں انہیں بھگا کر لے گئیں۔

مہاراجہ کہاں جائے گا"

شاید جموں۔

مگر سری نگر کے لوگ اس رات یہ نہیں جانتے تھے۔ کہ کون جا رہا ہے۔ اور کب جا رہا ہے البتہ اس رات کے آسمان کے ستارے جو سری نگر کی اس یادگار رات میں انسان کی ساری کمزوریاں اور انسانیت کی ساری عظمت کو اپنی تمام تر عریانی کے ساتھ دیکھ رہے تھے یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ کہ آج کی رات صدیوں کی بنی ہوئی روایات کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ ماضی کا سب پاش پاش ہو گیا ہے۔ اور مہاراجے کو اپنی منزل نظر نہیں آ رہی! اور اس وقت جب کہ مہاراجہ اپنی کار میں بیٹھا۔ اپنے ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے میں بندوق سنبھالے اپنے شاہی مندر کی سونے کی مورتیاں وہاں سے اکھڑوا کے اپنے ساتھ لئے بھاگا جا رہا تھا۔ تو ایک ستارے نے اپنے پڑوسی ستارے سے پوچھا کہ مہاراجہ یہ مورتیاں اپنے ساتھ اس لئے تو نہیں لے جا رہا۔ کہ یہ سونے کی ہیں تو پڑوسی ستارہ کھکھلا کے ہنس پڑا۔ —— آہ اے مہاراجہ تم مہاراجہ ہی کے ہمیشہ بھولے رہے۔ کہ تم انسان بھی ہو۔ ورنہ آج تمہیں انسانوں سے یوں نہ بھاگنا پڑتا۔

مہاراجہ بھاگ گیا۔ اور سری نگر کی وہ رات ختم ہو گئی۔

(۲)

پھر صبح ہوئی۔ دن چڑھا۔ اور اس وقت راجدھانی تھی مگر باقی نہ راجہ تھا نہ راج۔

سری نگر کے راج محل پر لہرانے والا جھنڈا غائب تھا اور اس کے سامنے کی جھیل ڈل خاموش تھی۔ اور جھیل ڈل میں بنا ہوا کبوتر خانہ بھی جو راجے کے لئے مدتوں ایک طرح کا عیش مقام اس کبوتر خانے کے مغل بادشاہوں کا جلال دکھاتا تھا۔ پھر یہاں سکھ آئے تھے مہاراجے تئے تھے۔ ہری سنگھ آیا تھا۔ اور اب یہاں کوئی اور آ رہا تھا۔ اور سری نگر کی دنیا بدل گئی تھی مہاراجہ بھاگا۔ اور پھر پرجا نے سوچا کہ شاید انہیں بھی بھاگ جانا چاہیئے اور اڑھائی لاکھ انسان یہ سوچنے لگے۔ کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیئے۔

کچھ لوگوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ لاری والوں نے کرائے بڑھا دیئے اور روڈ ٹریفک کے سارے قوانین بھی بھول گئے لاریوں کی چھتیں بوجھ سے اٹ گئیں کاریں بوجھ ڈھونے والے چھکڑے دکھائی دینے لگیں اور ان میں بستروں اور ٹرنکوں کے بے پناہ انبار کے درمیان انسانی سر نہایت حقیر سے معلوم ہونے لگے۔ اس دن پٹرول ایک ایک سو روپے فی گیلن بکا اور بہت سی کاریں محض اس لئے خریدی گئیں کہ ان کے ساتھ اپنا پٹرول بھی خریدا جا سکتا تھا جس سے کار جموں تک جا سکے۔ آناً فاناً پٹرول اور کاروں کے بہت ڈھیر دے چکا دئے گئے۔ اور پھر بانہال روڈ پر اس شدت کا ٹریفک جاری ہو گیا کہ اگر اطمینان کا زمانہ ہوتا تو اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ مگر اسی وقت ایسی کوئی دشواری نظر نہ آ رہی تھی کیونکہ وہاں کوئی نہ تھا جو ایسی باتوں پر پریشان ہوتا مہاراجے کے ساتھ ساتھ حکومت کے سب سے بڑے کارندے بھی رات کے اندھیرے میں اسی سڑک سے سری نگر چھوڑ چکے تھے۔

ہاؤس بوٹوں کے ان ہانجیوں کی قسمت بھی یکا یک جاگ اٹھی۔ جن کا کاروبار پچھلے سال کے دو بڑے ہنگاموں کی وجہ سے ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ شیخ عبداللہ کی "کشمیر چھوڑ دو" والی گڑبڑ اور اس کے بعد ۱۵ اگست کے بعد کی افراتفری نے سیاحوں کو کشمیر سے دور رکھا تھا۔ اور اس لئے ہانجی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ مگر اب اکتوبر کی اس پچھلی تاریخ کو جیسے اچانک ان کے لئے بیاہ و دل کا زمانہ لوٹ آیا۔ وہ لوگ جو جموں نہیں جا سکتے تھے مضطرب سے ہو کر نقل مکانی کرنے لگے اور یوں معلوم ہونے لگا جیسے

ہر شخص اپنے گھر کے سوا باقی ہر گھر کو محفوظ سمجھتا ہے۔ اگر رام منشی باغ کے لوگ امیراکدل کی طرف بھاگ رہے تھے تو امیراکدل کے لوگ گھر مل باغ کی طرف، گھر مل باغ کے بٹ مالو کی طرف اور ڈل گیٹ کی طرف۔ بلکہ ڈل گیٹ کی طرف تو ہر طرف سے بھاگم بھاگ تھی اور ہانجی ان کو گھیرے ہوئے چلا رہے تھے۔ "صاحب، مس امریکہ ہے چار کمرہ والا بوٹ۔ پچھلا سال اس میں جو صاب رہتا تھا وہ بہت بڑا صاب تھا" اور "صاب یہ سان سوسی ہے۔ اٹلی کا ایک میم صاب کو یہ بوٹ بہت پسند تھا۔ یہ دیکھئے اس کاغذ پر اس نے ہم کو خود لکھ کر دیا تھا" اور "صاب ہمارا بوٹ میں ریڈیو بھی ہے اور ہم ہر قسم کا کھانا بنا سکتا ہے۔ انگریزی کھانا۔ اٹلی کا کھانا۔ ترکی کا کھانا۔ جرمن کا کھانا اور چین جاپان کا کھانا بھی۔ ہم صاب کو اتنا کھلائے گا کہ صاب جھیل ڈل کو بھول جائے گا۔ کشمیر کو بھی بھول جائے گا" اور پھر ہی ہی۔ ہی ہی والی خوشامدانہ ہنسی۔

مگر آج اس ہنسی کی کوئی قدر نہ تھی کیسا صاب۔ کونسی مس امریکہ، اور کہاں کا سان سوسی۔ آج یہ سب باتیں بے معنی ہو چکی تھیں۔ ہانجی لوگ اپنی عادت سے مجبور اپنی الاپے جا رہے تھے۔ سننے والے بھی بظاہر سن رہے تھے۔ لیکن ہاؤس بوٹوں کے یہ خریدار ان خریداروں سے بہت مختلف تھے جنہیں یہ باتیں بھی اتنی ہی پر لطف معلوم ہوا کرتی تھیں جتنی ہاؤس بوٹ کی زندگی۔ آج کے یہ خریدار یہاں زندگی کا لطف اٹھانے کے لئے نہیں آ رہے تھے۔ بلکہ زندگی کو بچانے کے لئے آ رہے تھے اور اس لئے ان کے واسطے یہی خیال بہت تھا کہ ہاؤس بوٹ پانی میں رہتا ہے اور چونکہ پانی اور آگ کا بیر ہے۔ اس لئے یہ لڑائی جو اب بارہ مولا کے آس پاس کہیں ہو رہی ہو گی۔ جب سرینگر کے بازاروں میں آئے گی تو لڑائی کی

آگ سے وہ محفوظ ہوں گے۔ اور گیہوں کے ساتھ گھن نہیں پس سکے گا۔ اور اس لئے وہ دھڑا دھڑ ہاؤس بوٹوں میں جمع ہو رہے تھے۔ اور ہانجیوں کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ اکتوبر نہیں مارچ ہے۔ ان کی آمدنی کا اولیں مہینہ۔ ابھی ابھی ان کا سیزن شروع ہوا ہے۔ اور اب بادام کا شگوفہ پھوٹے گا سیاح آئیں گے۔ اور ان کی جیبیں سال بھر کے لئے بھر جائیں گی۔ کم از کم اس ایک دن میں ان کی جیبیں خوب بھریں۔ ڈل گیٹ سے ذرا ہٹ کر سڑکوں پر جہاں ٹانگے لوگوں کو اپنے گھر سے کسی اور گھر کی طرف لے جا رہے تھے اور جہاں کاریں اور لاریاں جموں کا رخ کئے ہوئے تھیں ایک اور ہی عالم تھا۔ وہاں تلاشیاں لی جا رہی تھیں نیشنل کانفرنس کے والنٹیر سرخ بلے لگائے اور ہاتھوں میں لاٹھیاں لئے ہر ایک کی تلاشی لے رہے تھے۔ اور یہ تلاشی ہر چند قدم کے بعد دوبارہ ہوتی تھی۔

"ٹھہرو" اور ٹانگہ رک جاتا تھا۔

"سامان باہر نکالو اور تلاشی دو" اور تلاشی شروع ہو جاتی تھی۔

اگر اس وقت کوئی جرأت کرتا اور کہتا کہ ہماری تلاشی اس تھوڑے سے فاصلے میں امیراکدل سے نکلنے کے بعد سے ابھی تک ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ ہو چکی ہے۔ تو تیوریاں چڑھ جاتی تھیں۔ اور تلاشی کا انداز ذرا زیادہ سخت ہو جاتا تھا۔ "اس میں کیا ہے؟ کیمرہ؟ یہ کیمرہ کیوں لئے جا رہے ہو؟" اور کیمرہ ضبط ہو جاتا تھا۔ گھڑیاں ضبط ہو جاتی تھیں سویٹر ضبط ہو جاتے تھے۔ ہر خوبصورت چیز ضبط ہو جاتی تھی۔ کیونکہ کہا یہ جاتا تھا کہ ہم تلاشی اس لئے لے رہے ہیں کہ تم کہیں کوئی اسلحہ تو نہیں لے جا رہے۔ اس لئے تلواروں اور بندوقوں کے علاوہ چاقو اور بلیڈ تک بھی ضبط ہو جاتے تھے۔

"یہ بلیڈ تو شیو کے لئے ہیں"

"مگر یہ وقت پڑنے پر خون بھی بہا سکتے ہیں"

اور اس لئے بلیڈ بھی اسلحہ سمجھا جاتا تھا بلکہ بعض اوقات اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ بلیڈز کے بغیر اس کا شیونگ سٹ بیکار ہے تو اس گستاخی کیلئے اس کا شیونگ سٹ بھی ضبط ہو جاتا تھا۔ "کم بخت۔ وقت کی نزاکت کو نہیں سمجھتے"

اور وقت کی نزاکت کو سمجھنے والے نیشنل کانفرنس کے یہ والنٹیر یہ سب کچھ ضبط کر لیتے تھے اور پھر گھڑیاں ان کی کلائیوں پر جا ٹکتی تھیں سویٹر ان کے سینے کی زینت بن جاتے تھے بلیڈز ان کی جیبوں میں جا پڑتے تھے اور کیمرے اور اس طرح کی دوسری چیزیں اُن کا کوئی ساتھی گھر کی طرف لے جاتا تھا۔ ضبط شدہ تلواریں اور بندوقیں بھی ان کے بڑے کام آ رہی تھیں۔ کیونکہ آہستہ آہستہ نیشنل کانفرنس کے والنٹیرز مسلح ہوتے جا رہے تھے کل تک وہ نہتے تھے۔ آج صبح اُن کے پاس لاٹھیاں تھیں۔ اور وہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس" والی کہاوت جان کر عالم باعمل بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور اس لئے انہوں نے اپنی لاٹھیوں کا پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب لاٹھیوں کی جگہ تلواریں اور بندوقیں لے رہی تھیں اور تلاشیاں جاری تھیں۔ اور ان کے ساتھ ہی ساتھ جلوس بھی جستے لے رہے تھے اور نعرے بھی تھے "نیشنل کانفرنس زندہ باد"

اور نیشنل کانفرنس واقعی زندہ باد تھی اگر نیشنل کانفرنس زندہ باد نہ ہوتی تو لوگوں کے کیمرے ان سے کیوں چھنتے! ان کی سویٹر انہیں کے پاس کیوں نہ رہتے۔ اُن کا شیونگ سٹ آخر کیوں کسی لال بلے والے کی بھینٹ چڑھتا۔ اور سہمے ہوئے ڈرے ہوئے لوگوں کو یہ کیسے پتہ چلتا کہ قانون کے ختم ہونے کے بعد لاقانونی کا بھی ایک دور ہوتا ہے اور وہ دور شروع ہو گیا ہے اور اس لئے نیشنل کانفرنس واقعی زندہ باد

تھی۔ جو سری نگر کے شہریوں کو شہرت اور قانون کا یہ عملی سبق پڑھا رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ عوامی راج بھی زندہ باد تھا۔ آخر یہ سب تلاشیاں لینے والے بقول نیشنل کانفرنس عوام کے نمائندے ہی تو ہیں! اور پھر تلاشی ہمیشہ وہ لیتا ہے جس کے ہاتھ میں راج ہو اور جس کے ہاتھ میں راج ہو اس کو کچھ کرنے سے کوئی کیسے روک سکتا ہے اور اس لئے نیشنل کانفرنس کو بھی من مانی کرنے سے کون روک سکتا ہے چنانچہ اس کے والنٹیروں کے ہاتھ میں لاٹھیاں تھیں۔ اور وہ سری نگر کے ان نہتے اور ڈرے ہوئے شہریوں پر راج کر رہے تھے۔ اور اس لئے ایک اور نعرہ بھی تھا۔ "عوامی راج زندہ باد"

جلوس گذر رہے تھے۔

مسلم کانفرنس کے جلوس بھی تھے مگر آج ان کی آواز بھی مدھم تھی۔ اے کاش اصول پر چلنے والی مسلم کانفرنس بے اصولی کی راہوں پر بھی چلنا جان سکتی پھر آج اس کا بھی بول بالا ہوتا۔ کمزوروں کو مرعوب کرنے کا گُر اسے بھی آتا ہوتا۔ تو وہ بھی آج زندہ باد ہوتی۔

مگر آج صرف نیشنل کانفرنس ہی زندہ باد تھی اور نیشنل کانفرنس والے تلاشیاں لے رہے تھے مجبور و معذور شہری تلاشیاں دے رہے تھے۔ اور وہ جو ان کی مدد کرنے آ رہے تھے ابھی دُور تھے آج عید نہ تھی۔

دوسرے دن عید آئی مگر وہ جن کا انہیں انتظار تھا، وہ نہ آئے۔ نہ آ سکے بارہ مولا کے لوگوں کی محبت ان کے ارادوں پر غالب آئی اور بارہ مولا والوں نے انہیں وہیں روک لیا۔

سری نگر میں عید ذرا دکھی پھیکی رہی۔

اور یہ عید سرینگر والوں کے لئے صرف بظاہر ہی پھیکی نہ تھی۔ بلکہ اس عید کے دن جب کہ ساری اسلامی دنیا میں ایک پرانی قربانی کی یادگار کے طور پر قربانیاں دی جا رہی تھیں دلی میں ایک خودغرض مسلمان اپنے فائدے کے لئے ایک ایسا خونیں معاہدہ بھی کر رہا تھا جس کی رو سے کشمیر کے سارے مسلمان بیچے جا رہے تھے ایک خودغرض مسلمان اپنے فائدے کے لئے تیس لاکھ مسلمانوں کی قربانی دینے کو آمادہ تھا وہ جس نے پچھلے سال کہا تھا "قوم فروختند وچہ ارزاں فروختند" آج اس قوم کو اس سے بھی سستے داموں بیچ رہا تھا۔ اور اس وقت وہ "قوم فروختم وچہ ارزاں فروختم" بالکل نہیں کہہ رہا تھا۔

امیرا کدل میں لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا اور یہاں کھوے سے کھوا چھلنے اور تھالی گرے تو سر ہی سر جائے والے سارے محاورے بڑی شدت سے یاد آتے تھے چوک کے گرداگرد نیشنل کانفرنس کے والنٹیروں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ اور وہ اس گھیرے میں کسی کو داخل نہ ہونے دیتے تھے اس کے علاوہ یوں بھی وہ اس ہجوم کو ہجوم رواں بنانے پر تلے ہوئے تھے جہاں کہیں انہیں ایک سے زیادہ آدمی رکتے یا رک کے باتیں کرتے نظر آتے۔ سرخ بلے والا کوئی والنٹیر انہیں وہاں سے پھر متحرک کر دیتا۔

آپ لوگ یہاں کھڑے نہ ہوں۔

بھئی ہم پریس رپورٹر ہیں اخبار کے لئے مضمون لکھنا ہے اس لئے دیکھنے بھالنے کے لئے یہاں ٹھہرنا اشد ضروری ہے"

آوہ یہ بات ہے"

اور والنٹیر چلا گیا لیکن کسی کو اتنی جلدی مراعات حاصل نہیں ہو سکتیں اس لئے جلد ہی

ایک اور والنٹیر آگیا آپ کس اخبار کے رپورٹر ہیں"

جی ملاپ کا" کہنے والا عقلمند معلوم ہوتا تھا۔

"ملاپ۔ لاہور والا ملاپ"

جی

تو پھر آپ یہاں کھڑے ہو کر رپورٹ نہیں لکھ سکتے اور والنٹیر کے انداز بدل گئے "مگر اب تو یہ دہلی سے نکلتا ہے" اور کہنے والے کی عقلمندی نے ڈوبتے ڈوبتے تنکے کا سہارا لیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے"

اور دہلی کا اسم اعظم کام کر گیا بھلا دلی کا اسم اعظم کام کیوں نہ نکالتا دہلی ہی تو وہ شہر تھا۔ عالم میں انتخاب،" جہاں نیشنل کانفرنس کا صدر جیل سے چھوٹتے ہی پہنچا تھا جہاں نیشنل کانفرنس کے صدر کا سب سے بڑا دست نہرو رہتا ہے اور جہاں ۲۹ ستمبر سے لے کر اس وقت تک نہ جانے وہ کتنے پھیرے کر چکا ہے پھر آخر نیشنل کانفرنس کے ان والنٹیروں کے لئے دلی اسم اعظم کا حکم کیوں نہ رکھتی۔

سری نگر بدل رہا ہے لحظہ بہ لحظہ لمحہ بہ لمحہ دن بدن جو پرسوں تھا وہ کل نہ تھا اور جو آج ہے وہ بھی کل نہ تھا۔ پرسوں جہاں دو مختلف سیاسی عقیدوں کی گرم بازاری

تھی۔ ایک مسلم کانفرنس زندہ باد کہہ رہا تھا اور دوسرا کہہ رہا تھا نیشنل کانفرنس زندہ باد۔ پھر ایک سیاسی ہوا چلی۔ چنانچہ کل صرف ایک ہی نعرہ گونجتا رہا نیشنل کانفرنس زندہ باد۔ پر آج پھر دو مختلف گروہ ہیں۔ جن کے دو مختلف نعرے ہیں۔ سری نگر کے بازاروں میں ہندوستانی فوجیں چکر کاٹ رہی ہیں۔ اور یہاں آج ایک نیا نعرہ بھی گونجنے لگا ہے —— جو بولے سو نہال۔ ست سری اکال —— ایڈوڈروم سے سکھ سپاہیوں کی بھری ہوئی لاریاں آ رہی ہیں۔ سپاہی لاریوں کی چھتوں تک پر بیٹھے ہیں۔ بندوقیں تانے اچھت پر لیٹے۔ چھت پر ہی مورچہ بنائے۔ اور نعرہ گونج رہا ہے .... "جو بولے سو نہال۔ ست سری اکال"۔

امیراکدل میں نیشنل کانفرنس کے ہوم گارڈز کا ایک جلوس اپنے آج کل کے مخصوص نعرے بلند کرتا ہوا گذرتا ہے —— نیشنل کانفرنس زندہ باد.... شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد —— ست سری اکال والا نیا نعرہ ان کے کانوں میں بھی پڑتا ہے اور ان میں سے ایک شاید یہ خیال کر کے کہ شیر کشمیر کا ارشاد غالباً اب بدل گیا ہے چیخ کر اپنا اصلی نعرہ ارشاد کرتا ہے —— نعرہ تکبیر اللہ اکبر —— اور لاریوں کی چھت ہی کو مورچہ بنائے ہوئے سکھ سورماؤں کی بندوقوں میں کھٹا کھٹ ہوتی ہے اور ان کا منہ اس گستاخ ہوم گارڈ کی طرف ہو جاتا ہے —— پر عین وقت پر ہوم گارڈ کے کمانڈر کی ذمہ داری کا احساس خطرے کو سنبھال لیتا ہے۔ چٹاخ سے ایک چانٹے کی آواز آتی ہے۔ کمانڈر غصے سے آگ بگولا ہو رہا ہے "کم بختوں پر مذہبی دیوانگی اتنی جلدی طاری ہو جاتی ہے۔ کم بخت اتنی جلدی فرقہ پرست بن جاتے ہیں۔ کم بخت"..... اور ہندوستانی سورماؤں

کو اطمینان ہو جاتا ہے اور ان کی بندوقوں کا منہ اگرچہ اب بھی اسی ہوم گارڈ کی طرف رہتا ہے تاہم اب وہ اپنے ست سری اکال والے نعروں کو بلند کرنے میں زیادہ مشغول نظر آتے ہیں۔ شکر ہے آئی بلا ٹل گئی۔ پر وہ ہوم گارڈ اب بھی نادانی کرنے پر تلا ہوا ہے اب وہ نہایت بھولپن سے اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہتا ہے۔ پر جناب یہ سکھ بھی تو مذہبی نعرے بلند کر رہے ہیں اور اس کا یہ بھولپن اس کو اور بھی قصوروار بنا دیتا ہے "حرامزادہ۔ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ یہ نعرہ ان سپاہیوں کا جنگی نعرہ ہے۔ اور یہ محاذ جنگ پر جا رہے ہیں"۔

"الو کا....." چٹاخ سے ایک اور چانٹے کی آواز آتی ہے اور پھر اس ہوم گارڈ کو کمانڈر ایک گھاس کی بنی ہوئی رسی سے باندھ کر دو اور ہوم گارڈ کی حراست میں دے دیتا ہے جو اسے دھکے دیتے ہوئے امیراکدل کی اس چلتی پھرتی عدالت سے دور کسی قید خانے میں لے جاتے ہیں جہاں کی کال کوٹھڑیوں میں اس جیسے کئی اور ایسی ہی عدالتوں کے طفیل مدتوں سے پڑے سڑ رہے ہیں اب اس کارروائی کے بعد امیراکدل میں نعرے پھر نمایاں ہو جاتے ہیں —— شیر کشمیر کا کیا ارشاد ہندو مسلم سکھ اتحاد..... اور ..... جو بولے سو نہال، ست سری اکال...... ایک شیر کشمیر کا ارشاد ہے اور دوسرا ہندوستانی فوجوں کا جنگی نعرہ ہے اور وہ جزو مشترک جو ان دونوں بظاہر متضاد نعروں کو ایک بناتا ہے۔ اور ست سری اکال والے اس نعرے کو بھی شیر کشمیر کا ارشاد ثابت کرتا ہے کوئی نہیں جانتا کوئی یہ پوچھ بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ اس والنٹیئر کا انجام جس نے اس طرز کا ایک اقدام کرنا چاہا تھا سب دیکھ چکے ہیں۔ پھر اب کوئی کیسے پوچھے، کس سے پوچھے؟

آج یہاں یہ بات کوئی نہیں پوچھ سکتا۔

دوسرے دن جب جنگی نعرے بلند کر کر کے جانیوالے ان ہندوستانی سپاہیوں کو محاذ جنگ پر پہنچانے والی لاریاں واپس آئیں تو وہ لاشوں سے بھری ہوئی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کو انسانی خون میں رنگ کے واپس کیا گیا ہے سری نگر کے جن باشندوں نے انہیں بٹ مالو ہیری سنگھ ہائی سٹریٹ اور امیرا کدل سے واپس بادامی باغ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ ان کے دل میں ہزاروں سوال اٹھے اور ان میں سے ہرایک نے بہت کچھ پوچھنا چاہا پر نہ پوچھ سکا۔ البتہ ایک سکھ ڈرائیور نے ان کے تجسس کو کچھ حد تک ضرور دور کر دیا۔ یہ سکھ ڈرائیور بادامی باغ جاتے ہوئے ذرا کی ذرا راستے میں رُک گیا تھا اور بازار میں گھوڑوں کے پانی پینے والی ٹینکی کے قریب کھڑا اپنا لہو بھرا ٹرک دھو رہا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ بڑبڑا بھی رہا تھا ــــ اونہہ .... شیخ عبداللہ .... کہتا ہے پٹھانوں کا مقابلہ سکھ ہی کر سکتے ہیں ...... بہانہ ساز .... مسلوں کا بدلہ لینے کے لئے سکھوں کو اس بہانے یہاں کشمیر میں بلوا کے مروا رہا ہے ...... اونہہ حرامی سُسلا ...... کل شام کو سب زندہ تھے۔ مُولا سیاں بھی، سجان سیاں بھی، اور پرکاشا بھی، اور آج .... آج کوئی بھی نہیں سب مر گئے ..... اونہہ .... شیخ عبداللہ ..... مائسمہ کے رہنے والوں میں سے صرف ایک دو نے یہ سُنا۔ لیکن جلد ہی اس نے ان دو ایک کو بھی اپنے قریب سے بھگا دیا بھاگ جاؤ یہاں کوئی بائیسکوپ ہو رہا ہے جو کھڑے ہو آخر لاری ہی تو دھو رہا ہوں۔ اور اس کے بعد اس نے پانی سے بھرا ہوا پیپا جس سے وہ لاری صاف

کر رہا تھا۔ ان کی طرف انڈیل دیا اور وہ بھاگ گئے اور پھر انہوں نے یہ واقعہ سارے مائسمہ میں ایک ایک کو سنایا حتیٰ کہ مائسمہ کے بعد یہ باتیں زینا کدل پہنچیں فتح کدل پہنچیں۔ اور آہستہ آہستہ سات پلوں والے اس سارے شہر میں پھیل گئیں سینہ بہ سینہ کیونکہ اور کوئی صورت نہ تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی سری نگر بھی بدلتا رہا۔ لمحہ بہ لمحہ۔ لحظہ بہ لحظہ۔ دن بہ دن۔

ہوم گارڈز اب بازاروں میں نہیں گھومتے۔ ایک میان میں جس طرح دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔ اسی طرح ایک میدان جنگ میں دو مختلف نعروں کی بھی ہمیشہ ٹکر ہی ہو گی۔ اور چونکہ شیر کشمیر کا کیا ارشاد۔ ہندو مسلم سکھ اتحاد۔ والا ہوم گارڈز کا نعرہ اور ہندوستانی فوجیوں کا ست سری اکال والا نعرہ سوائے شیر کشمیر کے ہر ایک کو دو مختلف عقیدوں اور دو مختلف نکتہ ہائے نظر کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں اس لئے شیر کشمیر نے اس خیال کے پیش نظر کہ شائد عوام کی نظر اتنی گہری نہیں جتنی ان کی اپنی ہے اور شاید عوام ان باریکیوں تک کبھی نہ پہنچ سکیں جن تک ان کا ذہن پہنچ چکا ہے۔ مصلحت اسی میں سمجھتے ہیں اور اب سری نگر کے بازار ان فوجیوں کی گھوما پھیری کے لئے وقف کر دیے جائیں۔ اور ہوم گارڈز کو ان کی نظر سے ذرا اور دور دور ہی رکھا جائے چنانچہ اب یہ گارڈز لفٹ رائٹ کرنا توپرتاپ پارک میں سیکھتے ہیں۔ اور اس کے بعد نعرے لگانے کے لئے اندرون شہر کے گلی کوچوں کا رخ کرتے ہیں۔ البتہ ان ہوم گارڈز کا صدر دفتر اب بھی امیرا کدل میں ہے۔ امیرا کدل کے کارونیشن ہوٹل میں اس ہوٹل کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنا اس لئے بھی ضروری ہے۔ کہ اس کے مالک نے پندرہ

اگست کو اس پر پاکستانی جھنڈا لہرایا تھا چنانچہ اب اس کو اس کی نااندیشانہ حرکت کی سزا دینے کی خاطر موجودہ ہندوستان کے پرستار ارباب اختیار پر لازم آتا تھا کہ وہ ہوٹل چھین لیں اور اسے اپنے کام میں لائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس کے مختلف کمروں میں نیشنل کانفرنس کے ایمرجنسی کے دفاتر ہیں۔ ہوٹل کا فرنیچر بھی ہوٹل کو دفتر کا روپ دینے میں خاصا ممد ثابت ہوا ہے۔ ہوٹل کے مالک نے یوم آزادی کے دن اگرچہ پاکستانی جھنڈا لہرا کر شاید نااندیشی کا ثبوت دیا تھا۔ یہ فرنیچر کے معاملے میں اس کی نظر بڑی دوربین اور بڑی گہری تھی اس فرنیچر کو دیکھ کر کوئی شخص بھی تو تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا خوش ذوق آدمی۔ دیکھئے نا ایسی ایسی نفیس کرسیاں خرید رکھی تھیں کہ اب دفتروں کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

پریم ناتھ پردیسی کہتا ہے اس نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ ہر انقلاب میں یونہی ہوتا ہے اور جب روس میں انقلاب آیا تھا تو وہاں بھی یہی ہوا تھا اور وہاں بھی حکومت کو شروع شروع میں اپنے صدر دفاتر ایک ہوٹل میں ہی رکھنے پڑے تھے۔

اور پران خوش ہو کر کہتا ہے۔ کتنے خوش نصیب ہیں ہم جو انقلاب کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ رہے ہیں ورنہ اگر ہم انقلاب کی باتیں کتابوں میں ہی پڑھتے رہتے اور یونہی چپکے سے ایک دن مر جاتے۔ تو یہ بھی کوئی زندگی ہوتی؟

چنانچہ اپنی زندگی کا اور اپنی خوش نصیبی کا پورا پورا فائدہ اٹھانے کیلئے ہم کارونیشن ہوٹل کی بالکونی میں کھڑے ہو کر انقلاب کو اپنی آنکھوں سے اور زیادہ دیکھنے میں منہمک ہو جاتے ہیں اس وقت انقلاب کا جو منظر ہمارے سامنے ہے اس میں سب سے نمایاں ہیں ہندوستانی سپاہی اور کشمیری سیب۔ ان سیبوں میں کشمیر کا وہ حسن ہے جو یہاں کی زمین سے پھوٹ کر سیب کا روپ دھار کر راولپنڈی کی راہ پنجاب میں پہنچا کرتا تھا

اور وہاں کے حسینوں کے عارض پر چھلکتا تھا لیکن اب چونکہ راولپنڈی کی راہ بند ہو چکی ہے اور پٹھان کوٹ کے راستے کے طویل فاصلوں میں اتنی سکت نہیں جو اسے اسی پہلے کی سی شان اور آن بان کے ساتھ پنجاب پہنچا سکیں۔ اس لئے یہیں پڑا ہے۔ کوڑیوں کے مول بک رہا ہے اور اتنا سستا ہے کہ سری نگر کی ساری تاریخ میں آج تک اتنا سستا کبھی نہ بکا تھا صاحب یہ گول والا فرنچ ایپل ہے سب انگریز لوگ اس کی ترشی پر مرتا تھا۔ اور اسی کو کھاتا تھا......اچھا صاحب یہ امری سیب ہے خاص سوپور والا......صرف پانچ آنہ سیر......اچھا صاحب، چار آنہ......اچھا اچھا صاحب لیو۔ تین آنہ ہی دیو——" لیکن صاحب ہیں کہ تین آنہ سیر پر بھی رضامند نہیں ہو رہے۔ کون جانے کل کیا ہونے والا ہے۔ اس لئے نقدی کا اپنا پاس رکھنا زیادہ ضروری ہے۔ وقت پڑنے پر تین آنے بھی بڑی چیز بن جاتے ہیں۔ اور اس لئے یہ فرنچ ایپل اور امری سیب سری نگر کی سڑکوں پر فٹ پاتھ پر ضائع جا رہے ہیں۔ اور کوئی ان کی طرف توجہ نہیں دیتا سوائے محاذ جنگ پر جانے والے ان سپاہیوں کے جن کی لاریاں اس وقت امیرا کدل سے گزر رہی ہیں۔ ان لاریوں میں سے ہر دو تین لاریوں کے گزرنے کے بعد دفعتاً ایک لاری فٹ پاتھ کے کنارے آ کھڑی ہوتی ہے اس کے اگلے پہیے سیبوں کے کسی ٹوکرے کو بالکل چھوتے ہوئے رکتے ہیں اور سیب بیچنے والا "لیو صاحب" کہنے کے بعد ابھی سوچ ہی رہا ہوتا ہے کہ وہ ان نئے گاہکوں کو پہلے سانس میں ہی تین آنے سیر والا بھاؤ بتا دے۔ یا پانچ آنے سے زینہ بہ زینہ نیچے اترے۔ کہ سیبوں کا سالم ٹوکرہ فوجی ڈرائیور کے ہاتھوں کے ایک ہی جھٹکے سے لاری کی چھت پر جا پڑتا ہے اور پھر ست سری اکال، جو بولے سو نہال" کی ایک گونج کے ساتھ لاری آگے روانہ

ہو جاتی ہے اور سیب فروش بیچارہ ابھی اپنے ہوش و حواس پورے طور پہ مجتمع کر ہی رہا ہوتا ہے اور دور سے اُسی لاری کی چھت پر سے ایک سیب اس کی ٹوپی کو اُڑا کر اس کی گنجی کھوپڑی پر آ لگتا ہے۔ فوجیوں کا نشانہ بھلا کیسے چوک سکتا تھا وہ اُف کرکے سر کو پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور اس کے پاس بیٹھے ہوئے شیر کشمیر کی ہاف پوسٹ کارڈ سائز کی تصویر بیچنے والے لونڈے زور زور سے ہنسنے لگتے ہیں اور پھر فوجیوں کے ہاتھوں اپنے سودے کے محفوظ ہونے کے پورے یقین کے ساتھ پہلے سے بھی اونچی آواز کے ساتھ چلانے لگتے ہیں —— لے جاؤ شیر کشمیر کا نشانہ۔ قیمت دو ہی آنہ۔ شیر کشمیر کا نشانہ لے جاؤ —— وہ جانتے ہیں کہ شیر کشمیر کی اس نشانی سے ان فوجیوں کو کوئی دلچسپی نہیں۔ پھر وہ کسی اور دھر دھر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا یہ موقع کیوں گنوائیں؟ اور اس کے علاوہ یوں بھی کم از کم اس حادثہ کے بعد شیر کشمیر کی تصویر بیچنے والے بیوپار کی سیبوں کے بیوپار پہ فوقیت ان پر پورے طور پہ واضح ہو گئی ہے اس لئے —— قیمت دو ہی آنہ لے جاؤ شیر کشمیر کا نشانہ ——" اب ان کی آوازیں بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی ہیں اور ان کے قریب سیبوں کے ٹوکروں کے دوسرے مالک یہ نہ سمجھتے ہوئے کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے مسکرانے لگتے ہیں۔ لیکن یہ مسکراہٹ اتنی جعلی ہوتی ہے کہ اس سے صاف ٹپکتا ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم بھی اپنا انجام جانتے تو ہیں پر آخر کریں کیا؟ اور ہمیں معلوم تو ہو ہے کہ اب نہ ہوا تو ذرا دیر بعد پانچ منٹ بعد یا ایک گھنٹے بعد وہ لاری بھی آنے والی ہے جس کا فوجی ڈرائیور ہمارے ہی سیبوں سے ہماری کھوپڑی کا بھی نشانہ بنائے گا۔ پر ہم غریب نہتے سیب فروش آخر ان بندوق والوں

سے کچھ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ اور پھر شیر کشمیر کا نشانہ "بھی تو ابھی اتنا مقبول نہیں ہوا کہ ہم اس کی تجارت کے بل بوتے پر ہی اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرنے کی کوئی سبیل کر سکیں اس لئے —— لے لیو۔ امری سیب تین آنہ سیر ہی لے لیو صاب" صورت حال نے نرخ اور بھی گھٹا دیا ہے۔

ناتھ جی انقلاب کی چکی میں سیبوں کے پسنے کے اس انداز کے لئے وجہ جواز پیدا کرتے ہوئے اظہار خیال کرتا ہے کہ اب ہم گھر کی چیزوں کو گھر میں ہی رکھا کریں گے جونہی لڑائی ختم ہو گی۔ اور امن کا دور دورہ ہو گا ہم اپنے ہاں چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں کھول لیں گے جن میں ان سیبوں کے مربے بنا کریں گے جام اور چٹنیاں اور مار ملیڈ پھر ہمیں سیب باہر کی منڈیوں میں بھیجنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی"

اور پھر وہ کشمیری سیب جن کی اس وقت ساری دنیا میں دھوم ہے جب محض جام اور مار ملیڈ کے روپ میں ہی نظر آیا کریں گے اور اپنی اصلیت کھو دیں گے تو پھر یہ ایک کہانی بن کر رہ جائیں گے اور آنے والے بے انتہا ترقی اور تہذیب کے زمانے میں یہ کہانی لوگ ایک دوسرے کو سنایا کریں گے کہ کبھی پرانے وقتوں میں کشمیر کی جنت نظیر وادی میں جہاں کیسر کے پھول کھلتے ہیں اور جہاں جھیل ڈل ہے ایک پھل اُگا کرتا تھا جس کا نام تھا سیب اور "میرا دل چاہتا ہے کہ میں کہوں لیکن یہ سوچ کر کہ ہر بات کیلئے ایک وقت ہوتا ہے اور اس بات کیلئے یہ وقت نہیں۔ خاموش رہتا ہوں۔

پھر میرا تخیل مجھے سرزمین سوپور میں لے جاتا ہے جہاں وہ پھل جس کا نام سیب ہے۔ اور جہاں سے دو تین میل پرے وہ مقام ہے جس کا نام دو آب گاہ ہے۔ اور جہاں وہ دریا ہیں۔ جن کا کشمیر کے دوسرے دریاؤں کی طرح اس ملک کی

طرف رُخ ہے جس کو اب لوگ پاکستان کہنے لگے ہیں اور جو بے حد بُرا ہے کیونکہ پنڈت نہرو اس کے وزیر اعظم نہیں کچھ دنوں پہلے تک کشمیر کے سارے جنگلوں کی لکڑی دو آب گاہ کے انہیں دریاؤں کی راہ لکڑی کی منڈیوں میں پہنچائی جاتی تھی لیکن چونکہ ان دریاؤں نے کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ سمبندھ ہو جانے کے باوجود ابھی تک اپنا رخ نہیں بدلا۔ اور یہ نئے سیاسی اصولوں کو بڑی ڈھیٹ پنے کے ساتھ نظر انداز کئے بدستور اپنی پرانی ڈگر پر چلتے ہوئے پاکستان ہی کی طرف بہتے جا رہے ہیں اس لئے لکڑی کے ٹھیکیداروں کو محسوس ہو رہا ہے کہ اب ان کے بُرے بہت ہی بُرے دن آ گئے ہیں اور چونکہ نیشنل کانفرنس اور ہندوستان کی حکومت دونوں کا یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کے اسی طرح کے ہر احساس پر قابو پانے کی پوری پوری کوشش کریں۔ کیونکہ اس صورت حال میں لوگوں کے ففتھ کالمسٹ بن جانے کا خدشہ ہے۔ اس لئے اب دو آب گاہ میں لکڑی چیرنے کی ایک مشین لگا دی گئی ہے جس میں بڑے بڑے شہتیروں کے ٹکڑے کئے جاتے ہیں۔ اور اس کے اور بالکل اسی طرح جیسے اس سے قبل یہ دریا ان شہتیروں کو اپنے سینے پر لاد کر ٹھیکیداروں سے کوئی معاوضہ لئے بغیر لکڑیوں کی منڈیوں تک پہنچا دیتے تھے اب وہ فوجی ٹرک انہیں ہندوستان کے کسی شہر میں جا پھینکتے ہیں جو اوڑی کے محاذ پر فوجیوں کو چھوڑنے کے بعد اب واپس خالی جا رہے ہوتے ہیں لہذا دریاؤں کی ایسی تیسی۔ لیکن ٹھیکیدار لوگ اب بھی سوچتے ہیں کہ آخر کب تک یہ معاملہ یوں چل سکے گا۔ جنگ آخر ہمیشہ رہے گی نہیں جو خالی ٹرک ہمیشہ دستیاب ہوتے رہیں گے اور اگر مشین اور ٹرکوں کی امداد کو اس سلسلے میں ہمیشہ شامل

حال ہی رہنا ہے تو اس ہنگامی دور کے بعد وہ وقت بھی آخر آ جائیگا جب اس کاروبار کو اس طور چلانے پر اتنی لاگت آیا کریگی جس سے ٹھیکیداروں کی کمر ٹوٹ جائیگی اور حکومت کو بھی اپنے بجٹ سے جنگلات کی اس آمدنی والی مد کو خیرباد کہنا پڑیگا اور میں بھی سوچتا ہوں کہ پاکستان کو ہمیں اگر بدستور بُرا ہی سمجھتے رہنا پڑا تو لڑائی کے بعد گو سیبوں کا بدل تو ہمیں جام اور مارملیڈ کی شکل میں مل جائے گا پر جنگلوں کی اقتصادی اہمیت ضرور ہی زمانۂ ماضی کی ایک بات بن کر رہ جائے گی محض ایک قصۂ پارینہ کہ بہت بہت پُرانے زمانے میں ایک وقت ایسا بھی تھا جب کشمیر جنت نظیر کے جنگل سونا اگلا کرتے تھے پر جب یہاں کے باشندوں نے اپنوں اور بیگانوں میں تمیز کرنا چھوڑ دی اور اپنا سود و زیاں نہ پہچان سکے تو قدرت ان کے خلاف ہو گئی دریاؤں نے ان سے ناطہ توڑ لیا۔ اور جنگلوں نے بھی سونا اگلنے سے انکار کر دیا اور پھر یہ وادی آہستہ آہستہ ویران ہونے لگی اور۔۔۔۔۔ ایک دفعہ پھر میرا دل چاہتا ہے۔ کہ میں ناتھو جی اور پران سے یہ کہوں۔ لیکن پھر پہلے کی طرح یہ سوچ کر کہ ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے اور اس بات کا یہ وقت نہیں۔ خاموش رہتا ہوں۔ اور اپنے خیالوں میں ہی مگن رہتا ہوں۔

کارونیشن ہوٹل کی بالکونی میں کھڑے کھڑے میں اب ناتھو جی اور پران سے دور چلا جاتا ہوں اور اپنے ایک دوست آنند باہری کے ساتھ نیڈوز ہوٹل کی گیلری میں جا بیٹھتا ہوں۔ یہاں رات کا وقت ہے ایک خاص ترتیب سے رکھے ہوئے میزوں پر بڑی نفاست سے پلیٹوں میں رکھی ہوئی موم بتیاں کانپ رہی ہیں۔ اور ان کے درمیان بیٹھے ہم دونوں چائے پی رہے ہیں۔ بالکل اکیلے کیونکہ نیڈوز میں

آج کل لوگ ذرا کم آتے ہیں۔ اس وقت یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم دور کسی فوجوں کے جزیرے میں ہیں۔ اور جگنوؤں کی ایک قوم بڑے پراسرار انداز میں ہمارے گرد بیٹھی جھپک جھپک کے ہمیں دیکھ رہی ہے۔ اور ان کی مدھم روشنی میں جب ہم اپنی چائے کی پیالیوں میں سُرخ سُرخ شکر گھولتے ہیں تو ہمیں اس صاف شفاف چینی کی یاد ستانے لگتی ہے جو کسی دور دیس کا ایک ایسا تحفہ تھی جسے ہم اب کھو چکے ہیں۔ اور جس کی اب یاد ہی باقی رہ گئی ہے۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو یہ کانپتی ہوئی موم بتیاں یہ آنکھیں جھپکتے ہوئے جگنو۔ اور ان کے بیچوں بیچ بیٹھ کر چینی کی یاد میں آہیں بھرنا ہمیں بڑا رومنٹک نظر آتا۔ پر اس وقت اس مجبوری کو خود فریبی کا کوئی انداز نہیں چھپا سکتا۔ اور ہمارے پاس کسی پھول کی کوئی ایسی پتی نہیں۔ جو اس کانٹے کو ڈھک سکے۔ اے کاش! اے کاش!

آنند باہری مجھ سے کہہ رہا ہے "ایک پائلٹ سے میری دوستی ہوگئی ہے۔ اور اس کے ساتھ میں کل ہوائی جہاز میں دہلی جا رہا ہوں۔ دو ایک دن تک واپس آجاؤں گا۔ اور دلی سے تمہاری ضرورت کی چیزیں بھی لیتا آؤنگا۔

اور میں خوش ہو کر کہتا ہوں "خدارا باہری ضرور لانا۔ بلکہ میں تمہیں فہرست لکھوائے دیتا ہوں۔

لیکن وہ لکھنے کے لئے اور فہرست بنانے کے لئے تیار نہیں" واہ کیا میں اتنا بھی نہیں جانتا کہ سری نگر میں رہ کر ان دنوں کس کس چیز کے لئے پریشانی ہوتی ہے۔ سنو! میں تمہارے لئے سفید چینی بھی لاؤں گا سگرٹ لاؤنگا۔ رومال لاؤنگا۔ اور تھوڑا سا نمک بھی لاؤں گا۔ اور وہاں ایک دیا سلائی بھی لاؤں گا۔ کیونکہ اب یہاں

دیا سلائی کا بھی تو کال ہے نا! پھر وہ ذرا رک کر مسکراتے ہوئے کہتا ہے۔ البتہ بجلی کی روشنی نہ لا سکوں گا۔ اس کے لئے تمہیں موم بتیوں سے ہی سمبندھ کرنا پڑے گا۔ اور چونکہ موم بتیاں بھی یہاں نایاب ہو رہی ہیں۔ اس لئے کچھ موم بتیاں بھی تمہارے لئے لیتا آؤں گا۔

آنند باہری سے جدا ہو کے میں پھر سے کارونیشن ہوٹل کی بالکونی میں آکھڑا ہوتا ہوں۔ جہاں ناتھ جی اور پران "آنے والے زمانے میں کشمیر کی فیکٹریوں میں بننے والے جام اور مارملیڈ کے اب بھی چٹخارے لے رہے ہوتے ہیں۔ "ہم سیب کے ہر باغ میں فیکٹریاں لگائیں گے۔" ناتھ جی کہتا ہے۔ "ہاں کم از کم دو دو ہر باغ میں" پران تجویز پیش کرتا ہے۔

اور یہ سوچ کر کہ میری خاموشی اب خاصی طویل ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس موقع پر مجھے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کہنا چاہئیے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا آنے والے سنہرے زمانے میں یہاں سفید چینی کی کوئی فیکٹری نہیں ہوگی؟ اور اگر یہاں سگریٹوں رومالوں دیا سلائیوں، اور موم بتیوں کی بھی کچھ فیکٹریاں بنائی جائیں۔ تو کیا ہرج ہے؟

اس پر ناتھ جی کہتا ہے "یہ فیکٹریاں بھی ضرور بنیں گی۔ ہر انقلاب کے آخر میں ہوتا ہے۔ اور پھر ہندوستان کے پروگرام میں یہ بھی شامل ہے"۔ اور پران اچھل پڑتا ہے۔ "اہا ہا! کتنا لطف آیا کرے گا جب آسمان پر بادلوں کی جگہ ہمیں فیکٹریوں کی چمنیوں کے دھوئیں دکھائی دیا کرے گا۔ اور کشمیر ہندوستان کی بدولت ساری دنیا کا سب سے بڑا صنعتی مرکز ہو۔ تو کتنا لطف آیا کرے گا" پران

بے حد خوش ہو رہا ہے "بس لڑائی ذرا ختم ہو کے چند دنوں کی بات ہے۔"

اور دفعتاً میرے ذہن میں ایک خطرناک خیال آتا ہے ۔ میں سوچنے لگتا ہوں کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سب کشمیر کے نصیب کا چکر ہو ۔ اور کہیں کشمیر کی قسمت میں یہی تو نہیں لکھا ۔ کہ اس کے باشندے اس زمانے میں تو خواب دیکھ دیکھ کر جئیں اور پھر سیاست جس نے انہیں اب یہ خواب دئے ہیں ۔ جب اپنے مقصد میں پوری ہو جائے اور ان بے بنیاد خوابوں کے یہ کھلونے چکنا چور ہو جائیں تو بے آسرا ہو کر یہ لوگ اپنے دل بہلا دے کے لئے پرانے سہانے لمحے کی کہانیوں میں پناہ ڈھونڈیں ۔ اور ان کی زندگی کا محور ہمیشہ خواب رہیں ۔ یا کہانیاں اور حقیقی دنیا میں سے ہمیشہ دوری رہے دوری ہی ہوتی جائے ۔ اور اتنی دور ہو جائے کہ اس کی گرد تک نہ پہنچ سکیں یہ

ناتھ جی جیسے میری سوچ جان گیا ہو ۔ اس سے کا اپنی سوچوں کے ساتھ تضاد پہچان گیا ہو ۔ اس تضاد کی ایک وجہ بھی دریافت کر چکا ہو ۔ اب اس وجہ کا مجھ پر انکشاف کرتا ہے ۔ اور کہتا ہے "معاف کیجئے گا ۔ لیکن مجھے یوں معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے آپ نے انقلاب روس کی تاریخ کسی انگریز کی لکھی ہوئی پڑھی ہو ۔ تو ہو ۔ کسی روسی کی لکھی ہوئی ہرگز نہیں پڑھی ۔ ورنہ آپ کو یہ سمجھتے ہوئے ذرا دیر نہ لگتی کہ یہ سب کچھ تو انقلاب کی شروعات ہیں ۔ اور انقلاب کا انجام ہمیشہ خوشگوار ہوتا ہے ۔ ہماری نظر انجام پر ہونی چاہیئے انجام ہی اصلی چیز ہے ۔"

لیکن ہے ناتھ جی سچا ہو ۔ اور انجام ہی اصلی چیز ہوتی ہو ۔ اور یہ ساری انقلاب کی ایسی باتیں ہیں جنہیں میں اس لئے نہ سمجھ سکتا ہوں کہ میں نے انقلاب روس کی تاریخ کسی روسی کی لکھی ہوئی نہیں پڑھی پر میں کیا کروں انقلاب کی شروعات

تو میری حوصلہ افزائی بالکل ہی نہیں کرتیں ۔ تاہم میں اسے دیکھ رہا ہوں سب دیکھے جا رہا ہوں ۔

دور سبزیوں کے ٹوکروں کے پاس مجھے پائلٹ بلبیر سنگھ نظر آتا ہے ۔ جو ہر صبح نئی دہلی سے اپنے جہاز میں کچھ فوجی لاد کے لاتا ہے ۔ اور ہر شام چند ہندو پناہ گزیں سری نگر سے دہلی پہنچاتا ہے ۔ یہ پناہ گزیں فسادوں کے زمانے میں مشرقی پنجاب سے یہاں آئے تھے لیکن اب سری نگر کو چھوڑنے کے لئے بھی بے تاب ہیں حکومت نے بلبیر سنگھ کو اجازت دے رکھی ہے ۔ کہ وہ ان پناہ گزینوں کو تھوڑا تھوڑا کر کے دہلی پہنچا دے ۔ چونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔ اور ہر ایک کو یہ کوشش ہے کہ وہ دوسروں سے پہلے سری نگر چھوڑ سکے اس لئے بلبیر سنگھ بڑا پریشان ہے ۔ بلکہ شروع شروع میں تو وہ اس سے بھی زیادہ پریشان تھا کیوں کہ اس وقت تک اسے مختلف گروہوں میں بانٹ بانٹ کرے جانے کا کوئی طریقہ نہ سوجھا تھا ۔ اب البتہ خدا کی اس نے ایک راہ ڈھونڈھ نکالی ہے ۔ اب ہر وہ شخص جس کی جیبیں بھری ہیں ۔ بلبیر سنگھ کے ساتھ جا سکتا ہے ۔ اور چونکہ ہوائی جہاز میں بھاری بوجھ لے جانے کی ممانعت ہے ۔ اس لئے اپنی بھاری جیبوں کو ہلکا کرنے کے لئے انہیں اپنی جیبوں کا کچھ بوجھ بلبیر سنگھ کے حوالے بھی کر دینا پڑتا ہے بلبیر سنگھ عام طور پر ایک ہزار روپیہ فی سواری وصول کرتا ہے ۔ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ہر روز اسی طرح پچیس تیس ہزار روپیہ کما لیتا ہے ۔ لیکن یہ خیال کرتے وقت وہ یہ امر بھول جاتے ہیں کہ وہ یہ رقم بیٹھے بٹھائے تو آخر کماتا نہیں بلکہ اس کے لئے اسے خاصی محنت کرنا پڑتی ہے ۔ امیر کدل میں پہروں گھومنا پڑتا ہے طرح طرح

غرض سندر پناہگزینوں میں تو وہ مضحکہ بنا پڑا ہے کہ اگر وہ ایک ہزار روپے کی کمی بھی ہے تو اسے تیس ہزار کی کلیم مل سکتا ہے۔ اور پھر ایک اور بات بھی ہے۔ کیا وہ خود مغربی پنجاب میں لاکھوں اور کروڑوں روپے کی جائداد چھوڑ کے نہیں آیا؟ پھر اب اگر وہ اس طرح اپنی جائداد کی پوری کر رہا ہے تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ "آخر یہ انقلاب ہے۔ ایک جگہ گنوایا اور دوسری جگہ کمایا۔ اور پھر وہ غریبوں کا خون تھوڑے ہی چوستا ہے۔ امیروں سے سودا کرتا ہے۔ اور امیروں کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"۔۔۔۔۔ چنانچہ بلبیر سنگھ اس وقت۔ امیر الکدل میں سیبوں کے ایک ٹوکرے کے پاس کھڑا ہے۔ اور کسی پناہگزیں کو سری نگر سے دلّی لے جانے کے فکر میں سرگرداں ہے۔

اس وقت بلبیر سنگھ جہاں کھڑا ہے۔ اس کے بالکل قریب "ماڈرن گیسٹ ہاؤس" کے سائن بورڈ کا ایک سرا نیچے کو لٹک رہا ہے جیسے اب گرا کہ گرا لیکن اس کو گرنے سے بچانے والا کوئی نہیں کیونکہ اس کے مالک نے بھی ۱۵ اگست کو وہی غلطی کی تھی۔ جو کارنیشن ہوٹل کے مالک سے سرزد ہوئی تھی۔ اس نے بھی نادانی کا ثبوت دیا تھا۔ اور اپنے ہوٹل پر پاکستانی جھنڈا لہرایا تھا۔ جس کی سزا وہ اب قیدخانے کی کال کوٹھڑی میں بھگت رہا ہے۔ اور نتیجہ کے طور پر اس کا ہوٹل ویران ہے اور چونکہ ہوٹل کی مکانیت کم تھی اس لئے نیشنل کانفرنس کے کسی ایمرجنسی دفتر کے کام بھی نہیں آسکا۔

ماڈرن گیسٹ ہاؤس" اور کارنیشن ہوٹل کے علاوہ امیر الکدل کا تیسرا بڑا ہوٹل ہے۔ پنجاب مسلم ہوٹل۔ اور یہ وہ خوش نصیب ہوٹل ہے جس کا مالک یہ سیاسی غلطی کرنے سے بال بال بچ گیا تھا۔ اس دن وہ یہی سوچتا رہا۔ کو کون سا جھنڈا لہرائے

کہ آزادی کا یہ دن گذر گیا۔ اور اس کی قوت فیصلہ کی کمزوری اس کے لئے خوبیٔ قسمت بن گئی۔ اور چند گز کپڑے کی بچت کے ساتھ ساتھ اس کی عزت بھی بچ گئی۔ جنا پو سیاست کے نئے ہیر پھیر اسے "راندۂ درگاہ" نہ بنا سکے۔ اور اب یہ زوروں پر چل رہا ہے

پنجاب مسلم ہوٹل کے دروازہ پر اس وقت پیر عبدالاحد کھڑا ہے۔ جو اپنے ایم اے ایل ایل بی بھائی کے۔ اس کا بھائی نیا نیا وکیل بنا ہے۔ اور یہ خود ایک پرانے وکیل کا پرانا منشی ہے۔ اور ساتھ ہی پرانا مسلم کانفرنسی بھی ہے۔ یہ اپنی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ سمجھتا ہے کہ اس کی شکل جناح سے ملتی ہے۔ "کیوں جی! کیا واقعی میری شکل جناح سے ملتی ہے؟" وہ ہر ایک سے عام طور پر پوچھا کرتا ہے۔ وہ پھر جواب اثبات میں پاکر کہتا ہے "پر میرے سیاسی خیالات تو جناح سے نہیں ملتے نا!" اور اس کے بعد اپنے سیاسی خیالات کا اظہار کیا کرتا ہے۔ اس دوران میں جناح کو گالیاں بھی دیتا رہتا ہے۔ "اور کبھی اس جناح کیپ سے بھی کھیلتا رہتا ہے جو یہ ہمیشہ اپنے سر پر پہنتا ہے۔ "کیوں جی۔ اگر میں اپنے سر پر یہ ٹوپی نہ پہنوں۔ تو کیا پھر بھی میں جناح جیسا معلوم ہوتا ہوں۔ ۔۔۔۔۔۔۔" اور جب لوگ کہتے ہیں "ہاں" تو وہ اپنی ٹوپی کو اپنے سر پر رکھتے ہوئے آہستگی سے کہنے لگتا ہے "اس سے کیا فرق پڑتا ہے جی" اور پھر اسے اچھی طرح سر پر جماتے ہوئے ذرا ذوق سے کہتا ہے "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے جی، اس سے میں جناح جیسا متعصب سیاست دان تھوڑے ہی بن جاتا ہوں میرے خیالات تو جو ہیں۔ وہ سب کو معلوم ہی ہیں۔۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ سب کو معلوم ہیں"

پیر عبدالاحد ہوٹل کے دروازے پر ہی رکا ہوا ہے۔ شائد وہ ہوٹل کی دوکان

سے پان خرید رہا ہے۔

اب مجھے دفعتاً اپنے ہم نام اور ہم پیشہ دوست پروفیسر محمود کا خیال آجاتا ہے جس کو پنجاب مسلم ہوٹل کی اس دکان کے پان بے حد پسند ہیں۔ اس گڑ بڑ سے پہلے وہ بلا ناغہ یہاں پان کھانے کے لئے آیا کرتا تھا لیکن آج کل بے چارے نے پان کھانے بند کر دئے ہیں بھئی میں پان کے بغیر ہی بھلا، اب اس ہوٹل پر کون جائے۔ خواہ مخواہ اگر کسی نیشنل کانفرنسی نے دیکھ لیا اور اس کی طبیعت آگئی تو مفت میں دھرے گا۔ اور جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی" آج کل گرفتاریاں بڑی عام ہیں۔ اور ان کا انداز یہ ہے۔ کہ خود کسی ایسے شخص پر نظر پڑی جس کے بارے میں ذرا سا بھی شبہ ہو کہ اس نے کبھی شیخ عبداللہ کی بجائے جناح کو قائد اعظم کہا تھا۔ یا اپنی گفتگو کے دوران میں وہ چوہدری غلام عباس اور مسلم کانفرنس اور پاکستان کا نام لیتے وقت گالی نہیں دیا کرتا۔ تو اسے ان دنوں ہر وہ شخص جس نے شیخ عبداللہ کو حضرت شیر کشمیر قائد اعظم شیخ محمد عبداللہ کہنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔ بغیر کسی باز پرس کے اور بغیر کسی قانونی وارنٹ کے قید خانے پہنچا سکتا ہے۔ اس لئے بے چارے محمود نے آج کل پان کھانے ذرا بند ہی کر رکھے ہیں۔

چونکہ اس وقت بالکونی میں کھڑے کھڑے۔ پیر عبدالاحد کو پان کی دوکان کے پاس دیکھتے ہوئے مجھے محمود یاد آگیا ہے۔ اس لئے میں دل ہی دل میں فیصلہ کرتا ہوں کہ آج واپسی پر محمود کے لئے اس کا دل پسند پان ضرور لیتا جاؤں گا۔ پھر اس خیال سے کہ شاید تھوڑی دیر بعد میں یہ بات بھول نہ جاؤں۔ میں ناتھ جی سے رخصت چاہتا ہوں۔ پر وہ روک لیتا ہے "نا بھئی یہ نہ ہوگا۔ اتنے دنوں بعد تو آپ ملے آئے

اور اب آپ کو ہم اتنی جلدی جانے دیں۔ آج لنچ تو ہمارے ساتھ آپ ضرور ہی کھائیں گے۔" لیکن جب میری معذرت انتہا پر پہنچ جاتی ہے۔ اور ناتھ جی کو یقین ہو جاتا ہے کہ میں چونکہ اپنے صبح کے ناشتے کو ہی لنچ بنا چکا ہوں۔ اور اب مزید گنجائش نہیں رہی تو وہ لنچ کھانے کی دعوت واپس لے لیتا ہے۔ لیکن جانے کی اجازت اب بھی نہیں دیتا "اچھا تو۔ اگر آپ نہیں کھاتے تو نہ سہی، کم از کم ہمیں تو کھاتے ہوئے ضرور دیکھیں، بڑے مزے کا منظر ہوتا ہے"

یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب میں محمود کے لئے پان لے جانا یقیناً بھول جاؤنگا ناتھ جی کے اس اصرار پر مجھے ہتھیار ڈال دینے پڑتے ہیں۔ اور یہ مزے کا منظر دیکھنا پڑتا ہے۔

اس منظر میں مجھے چاولوں کی ایک بڑی سی دیگ نظر آتی ہے۔ جس کے پاس ایک اور اتنی ہی بڑی گوشت اور سبزی کی دیگ بھی ہے۔ دونوں دیگوں کو ہوم کلچر کا یہ آفیسر، اور انکچوئل طبقہ گھیرے ہوتا ہے۔ اس طبقہ کے ہر فرد کے ہاتھ میں ایک ایک تام چینی کی پلیٹ ہوتی ہے جس میں وہ پہلے چاول ڈلواتے ہیں۔ اور پھر گوشت اور سبزی، اور اس کے بعد بڑے زور و شور کے ہاتھ چلاتے ہوئے۔ یہ لوگ لنچ اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ ناتھ جی خوشی سے پاگل ہو رہا ہے۔ کہتا ہے "یہ ہے انقلابی لنچ یہ ہے۔ خالص روس کی پیداوار جب وہاں انقلاب آیا تھا۔ تو وہاں بھی کھانے کا عین یہی انداز تھا"

اور پھر دفعتاً اسے میرا خیال آجاتا ہے۔ اور اس کے لہجے پر جیسے ایکا ایکی غم کے بادل چھا جاتے ہیں "دیکھئے نا! بھلا انقلاب کوئی روز روز آتا ہے۔ اور

کرتا تھا۔ اب کاک کو گالیاں دیتا ہے۔ اور عبداللہ کو شیرِ کشمیر کہتا ہے۔ پروفیسر اسلم جو ڈوگروں کے زمانے کے سنہرا ہونے کے ثبوت اور عہد نامۂ امرتسر کے جواز میں ایک تھیسس لکھ رہا تھا۔ اور اپنے اس تھیسس کا بڑے زور و شور سے پراپیگنڈہ کیا کرتا تھا۔ اب خاموش رہتا ہے۔ غالباً سوچتا رہتا ہے۔ کہ اب وہ کس موضوع پہ تھیسس لکھے اور پروفیسر وانٹ جو ہمیشہ فخر سے کہا کرتا ہے کہ اسے اردو اور عربی فارسی نہیں آتی اور جس کے طالب علموں کا خیال ہے۔ کہ اسے وہ انگریزی بھی نہیں آتی۔ جو وہ انہیں پڑھاتا ہے۔ اب کچھ اس قسم کی باتیں کرتا ہے ...... "جی آپ نے سنا۔ میں نے خود تو ریڈیو پاکستان کبھی نہیں سنا (یہ جملہ وہ احتیاطاً کہتا ہے۔ آج کل نئی حکومت نے ریڈیو پاکستان سننے کی ممانعت جو کر رکھی ہے)۔ میرے پاس تو ریڈیو سیٹ ہے ہی نہیں۔ جو سُن سکتا۔ پر کوئی کہہ رہا تھا کہ پاکستان ریڈیو قبائلیوں کی اس لڑائی کو جہاد کہتا ہے۔ حالانکہ میں اسے فساد کہتا ہوں ....." اتنا کہہ کر وانٹ ہنسا کرتا ہے ... ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔" اور پھر اپنی اس تمنا کا اظہار کرتا ہے۔ کہ کشمیر میں جب ریڈیو اسٹیشن قائم ہوگا۔ تو وہ اس موضوع پر ضرور ایک تقریر کرے گا .... "میں اپنی تقریر کا عنوان یہی رکھوں گا۔ جہاد کہ فساد ...... ہاں .. جہاں کے فساد" اب اس کی آواز ذرا مدھم ہو جاتی ہے "پر کیا کروں نہ مجھے اردو آتی ہے۔ اور نہ عربی اور اس تقریر میں آیتیں تو ضرور ہونی چاہئیں۔ خیر میں یہ آیتیں ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لوں گا۔۔ کیوں ڈاکٹر صاحب بتائیے گا نا! ... پر آپ کہاں بتائیں گے آپ کو شاید میرے اس خیال ہی سے اتفاق نہ ہو ..." اب پھر اس کے ہونٹوں سے قہقہوں کا ایک دریا گرجتا

پھر یہ تو اتفاق کی بات ہے۔ کہ قسمت نے ہماری یاوری کی اور ہم یہ دن دیکھ سکے" وہ ذرا سا رک کر کہتا ہے "معاف کیجئے گا۔ پر مجھے آپ پر بڑا ترس آتا ہے۔ یہ دن ہولیول انقلاب آیا ہوا ہو اور آپ اس سے الگ تھلگ رہیں۔ بھلا ان دنوں آپ کے کالج کے اسٹاف روم میں کیا رکھا ہے۔ جو آپ اسے اتنی اہمیت دئیے جا رہے ہیں، وجے"

اگرچہ میں ناتھ جی کو یہ نہیں بتاتا کہ میرے کالج کے اسٹاف روم میں کیا رکھا ہے پر میرے خیالات ایک ہی جست میں مجھے اپنے اسٹاف روم میں پہنچا دیتے ہیں جہاں کا کلاک اس وقت دس بجا رہا ہے۔ پروفیسر لوگ آہستہ آہستہ جمع ہو رہے ہیں۔ اور انقلاب کی باتیں کر رہے ہیں۔ اور اُس انقلاب کی باتیں جان بوجھ کر نہیں کر رہے۔ جو ان دنوں کشمیر میں آیا ہوا ہے۔ ہماری گفتگو بڑی سہمی ہوئی ہے۔ اور ہم سب ایک دوسرے سے ڈرے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ میری نگاہ میں دن ہی کچھ ایسے آ گئے ہیں۔ کہ کوئی اپنی دل کی بات کسی سے نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے وہ لوگ جو اپنے خیالات سے خلوص برتنے کے قائل ہیں خاموش ہیں یا زیادہ سے زیادہ اپنے وجود کی مثال موجودگی کا احساس دلانے کے لئے تھوڑے وقفے کے بعد مسکرا دیتے ہیں۔ ورنہ خاموش ہیں۔ اور وہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر بھی ایک عجیب عالم ہے۔ اور ان کی باتیں اتنی مصنوعی معلوم ہوتی ہیں کہ تصنع بات بات پر اپنا آپ دکھاتا ہے۔ پرنسپل بھان جو میں کاک وزارت کے زمانے میں کاک کے گن گایا کرتا تھا۔ اور عبداللہ کو گالیاں دیا

برستا ہوا نکلتا ہے......"ہا.....ہا.....ہا....." نہ صرف ڈاکٹر صاحب بلکہ ہم سارے کے سارے وانٹ کے اس غیر محتاط جملے پر چونک اٹھتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی دُھن میں بدستور کہتا رہتا ہے...... یہ تقریر میں نے ابھی سے لکھنی شروع کر دی ہے۔ اور اس میں میں نے صاف صاف لکھ دیا ہے۔ کہ اس لڑائی میں اگر کوئی صحیح جہاد کر رہا ہے۔ تو وہ ہندوستانی سپاہی ہیں۔ اور بس...... ہا...... ہا...... ہا......" کوئی سُنے یا نہ سُنے۔ وانٹ کی روانی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

چونکہ لڑائی اب بارہ مولا سے شالٹینگ تک آپہنچی ہے اور دوسری جانب سے بڈگام کی بجائے اب یہ ایروڈروم کے بالکل قریب ہو رہی ہے۔ اس لئے ہمارا کالج بھی جو کہ ایروڈروم کی سمت ہے۔ بڑی خطرے والی جگہ سمجھا جانے لگا ہے اس وقت آخری دفاعی مورچہ فلڈ چینل کے اس کنارے پر ہے۔ جہاں ہمارے کالج کے کرکٹ گراؤنڈ کی آخری حد ہے۔ اس لئے آج کل طالب علم کالج نہیں آتے۔ صرف پروفیسر لوگ جاتے ہیں۔ شاف روم میں بیٹھنے کی بجائے باہر لان میں بیٹھ کر دھوپ سینکتے ہیں۔ ایروڈروم کے قریب قبائلیوں کے مورچوں پر بمباری کرنے والے جہازوں کو قلا بازیاں کھاتے دیکھتے ہیں۔ اور دل ہی دل میں یہ یقین کئے ہوئے بھی کہ سری نگر کے دفاعی مورچے بس اب دو ایک دن میں ہی ختم ہونے والے ہیں۔ ہندوستانی فوجوں کی لمحہ بہ لمحہ پسپائی کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔ البتہ رگھو ناتھ چپڑاسی سے جبوں

اخبار "چاند" سے کہ اس کے ایڈیٹوریل میں اپنے طور پہ یہ ضرور تلاش کرتے رہتے ہیں کہ جرنلزم کی صاف بیانی سے کام لے کر آنے والے خدشات کا تذکرہ کس انداز میں کیا گیا ہے۔ لیکن اخبار چاند بھی ان کی طرح شاید اپنی دل کی بات چھپانے میں ہی مصلحت سمجھتا ہے شاید جرنلزم میں بھی بہرحال صاف بیانی سے زیادہ مصلحت ہی اہم ہوتی ہے۔

وہ اخبار پڑھتے رہتے ہیں کم از کم یہ تسکین تو ہوتی ہے کہ وہ ایک اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جس میں خبریں ہوتی ہیں۔

ان دنوں اگر رگھناتھ چپڑاسی کے طفیل اخبار چاند کے ملنے کا امکان بھی ختم ہو جائے۔ تو اخبار کے متوالوں کو بڑی دقت ہو۔ آج کل اخبارات پر یہاں بڑی پابندیاں ہیں۔ باہر سے کوئی اخبار نہیں آتا۔ صرف چاند کے چند گنے چنے پرچے ہوائی جہاز کے ذریعے پہنچتے ہیں۔ اور ان کی مانگ بھی اتنی شدید ہوتی ہے۔ کہ اُس کا پرچہ خریدتے وقت ایک "دونی" ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی جسمانی طاقت کا بھی خاصا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ رگھناتھ کالج کا چپراسی ہونے کی وجہ سے چونکہ اخباروں کی اہمیت کو خوب سمجھتا ہے۔ اس لئے ان پڑھ ہونے کے باوجود ہر روز کسی نہ کسی طرح ایک اخبار ضرور خرید لاتا ہے۔ اور پھر ہم سب کو اُس کی وجہ سے اپنا ممنونِ احسان کرتا رہتا ہے اب اس احساس نے کہ ہم سب کے سب اس کے غرض مند بن رہے ہیں اُس کی اُس شخصیت کو جو اس سے پہلے ہمارے سامنے ہمیشہ دبی رہتی تھی دفعتاً بہت اُبھار دیا ہے۔ اور وہ اس کا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ "صاحب۔ آج اگر ایک منٹ بھی دیر ہو جاتی۔ تو اخبار کسی صورت نہ مل سکتا...... یہ لیجئے لیکن ذرا جلد پڑھنے کی کوشش کیجئے گا...... پرنسپل صاحب بھی انتظار کر رہے ہوں گے......

جی۔ یہ ٹھیک تو ہے۔ پر سب کو پڑھنے کا موقع ملنا چاہیئے .... کل پروفیسر توشہ خانی تو اسے اپنے ساتھ گھر پہ لے گئے تھے۔ یہ بُری بات ہے۔ سب کو مل جل کر اخبار پڑھنا چاہیئے ....۔" رگھناتھ اخبار کے بہانے ہم پر اپنی بزرگی بکھیرتا رہتا ہے۔ ہم سب اس دوران میں ذرا خفیف سے ہو کر گھبرائے سے ضرور رہتے ہیں۔ پر اُسے کہتے کچھ نہیں۔ کیونکہ آں کہ شیراں را کنند روباہ مزاج۔ احتیاج است۔ احتیاج است۔ احتیاج۔ اور اخبار (خواہ وہ "چاند" ہی کیوں نہ ہو۔) اس زمانے کی سب سے بڑی احتیاج ہے۔ اور یہ راز رگھناتھ جانتا ہے۔

رگھناتھ کا تصور اس کی باتیں یاد دلاتا ہے۔ اور اس کی باتوں سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اس لئے میں اپنی توجہ وہاں سے ہٹا لیتا ہوں۔ اور محسوس کرنے لگتا ہوں۔ کہ میں ناتھو جی کے پاس بیٹھا ہوں۔ اور ناتھو جی کہہ رہا ہے "معاف کیجئے گا لیکن جب تک آپ اپنی زندگی کا کوئی مقصد تلاش نہیں کریں گے تب تک آپ یونہی کھوئے کھوئے سے رہیں گے۔ جیسے اب ہیں دیکھیئے نا۔ میں آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔ پر نہ جانے آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ آپ کے ارد گرد تاریخ بن رہی ہے اور آپ اسی ماحول کا ایک پرزہ ہوتے ہوئے بھی بے جان سے بنے بیٹھے ہیں۔ جیسے اس انقلاب سے آپ بالکل ہی بیگانہ ہوں۔ جیسے ...."

دفعتاً اپورب کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ گنگناتا ہوا سیڑھیاں چڑھ رہا ہے "آہا۔ گلشن میں بندوبست .... جی ہاں۔ گلشن میں بندوبست .... اجی برنگِ دگر ہے۔ آج ...." اور پھر جب قریب پہنچتا ہے۔ اور مجھے دیکھتا ہے تو جیسے اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ "آخاہ۔ حضور بھی یہاں ہیں .... بھئی غالبؔ ٹھیک کہا ہے۔ گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج۔ اور یہ بندوبست صرف سیاسی طور پر ہی برنگِ دگر نہیں۔ بلکہ کچھ اس لئے بھی ہے۔ کہ آج اس بدلتی ہوئی دنیا میں آپ کی آنکھیں بھی کھلیں۔ اور آپ کے قدوم میمنت لزوم بھی یہاں آئے ...."

میں مسکرانے لگتا ہوں۔

اور ناتھو جی اپورب سے کہتا ہے۔ "بھئی۔ اسے سمجھاؤ۔ اور اسے یہاں لے آؤ۔"

اپورب بڑے اہتمام سے میرے پاس آ بیٹھتا ہے۔ اور پھر بڑی سنجیدہ سی صورت بنا کر کہتا ہے "مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔ تم سے صرف یہ کہنا ہے۔ کہ آج کتنے ہی دنوں سے میں تمہارے لئے علامہ غالب کا ایک پیغام لئے لئے پھر رہا ہوں۔ چند دن ہوئے ایک صبح میں غالب کا دیوان سامنے رکھ کر بیٹھا ہوا تھا۔ تو تمہارا تذکرہ چھڑ گیا غالب یہ کہنے لگے "اپنا نہیں شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں۔ اُس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے"۔ اور پھر انہوں نے کہا کہ میں اُن کی یہ بات تم تک بھی پہنچا دوں۔ اور تم سے کہوں۔ کہ ممکن ہے۔ تمہارا کعبۂ مقصود کوئی اور ہو۔ پر کیا ہرج ہے۔ اگر تم زمانے کا یہ نیا رنگ بھی ذرا آزما دیکھو ...."

اپورب کہتا ہے "زنار باندھ۔ سبحۂ یک دانہ توڑ ڈال" اور جب وہ یہ سب کچھ کہہ چکتا ہے تو ذرا دیر بعد رُک کر۔ بڑی سنجیدگی سے پوچھتا ہے "کہو کیا خیال ہے؟"

اور پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہوں۔

کارونیشن ہوٹل کی نسبتاً کم سن کامریڈ سنتوش جو تھوڑی دیر سے ہمارے پاس آ

بیٹھی تھی۔ اور شاید کچھ کہنے کے لئے موقع کی تلاش میں تھی بڑے بھولپن کے ساتھ کہہ اٹھتی ہے: "ہائے جی یہ سب کچھ اتنا ایڈونچرس ہے۔ اور اتنا رومنٹک ہے۔ جیسے ساری زندگی پر یک نگ چھاگئی ہو۔ میں پوچھتی ہوں۔ کیا آپ کو واقعی یہ اچھا نہیں لگتا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اور کوئی میرے کان میں کہتا ہے: "ہاں۔ ہاں سوچتے کیا ہو۔ ایک سودا ہی سہی۔ آرزوئے خام سہی۔ اک تجربہ ہی سہی۔ فقیروں کا بھیس بدل کر تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کی ایک کوشش ہی سہی۔ آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے:"

اپورب ایک مرتبہ پھر اپنے اوپر بے پناہ سنجیدگی طاری کرکے پوچھتا ہے: "کبھو کبھئی۔ اب کے جب غالب سے میری ملاقات ہو۔ اور وہ تمہارے بارے میں پوچھیں۔ تو میں کیا جواب دوں"؟

میں مُسکرا دیتا ہوں۔

"جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے"

اور پھر ایک دن ———

میں کارونیشن ہوٹل میں ان انقلابیوں کے اِس حلقے میں آشامل ہوتا ہوں اب کالج کے اسٹاف روم میں جانے کی بجائے ہر صبح میں کارونیشن ہوٹل کا رُخ کرتا ہوں۔ کارونیشن ہوٹل کے بازو میں پلیڈیم ٹاکیز کے دروازے پر ہر روز اُس بڑی تصویر کو دیکھتا ہوں۔ جہاں سیواجی کے گھوڑے پر شیخ عبداللہ سواری کر رہے

ہیں۔ اور جسے ایک پنڈت آرٹسٹ نے اس تاریخ ہند کے صفحوں میں سے جو چھٹی جماعت کا کورس ہے۔ باہر نکال کر۔ اس میں نئے انقلاب کو پیش نظر رکھتے ہوئے مناسب تبدیلی کر دی تھی۔ اور سیواجی کے چہرے کو شیخ عبداللہ کا چہرہ بنا دیا تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں سیواجی کی تلوار بھی دے دی تھی۔ چنانچہ اب میں اس تصویر کو ہر روز دیکھتا ہوں۔ پھر کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھ کے کارونیشن ہوٹل کی دوسری منزل میں پہنچتا ہوں۔ اور اپورب سے ملتا ہوں۔ ۔ پردیسی سے ملتا ہوں۔ سوم ناتھ بیرا سے ملتا ہوں۔ اور اس کے بعد ہم سب کرسیوں پر بیٹھ کر اور ان میزوں پر اپنی کہنیاں ٹکا کر جن پر کبھی چائے رکھے ہم کارونیشن ہوٹل کے مالک کے چائے بنانے کے انداز کی تعریفیں کیا کرتے تھے۔ اب اُسے گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"۔ ۔ ۔ کم بخت دو قوموں کی تھیوری کا قائل تھا۔ کم بخت نے پندرہ اگست کو یہاں پاکستانی جھنڈا لہرایا تھا۔ کم بخت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

تھوڑی دیر بعد جب اُوشا آجاتی ہے۔ اور سمترا آجاتی ہے۔ اور سنتوش بھی آجاتی ہے۔ تو یہ محفل اور بھی زیادہ چمک اٹھتی ہے۔ اور ہم ان کو اپنے پاس بٹھا کر اپنے آپ کو بالکل ہی ایک قوم ثابت کرنے والی باتیں کرنے کے اور بھی زیادہ موڈ میں ہو جاتے ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں۔ کارونیشن ہوٹل کے مالک کی ایک کرسی سے دوسری چارپائی پر ہمارا سارا دن گذر جاتا ہے۔ اور کارونیشن ہوٹل کے باہر تاریخ بڑے زور و شور سے بنتی رہتی ہے اور انقلاب بڑے دھڑلے سے آتا رہتا ہے۔

ناتھ جی کہتا ہے: "اگر یہ انقلاب نہ آتا۔ تو میں شاعر کبھی نہ بن سکتا!" اور یہ کہنے

کے بعد وہ بمبئی کے پیپلز تھیٹر کے مشہور شاعر پریم دھون کی "اب گاڑی نا ہیں چاہئے" اور ہند میں جب گرم سیاسی موسم ہو جاتا ہے" کے گیت اپنے سامنے رکھے کشمیر کے نئے سیاسی موسم کے بارے میں اُسی طرح کے گیت لکھنے کی کوشش میں منہمک ہو جاتا ہے۔

سنتوش کہتی ہے "ہائے ناتھ جی۔ اس پریم دھون کی شاعری میں کیا پڑا ہے کیا آپ کو مدھوک پسند نہیں؟ ہائے ہائے مدھوک۔ کتنا اچھا لکھتا ہے"۔ پھر اُس کے ہونٹوں پر مدھوک کا کوئی فلمی بول دھیرے دھیرے تھرکنے لگتا ہے۔

اور اُوشا کہتی ہے۔ "واہ۔ مدھوک تو فلمی آدمی ہے۔ اس کا بھلا اس انقلاب میں کیا کام"۔

کارونیشن ہوٹل میں انقلاب کی سب سے بڑی پرستار اُوشا ہے۔ اُسے بات بات پر انقلاب کا خیال آتا ہے۔ اور وہ بات بات پر انقلاب کا نام لیتی ہے مقامی لوگوں کا عام خیال ہے۔ کہ انقلاب اُوشا کے لئے محض ایک کنایہ ہے۔ ایک پردہ ہے۔ اور جب وہ انقلاب کہتی ہے۔ تو اصل میں وہ کہہ رہی ہوتی ہے۔ راج ہنس۔ کامریڈ راج ہنس۔ کشمیری ہوم گارڈز کا کمانڈر راج ہنس۔ راج ہنس۔ جو کنواروں میں سب سے دلاویز کنوارا ہے۔ اور نوجوانوں میں سب سے دلکش نوجوان ہے۔ جو بڑا پُراسرار ہے۔ اور بڑا ہی اچھا ہے۔ کہتے ہیں۔ اوشا کے لئے راج ہنس کا دوسرا نام انقلاب ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ اُسے انقلاب بڑا عزیز ہے۔ جب کبھی کارونیشن ہوٹل کے برآمدوں میں سے راج ہنس گذر رہا ہوتا ہے۔ تو محض اس کے قدموں کی مانوس چاپ ہی سن کر اُوشا وہ بات جو وہ کر رہی ہوتی ہے۔ بھول جاتی ہے۔ اور دوسرے کامریڈ کن انکھیوں سے اُوشا کی اُن آنکھوں کو دیکھنے لگتے ہیں جن میں آس اپنی چمک کو دکھلا کر

گر قدموں کی مدھم پڑتی ہوئی چاپ کے ساتھ ساتھ۔ آہستہ آہستہ۔ کہیں دور جاتی ہوئی دکھائی دے رہی ہوتی ہے۔ اوشا کی زندگی میں انقلاب آ رہا ہے۔ خدا خیر کرے۔

اُوشا ان دنوں کارونیشن ہوٹل کی چار دیواری میں سب کی نگاہوں کا مرکز بنتی جا رہی ہے۔ اُسے دیکھ کر رنجن کو ہمیشہ اپنا بڑا بھائی یاد آ جاتا ہے "افسوس۔ صد افسوس۔ آج اس کا حسین وجمیل رومانی بھائی اس کے پاس یہاں سری نگر میں نہ ہوا۔ ورنہ راج ہنس کی کیا مجال تھی۔ جو وہ یوں اُوشا کی ذہنی دنیا کو اُتھل پتھل کر سکتا۔ اس کے بھائی کے گلیمر کے سامنے بھلا کوئی ٹھہر سکتا تھا"۔ اور پران کو ہمیشہ خیال آتا ہے وہ اس موضوع پر ایک ڈرامہ کیوں نہ لکھے۔ "کیوں ناتھ جی۔ میں اگر اوشا اور راج ہنس کے بارے میں ایک ڈرامہ لکھوں۔ تو کہیں یہ بُری بات تو نہ ہوگی ...... دیکھئے نا۔ ناتھ جی۔ یہ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں۔ کہ شاید انقلاب کے زمانے میں ایسی رومانی چیزیں لکھنی ٹھیک نہ ہوتی ہوں۔ اس لئے کہیں آنے والے نقاد مجھ پر انگلی تو نہیں رکھیں گے۔ ناتھ جی۔ بتائیے نا؟" وہ بڑے لاڈ سے کہتا ہے۔ "بتائیے نا۔ ناتھ جی۔ ڈرامہ لکھوں کہ نہ لکھوں۔ کہیں انقلاب کے اس زمانے میں یہ بُری بات تو نہ ہوگی"۔ اور سب سے کم سن کامریڈ سنتوش چپ چاپ یہ دیکھتی رہتی ہے سنتی رہتی ہے۔ اور آنکھیں جھپکتی رہتی ہے۔

"واہ رے انقلاب۔ تو جاوداں رہے"۔ ذرا فاصلے سے کامریڈ سوم ناتھ بیر کی آواز گونجتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ لکھتے لکھتے اپنا قلم میز پر ٹکا دیتا ہے۔ اور پھر سر کو اوپر اٹھا کے کامریڈ سنتوش کو دیکھنے لگتا ہے "کیوں کامریڈ سنتوش۔ یہ راج ہنس پنجابی ہیں نا؟"

اور پنکی اوشا کے رخساروں پر شفق پھوٹنے لگتی ہے۔ گلاب کے پھول کھلنے لگتے ہیں۔ بہار آجاتی ہے۔ اور کامریڈ سوم ناتھ بس اسی میں شاداں ہو جاتا ہے۔ اب اسے اپنے سوال کے کسی جواب کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ راج ہنس کو بھلا دیتا ہے۔ اور پھر اس شفق سے۔ ان گلاب کے پھولوں سے۔ اس بہار سے وہ ایک مسکراہٹ حاصل کرتا ہے۔ جو اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگتی ہے۔ اور وہ پھر قلم تھام کر بڑے انہماک سے اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ ریشم خانے اور کرن سنگھ وولن ملز کے ان مزدوروں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ جن کے کارخانے بجلی کے بند ہو جانے کی وجہ سے چونکہ بند ہو گئے ہیں۔ اس لئے اب وہ ہوم گارڈز میں بھرتی ہونے میں ہی اپنے پیٹ کی سلامتی سمجھتے ہیں۔ اور اس لئے یہاں آکر دھڑا دھڑ اپنے نام لکھوا رہے ہیں۔ اور بھرتی ہو رہے ہیں۔ ٹھیک ہے چھبیس روپے تنخواہ۔ اور راشن وردی مفت۔ بھوکا مرنے سے تو یہی غنیمت ہے۔ اور پھر سلطانا بٹ احمدو۔ رحیما ڈار۔ اور صمد جو۔ اور ان کے دوسرے ساتھی بھی خوش۔ اور حکومت بھی خوش۔ کیونکہ اس طرح حکومت کو یہ کہنے کا موقع مل سکتا ہے۔ کہ یہ سب قوم اور ملک کے جذبے سے معمور ہو کر بھرتی ہوتے ہیں۔ اور چونکہ نیشنل کانفرنس کے ہوم گارڈز میں بھرتی ہوئے ہیں اس لئے ظاہر ہے۔ کہ یہ کہنا اور بھی آسان ہے کہ یہ نیشنل کانفرنسی بھی ہیں۔

اور اس وقت جب کہ کارونیشن ہوٹل میں یہ ہو رہا ہوتا ہے۔ ایڈجوٹنٹ سوری اس سب کچھ سے بے نیاز۔ اپنی دنیا میں ہی مگن اپنے ٹائپ رائٹر پر سر جھکائے کچھ ٹائپ کرتا رہتا ہے۔ ٹک۔ وہ ایک لفظ پر انگلی مارتا ہے۔ پھر اپنا سر جھکا کے اور آنکھیں پھاڑ کے دیکھتا ہے کہ کیا وہ لفظ واقعی کاغذ پر لکھا گیا ہے۔ اور پھر جب اسے اطمینان ہو جاتا ہے۔ کہ اس کی یہ ٹک بیکار نہیں گئی۔ تو پھر دوسری ٹک کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پھر سر جھکتا ہے۔ اور یوں باصد احتیاط و با ہزاراں تدبیر یہ ٹائپ ہوتا رہتا ہے۔ جس میں ایک گھنٹے میں بڑی مشکل سے کہیں جا کے دس سطریں ٹائپ ہوتی ہیں۔ ایڈجوٹنٹ سوری کو اپنے ٹائپ کے سوا صرف بندوقوں سے دلچسپی ہے۔ جو کبھی کبھار اُسے شہریوں میں تقسیم کرنی پڑتی ہیں۔ اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ ٹائپ کرنا۔ اور اگر کبھی وہ باتیں کرنے کے موڈ میں ہو۔ تو اس کا محبوب موضوع ہے۔ بندوقوں کی تقسیم۔ مہاراج گنج والے ایک دن درخواست لائے۔ کہ انہیں بھی حکومت کی طرف سے اسلحہ ملنا چاہیئے۔ تاکہ وہ بھی وقت آنے پر اپنا بچاؤ آپ کر سکیں۔ اب چونکہ حکومت کی پالیسی یہ ہے۔ کہ اس وقت سب کو خوش رکھنے کی سبیل کرو۔ اس لئے میں نے فوراً ان کے محلہ آفیسر بلوائے۔ اور پھر ان میں بندوقیں تقسیم کروا دیں اور وہ اسی میں خوش ہو گئے۔ نادانوں کو خیال تک نہ آیا کہ ایمونیشن کے بغیر بندوقیں محض ڈنڈے ہیں اور حکومت اتنی بیوقوف نہیں جو ہر ایرے غیرے کو خواہ مخواہ ایمونیشن دیتی پھرے اس بات کا وہ بڑے پرائیویٹ انداز میں ذکر کرتا ہے۔ اور پھر خوب ہنستا ہے۔ "بیوقوف کندھوں پر خالی ڈنڈے لٹکائے پھرتے ہیں۔ اور بے حد خوش ہیں۔ جیسے وقت آنے پر یہ خود ہی تو ٹھس کرے گی"۔

ہم سب خوب ہنستے ہیں۔ اور پھر عوامی حکومت کی ڈپلومیسی کے بے حد قائل ہو جاتے ہیں جس کا سوری ایک معمولی سا پرزہ ہے۔ نہ جانے اس معمولی پرزہ سے ذرا آگے۔ جہاں سیاست کے اونچے ستون ہیں وہاں یہ ڈپلومیسی کس کس روپ میں اجاگر ہوتی ہوگی۔ اور ان کو کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہوں گے۔

مگر سُوری ایسی باتوں پر مغز کھپانا پسند نہیں کرتا۔ وہ بندوقوں کی تقسیم کا کوئی اسی طرح کا واقعہ سنانے کے بعد پھر اپنے ٹائپ رائٹر کے ساتھ مشغول ہو جاتا ہے ٹک۔ اور اس کا سر جھکتا ہے۔ آنکھیں اپنی پوری کشادگی کے ساتھ ٹائپ شدہ حرف کو دیکھتی ہیں اپنا اطمینان کرتی ہیں۔ اور پھر دوسری ٹک کی آواز آتی ہے۔ اور وہ دس سطریں جنہیں سُوری کے ہاتھوں ایک گھنٹے میں ٹائپ ہونا ہے۔ ٹائپ ہونے لگتی ہیں! در وقت ہے۔ کہ اس کو سُوری پر ذرا ترس نہیں آتا۔ اور سُوری کا ہے کہ وقت سے بے نیاز اپنا کام کئے جا رہا ہے اور ہم ہیں کہ سُوری کی طرف دیکھتے دیکھتے اب اوشا کی طرف دیکھنے گئے ہیں۔ اور اوشا ہے کہ چپ چاپ کچھ سوچے جا رہی ہے۔ اوشا کیا سوچ رہی ہے؟)

اُوشا سوچ رہی ہے۔ آج شام کو گھر جاتے ہی وہ بمبئی کے اخبار "بیپلز ایج" کے ایڈیٹر کو اشاعت کے لئے ایک مکتوب سری نگر لکھے گی۔ جس میں وہ لکھے گی۔ کہ کشمیر میں آج کل انقلاب آیا ہوا ہے۔ اور یہاں ہم سب لوگ بڑا روملنگ سا محسوس کر رہے ہیں۔ اور یہ بڑا انوکھا سا لگتا ہے۔ اور کارخانوں کے سارے مزدور اب ہوم گارڈز میں بھرتی ہو رہے ہیں۔ (یہ بات وہ ضرور لکھے گی کیونکہ اس سے خط کی اشاعت کے امکانات روشن نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں لکھے گی۔ کہ ان مزدوروں کے بھرتی ہونے کی اصلی وجہ کارخانوں کا بند ہو جانا ہے) اور پھر وہ لکھے گی کہ ہم نوجوان لڑکے اور لڑکوں نے یہاں کلچرل فرنٹ قائم کر رکھا ہے۔ جو اصل میں ہوم گارڈز ہی کی ایک شاخ ہے ان دنوں یہاں بہت سے کامریڈ باہر سے بھی آئے ہوئے ہیں۔ (ان باہر سے آئے ہوئے لوگوں میں وہ ہندوستانی فوجیوں کا ہرگز ہرگز ذکر نہ کرے گی کیونکہ اس سے اس انقلاب پر حرف آتا ہے۔ اور اس عوامی جد و جہد کا سارا بھانڈا پھوٹتا ہے) ان کامریڈوں کا تذکرہ کرتے ہوئے خط کے آخر آخر میں وہ لکھے گی۔ کہ ہمارے کامریڈوں میں سب سے زیادہ ان تھک کام کرنے والا راج بنس ہے۔ اور ....

اور اوشا کی آنکھوں میں راج بنس کے خیال نے ایک عجیب نشہ آور سی کیفیت بھر دی ہے۔ اور چونکہ اُوشا اس طرح کے خط "پیپلز ایج" کو اکثر لکھتی رہتی ہے۔ اس لئے اس کی آنکھوں سے اُس کی سوچیں پڑھنے میں ہم کوئی غلطی نہیں کرتے۔

اُوشا سوچ رہی ہے۔ یہ خط جب راج بنس کے محبوب اخبار "پیپلز ایج" میں چھپے گا۔ اور راج بنس اوشا کی یہ تحریر پڑھے گا۔ اور اپنی تعریف پڑھے گا۔ تو —— تو کشمیر کا یہ انقلاب درخشاں ہو جائے گا۔ اور جیسا کہ ایک دن ناتھ جی نے کہا تھا ابھی تو انقلابات کی محض شروعات ہیں۔ اور ابھی آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا......

میں اپنی کرسی سے اٹھ کر کارونیشن ہوٹل کی اس بالکونی میں جا کھڑا ہوتا ہوں جہاں سے امیراکدل کا چوک نظر آتا ہے۔ اور اس انقلاب کی صورت نظر آتی ہے۔ جو ناتھ جی کی معلومات کے مطابق مدتوں پہلے روس میں آیا تھا۔ اور اب سری نگر میں بھی آیا ہوا ہے۔

امیراکدل کے چوک پر شام چھا رہی ہے۔ ابھی اندھیرا نہیں ہوا۔ لیکن روشنی کے بغیر شہر کی شاموں پر جو اداسی سی چھا جاتی ہے۔ اُس کا پرتو یہاں بھی نظر آ رہا ہے کارونیشن ہوٹل کے انقلابی کامریڈ جو سارا دن بزعم خود ملک اور قوم کی خدمت کرنے میں منہمک رہے تھے آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگتے ہیں۔ اور پھر اس ہجوم

کو چیرتے ہوئے اپنے گھروں کی راہ لیتے ہیں جو اس پہلے پلیڈیم ٹاکیز کے برآمدے شام کے وقت ایکٹرسوں کی تصویریں دیکھنے اور قریبی پنجاب مسلم ہوٹل کے ریڈیو سے گانے سننے کے لئے جمع ہوا کرتا تھا۔ لیکن جواب شاید محض اس انوکھے انقلاب کو دیکھنے آتا ہے اسے سمجھنے آتا ہے۔ اور اپنے تجسس کی خاطر اس ڈر اور خوف کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ جو اس انقلاب نے ہر ایک پر طاری کر رکھا ہے۔

امیراکدل سے پرے پرتاپ پارک ہے اور اگر ڈل گیٹ کی طرف جاتے ہوئے اس کے پاس سے داہنے ہاتھ کو گھوم کے بنڈ پر چلے جائیں۔ تو وہاں کی خاموشی اور ویرانی اور بھی گھمبیر ہو جاتی ہے۔ یہاں جہلم کا پانی خاموش ہے۔ اور اس کے سینے کے ساتھ لپٹے ہوئے ہاؤس بوٹوں میں زندگی کا کوئی نشان نہیں۔ اور شکاروں کی ریل پیل بھی اب ماضی کی ایک کہانی ہے۔ اور دریا کی سطح پر اگر کوئی اکا دکا شکارا دکھائی بھی دے۔ تو یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی کٹا ہوا پتنگ ہو۔ یا کسی چنار کا ایک ایسا پتہ جسے ہوا نے اپنی شاخ سے دور پھینک دیا ہو۔ اور اب اسے ادھر ادھر بھٹکائے پھرتی ہو۔ بغیر کسی راہ کے بغیر کسی منزل کے۔ اور بغیر کسی مقصد کے۔

بنڈ کے کناروں پر اب زردی چھا رہی ہے۔ اور ان کے نیچے کی تاریکیوں میں اب کوئی رومان نظر نہیں آ رہا۔ یہاں صرف کبھی کبھی کوئی بوڑھا انگریز جوڑا بڑی آہستہ خرامی سے کلب کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ورنہ سارے سیاح اس انقلاب کی تاب نہ لاتے ہوئے یہاں سے دفعتاً بھاگ گئے ہیں۔ اور اب یہاں کوئی نہیں صرف ویرانیاں ہیں۔ اور اداسیاں۔ اور چناروں تلے کا اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ اور دور شنکر اچاریہ کا مندر بھی اب رات کے دھندلکوں میں کھویا جا رہا ہے بجلی کی وہ روشنی جو کبھی شام کے

اس سمے بنڈ سے دیکھنے والوں کی نظر میں شنکر اچاریہ کو ایک روشن ستارہ بنا دیتی تھی اب غائب ہے۔ شام تو خیر یوں بھی اب ڈراؤنی گئی ہے۔ لیکن صبح کو بھی اب وہاں کوئی نہیں جاتا۔ سوائے ان چند سرپھروں کے۔ جن کا خیال ہے۔ کہ شاید وہ لوگ جو بارہ مولا میں آ کر رُک گئے ہیں۔ کسی صبح اس طرف سے ہی آ جائیں۔ اور اس لئے کیوں نہ ہم ہی وہ خوش نصیب بنیں۔ جو سب سے پہلے ان آنے والے مہمانوں کا استقبال کریں گے۔ چنانچہ یہ ہر صبح گھڑیوں کو الارم لگا کے جاگتے ہیں۔ اور پھر سیر کے بہانے شنکر اچاریہ کی طویل چڑھائی چڑھتے ہیں۔ اور پھر اوپر جا کے گھور گھور کے سامنے کے جنگلوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ اور جب دن چڑھ آتا ہے۔ اور آنے والے نہیں آتے۔ تو وہ دوسرے دن کی آس لگا کر لوٹ آتے ہیں۔

بڑے ڈاک گھر کے سامنے دریا کے اس پار سب سے نمایاں چیز کانونٹ کے اونچے مینارے پر کی بڑی سی گھڑی ہے۔ اگرچہ اس وقت شام کا اندھیرا بڑھ رہا ہے پھر بھی ذرا سی کوشش سے دیکھا جا سکتا ہے کہ وہاں صرف ایک بج کر پینتیس منٹ ہوتے ہیں شام کے اس وقت جب کہ یقینی طور پر چھ بجنے والے ہوں گے۔ یہ گھڑی صرف ایک بج کر پینتیس منٹ کیوں بجا رہی ہے؟ لیکن یہ گھڑی پچھلے کئی دنوں سے دن اور رات کے ہر لمحے میں یہی بجاتی رہتی ہے۔ اسے چابی دے کر چالو کرنے والے کانونٹ کے سب لوگ بھاگ گئے ہیں اور اب اس گھڑی میں وقت تھم گیا ہے۔ وقت آگے نہیں بڑھ رہا۔ اور یہ گھڑی کچھ اور بجانے سے انکار کر رہی ہے۔

لیکن گھڑی کے اس انکار سے کیا ہوتا ہے؟ وقت گھڑی کے ان پرزوں سے نکل کر اب بھی بدستور رواں ہے۔ اس وقت چھ بجنے کو ہیں۔ اور میں بنڈ پر چل رہا ہوں۔ اب چھ

بج گئے ہیں۔ اب سات ہیں۔ اور بنڈ پر اندھیرا گہرا ہو گیا ہے۔ اور دور بنڈ سے بہت دور وزیر باغ کے ایک مکان میں موم بتی جلائے "اُوشا پیپلز ایج" کے لئے ایک خط لکھ رہی ہے اور اس کے چہرے پر وہ تابانی ہے۔ اور شوق ہے۔ اور ہلکا سا حجاب ہے۔ اور بے تابی ہے۔ جیسے اس خط میں وہ کسی بہت ہی پیارے محبوب سے اظہار محبت کر رہی ہو۔ اور وہ پیارا محبوب۔ وہ راج ہنس اسی وقت نیڈوز کی بار میں بیٹھا اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے "میں انقلاب پر مرتا ہوں۔ چاہے وہ کہیں ہو۔ روس میں ہو یا کشمیر میں۔ میں صرف انقلاب پر مرتا ہوں" اور اس کا ساتھی کہہ رہا ہے" کامریڈ۔ انقلاب ہے ہی ایسی چیز میں بھی اس پر مرتا ہوں......" اور اگرچہ کانونٹ کی گھڑی کہتی ہے۔ کہ وقت چلتے چلتے ایک مقام پہ آ کے رک گیا ہے۔ پر وقت ساری قیود سے بے نیاز گزرتا جا رہا ہے۔ آج سوموار ہے۔ آج منگل۔ اور آج بدھ۔ اکتوبر کا مہینہ ختم ہو چکا ہے۔ چناروں کے پتے ہر روز رنگ بدلتے ہیں اور اب شاید رنگ بدلتے بدلتے وہ تھک گئے ہیں۔ اس لئے چپ چاپ گرنے شروع ہو گئے ہیں۔ اب نومبر کا آغاز ہے۔ آج پہلی تاریخ ہے۔ آج دو ہے۔ آج تین۔ اور آج نومبر کا پہلا ہفتہ ختم ہو رہا ہے۔ اور جن کا آج تک سری نگر والے انتظار کرتے رہے تھے۔ آج نہ جانے کیوں بارہ مولا سے ہی واپس چلے گئے ہیں۔ اور آج وہ دن بھی گزر گیا ہے۔ اور اب ۱۲ نومبر ہے۔ اور اب پنڈت نہرو جو آج تک سری نگر سے دور دلی میں بیٹھے کشمیر کی محبت میں بے چین ہوتے رہے تھے۔ سری نگر میں آئے ہوئے ہیں۔ اور امیرا کدل کے چوک میں کھڑے شیخ عبداللہ سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ سیاست کو رومان کا ٹچ دیا جا رہا ہے۔ اور پنڈت جی کہہ رہے ہیں۔ کہ یہ ہاتھ اصل میں نہرو اور عبداللہ کے ہاتھ نہیں ہیں۔ بلکہ ہندوستان اور کشمیر کے ہاتھ ہیں۔ اور یہ ایک دفعہ ملنے کے بعد اب کبھی جدا نہ ہونگے

ور شیخ صاحب مسکرا رہے ہیں۔ سارے دیکھنے اور سننے والوں کے دل دھڑک رہے ہیں اور سرکاری فوٹو گرافر ان کے ارد گرد کھڑے دھڑا دھڑ تصویریں لے رہے ہیں ہاتھوں کے ملنے کی تصویریں اور عبداللہ کے مسکرانے کی تصویریں۔ اور چونکہ اب تک کوئی ایسا کیمرہ ایجاد نہیں ہوا۔ جو دھڑکتے دلوں کی تصویریں بھی لے سکے۔ اس لئے دھڑکتے دلوں کی کوئی تصویر نہیں لی جا رہی۔ اور اب عبداللہ کہہ رہا ہے۔ آج سے یہ چوک لال چوک ہے اور اینٹوں کے نئے نئے بنے ہوئے چبوترے پر نیشنل کانفرنس کا جھنڈا لہرایا جا رہا ہے اور وہ دھڑکتے دل جن کی کوئی تصویر نہیں لی جا سکتی۔ اب اور بھی شدت سے دھڑک رہے ہیں۔ اور دن ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اور ۱۲۔ نومبر کی یہ تاریخ بھی گذرتی جا رہی ہے اب ہوم گارڈز کے دفاتر کارونیشن ہوٹل سے شہر کے غربی سرے والی نمائش گاہ کی طرف منتقل ہو رہے ہیں۔ اور کارونیشن ہوٹل کا سارا سامان بھی اب سرکاری ملکیت بن کر ہوم گارڈز کے ساتھ ہی ان کے نئے ہیڈ کوارٹرز میں منتقل ہو رہا ہے۔ جہاں ہوم گارڈز جب پریڈ کرتے ہیں۔ تو اُن کی سوچیں انہیں کہیں لے جاتی ہیں۔ اور ان کا پاؤں چلتے چلتے اکثر اُکھڑ جاتا ہے جس پر انہیں ڈانٹ پڑتی ہے۔ اور ایسے وقت میں ہمیشہ کلچرل فرنٹ والے سیکشن کے سامنے دھوپ میں بیٹھے ہوئے کامریڈ سنتوش بالکل بچہ بن جاتی ہے۔ اور اس کی ہنسی نکل جاتی ہے۔ اور پران دل ہی دل میں سوچتا ہے۔ میں اس پہ بھی ایک ڈرامہ لکھوں گا۔ خواہ یہ لوگ ناراض ہی ہو جائیں۔ پر میں لکھوں گا ضرور۔" اور وہیں کہیں ایک اور طرف پولیٹیکل فرنٹ کا ایک نیا سیکشن ظہور پذیر ہو چکا ہے۔ جہاں روس اور چین کے بارے میں معلوماتی کتابوں کے ایک بہت بڑے ڈھیر کے درمیان بیٹھے راج ہنس اور اس کے کچھ اور ساتھی سارا سارا دن کاغذ اور

پنسل سنبھالے کوئی لیکچر قسم چیز تیار کرتے رہتے ہیں۔ اور پھر جب رات پڑتی ہے تو مشعلوں کی روشنی میں ہوم گارڈز کو اپنے سامنے بٹھا کر۔ بڑی اونچی اونچی باتیں۔ سیاست اور انقلاب اور روس اور چین کی باتیں سنائی جاتی ہیں جنہیں وہ آنکھیں پھاڑے مبہوت سے ہو کر سنتے رہتے ہیں۔ اور اُوشا کو یہ سب کچھ اتنا رومانٹک اور اتنا سپنوں جیسا لگتا ہے کہ وہ مسحور سی ہو جاتی ہے۔ اور اپوربا ہمیشہ کی طرح اب بھی کہتا رہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "گلشن میں بند وبست برنگِ دگر ہے آج ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اور دن رات گذرتے جاتے ہیں۔ اور سورج کے طلوع و غروب کے ساتھ ساتھ آدھا نومبر ماضی بن جاتا ہے۔ اور پھر دفعتاً بیس تاریخ آجاتی ہے۔ اب مہورہ پاور ہاؤس ٹھیک ہو گیا ہے۔ اور پورے چھبیس دن کے بعد سری نگر میں پھر پہلے کی طرح بجلی جگمگ جگمگ کر رہی ہے ۔ ۔ ۔ اور پلیڈیم ٹاکیز کے سامنے لوگوں کا ہجوم گا ناسن رہا ہے "آخر وہ دن یا آج" ۔ ۔ ۔ ۔ اور نمائش گاہ کے احاطے میں بجلی کی پہلی جھلک دیکھتے ہی ہوم گارڈز کو وہ دن یاد آنے لگے ہیں جب وہ ہوم گارڈز نہیں تھے۔ اور مزدور تھے اور انہیں اپنے وہ کارخانے یاد آنے لگے ہیں۔ جو اب بجلی کے آنے سے دوبارہ کھل جائیں گے۔ اور انہیں روس اور چین اور انقلاب اور سیاست کی اونچی اونچی باتوں میں ذرا دلچسپی نہیں رہتی۔ وہ اس کے بغیر ہی بھلے ہیں۔ چنانچہ یہ انکشاف سیاسیات کے اونچے حلقوں میں بھونچال بن کر آتا ہے۔ چنانچہ ڈپلومیسی ایک دفعہ پھر آڑے آتی ہے۔ اور فیصلہ ہوتا ہے۔ کہ یہ سارے ہوم گارڈز مختلف ٹکڑیوں میں ساری ریاست کے دیہات میں امن پھیلانے کے لئے بھیج دیئے جائیں نہ وہ یہاں رہیں گے۔ نہ بجلی دیکھیں گے۔ نہ انہیں کارخانوں کا دھیان آئے گا۔ اور نہ سیاسیات کے اونچے حلقوں

میں بھونچال کی کیفیت آئے گی۔ چنانچہ سب جا رہے ہیں۔ کوئی گاندربل جا رہا ہے۔ کوئی بانڈی پورہ۔ کوئی اسلام آباد۔ اور میں اور اپوربا جموں کی طرف جا رہے ہیں۔ اور ہمارے ساتھ پورے ایک سو بارہ ہوم گارڈز ہیں۔ اپنے کندھوں کے ساتھ بندوقیں لٹکائے اور اپنے سینے کے ساتھ کارتوس لگائے ۔ اور ہم ان کے کمانڈر ہیں۔ اور ناتھ جی ہم سے پوچھ رہا ہے: "کیوں جی۔ کیا آپ نے قلم بالکل چھوڑ دیا۔ اور اب اس بندوق سے ہی ناطہ جوڑیں گے۔" اور ہم اپنی جیبوں سے نکال کر اسے اپنے قلم بھی دکھا رہے ہیں اور سب ہنس رہے ہیں۔ اور سنتوش میرے پاس کھڑی میری بندوق کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہی ہے۔ کہ کیا بندوق ہمیشہ ہی بھری رہتی ہے۔ اس کا جی چاہ رہا ہے۔ کہ وہ اسے چھوڑ کر دیکھے۔ مگر اس کا حوصلہ نہیں پڑ رہا۔ اور اُوشا مسکراہٹوں کے طوفان میں جیسے ڈولتے ہوئے کہہ رہی ہے: "میں اب "پیپلز ایج" کو ایک اور خط لکھوں گی۔ آج ہی لکھوں گی۔" اور ہم سب کے سب اتنے خوش اخلاق بننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کوئی بھی اُوشا سے نہیں پوچھ رہا۔ کہ آخر وہ اس میں کیسے گی کیا کیونکہ راج ہنس تو کہیں نہیں جا رہا۔ ہر ایک کا جی چاہ رہا ہے۔ مگر کوئی بھی اس سے نہیں پوچھ رہا۔ اور اوشا جو آج راج ہنس کے کہیں نہ جانے پر اتنی زیادہ خوش ہے۔ کہ اسے بار بار اپنی خوشی بڑی کوشش سے چھپانی پڑ رہی ہے۔ اب بڑی سنجیدہ سی ہو کر پوچھ رہی ہے: "کیوں جی۔ آج کوئی کہہ رہا تھا۔ کہ میدانِ جنگ ہوتا نہیں۔ بن جایا کرتا ہے۔ تو آپ بھی کہیں میدانِ جنگ بنانے تو نہیں جا رہے؟" سب مسکرا دیتے ہیں۔ اور نومبر کی اس بیس تاریخ کو جب کہ صبح کے سوا دس بج رہے ہیں۔ اور سری نگر کی دھوپ بڑی خوشگوار معلوم ہو رہی ہے اور اُوشا سنتوش اور دوسرے بہت سے ہمیں الوداع کہنے کو ہمارے پاس جمع ہیں

اور بڑی سخاوت کے ساتھ ہمیں سرکاری سگریٹوں کے ڈبے دیئے جا رہے ہیں۔ تاکہ ہم سفر کے دوران میں انہیں پیتے رہیں۔ اور ان کے دھوئیں کے بادلوں میں گزرے ہوئے دن ہماری نظروں سے کہیں دُور چھپ جائیں۔ ہم لاریوں پر سوار ہو رہے ہیں۔ اور اب سرینگر، سری نگر کی بجلی۔ سری نگر کے کارخانے۔ ناتھ جی۔ پران۔ اور اوشا اور سنتوش سب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ اور کانونٹ کی وہ گھڑی جس پر اس وقت بھی ایک بج کر تینتیس منٹ ہی ہوئے ہیں۔ ہم سے دور ہوتی جا رہی ہے اور آج کل کے نت نئے ہنگاموں کے خلاف اُس کا خاموش احتجاج ہمارے لئے بے مقصد ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ وقت ہمیں لئے جا رہا ہے۔ اور ہم جا رہے ہیں اور اپورب گنگنا رہا ہے .... "دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ ... دیکھیں کیا گذرے ہے .... "دیکھیں کیا گذرے ہے .... کیا گذرے ......" اور دو رویہ کھڑے چناروں کے درمیان سے قاضی گنڈ جانے والی سڑک پر سے میں سامنے آسمان سے باتیں کرتی ہوئی بانہال کی چوٹی کو دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں۔ کہ جب ہم اس چوٹی پر پہنچنے کے بعد نیچے اتر کر ڈوگروں کی اصلی نگری جموں کے شہروں میں داخل ہوں گے۔ تو وہاں نہ جانے ہم پر کیا گذرے گی۔ اور اس وقت نہ جانے وہاں کیا گذر رہی ہوگی؟

اپورب گنگنا رہا ہے ...... دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ ....."

اور میں سوچ رہا ہوں۔ بس سوچ رہا ہوں۔

پیر پنجال کے قیدی

مقام — بانہال کی بستی جو پیر پنجال پہاڑ کے دامن میں واقع ہے اور جو ہر سال برف باری کے زمانے میں ٹنل کو بند کر کے جموں سے سری نگر جانے والا راستہ بند کر دیتی ہے اور یوں کشمیر کو دو حصوں میں بانٹ دیتی ہے

ہوم گارڈز کی وہ کمپنی جو ۲۰ نومبر کو سری نگر سے چلی تھی۔ پورا ایک مہینہ جموں کے صوبے میں کشتواڑ بھدرواہ۔ ڈوڈہ اور چینی وغیرہ کے علاقوں میں گھومنے کے بعد اب واپس سری جا رہی تھی کہ اسے اس مقام پر برف باری نے روک دیا اور وہ ہوم گارڈز جوان ان گنت دیہاتوں کی گرمی سے جو سنگینوں کی لگائی ہوئی آگ میں سلگ رہے تھے بھاگ کر یہاں پہنچے تھے۔ اب یہاں کی ٹھنڈک میں بھی بے چین ہو رہے ہیں۔

وقت — ۲۰ دسمبر ۱۹۴۷ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۴۷ء تک۔

رات کو ہم گیارہ بجے سوتے ہیں اور بارہ بجے اپورب کی آواز آتی ہے "کیا سو گئے؟" اور نہ جانے کیسے عین اسی وقت میری آنکھ بھی کھل جاتی ہے "ہاں"

"باہر موسم کا کیا حال ہے؟"

"برف پڑ رہی ہو گی"

اپورب کی ہمسایہ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا ہے اس لئے ایسے وقت میں موسم کی جانچ پڑتال وہی کرتا ہے کھڑکی سے پردے کو ذرا سرکاتا ہے اپنا سر تکیے سے ذرا اٹھاتا ہے اور پھر اس کی آواز آتی ہے "برف بند نہیں ہوئی کمبخت ابھی تک پڑے جا رہی ہے خدا کرے کل یہ ختم ہو جائے"

"ہاں خدا کرے" اپورب اگرچہ خدا کو نہیں مانتا مگر کہتا یہی ہے اور پھر جیسے اس کی نگاہوں کے سامنے مختلف تصویریں گذر رہی ہوں اور وہ ان پر تبصرہ کر رہا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگتا ہے "کل خدا کرے گا اور برف بند ہو جائے گی اور تملی لوگ نیچے اپنے بیلچے سنبھالے ٹنل کی جانب روانہ ہو جائیں گے افضل انجینئر بھی ان کے ساتھ ہوگا۔ اور پھر جب شام پڑیگی۔ تو خون کو جسم میں منجمد کر دینے والی سرد ہوائیں چلنی شروع ہو جائینگی۔ برف پتھر بن جائے گی اور قلیوں کے بیلچے لوہے کو شاید کاٹ سکتے ہوں مگر اس برف کو نہ کاٹ سکیں گے۔ ورنہ یوں بھی ہوا قلیوں کو اڑانے پر تل جائے گی۔ اور پھر........"

اور اب اپورب کی آواز کو میں تھام لیتا ہوں........" اور کل سے افضل انجینئر ڈاک بنگلے کے برآمدے میں اپنی سیریں پھر سے جاری کر دیگا پھر اڑھائی دن تک متواتر یہ سرد ہوائیں چلتی رہیں گی اور اس کے بعد جب وہ رکیں گی تو موسم کی پیش گوئیوں کا زمانہ شروع ہو جائیگا۔ ہر بانہالی موسم کا پیغمبر بن جائیگا۔ اور ہم احمقوں کی طرح ان کا منہ تکا کریں گے اور ان میں سے ہر ایک کہیگا۔ کل سے پھر برف شروع ہو جائیگی۔ یا پرسوں سے! اور اب کے برف کا ایک طوفان بھی آئیگا۔ اور ہم دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ سنتے رہیں گے! اور وہ کہیں گے کہ اس سال پیر پنجال بہت خفا ہے کیونکہ ہندوستانی فوج کے سپاہی اس کی چوٹی پر پاک جگہ پر بیٹھکر شراب پیتے ہیں اسلئے وہ خفا ہے بہت ہی خفا۔"

اپورب ہنسنے لگتا ہے کیونکہ وہ ایسی باتیں سن کر ہمیشہ ہنس دیا کرتا ہے اور میں بھی ہنسنے لگتا ہوں کیونکہ ایسے وقت میں مجھے ہنسنا ہی موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر ایک ہنس رہا ہوتا ہے اور دوسرا ہنستے ہنستے ہی سو جاتا ہے اب دوسرے کی ہنسی بھی بے حوصلہ سی ہو کر بند ہو جاتی ہے غالباً ایک گھنٹہ کے بعد اپورب کی آواز کمرے کی خاموشی کو پھر توڑتی ہے "کیا سو رہے ہو؟" اور گویا کسی میکانکی اثر سے عین اسی وقت میری آنکھ بھی کھل جاتی ہے "ہاں"

"میں ایک خواب دیکھ رہا تھا"

"کیا؟"

اور پھر اپورب مجھے ایک ایسا خواب سناتا ہے جو اس وقت بڑا مزیدار معلوم ہوتا ہے لیکن صبح تک نہ اپورب کو یاد رہتا ہے اور نہ مجھے۔ خواب سناتے سناتے ابھی وہ اس کے کسی پیچیدہ دلچسپ حصے کے مزے لے رہا ہوتا ہے کہ سنتے سنتے مجھ پر اونگھنے کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے! اور میں بجائے اس کا خواب سننے کے کوئی اپنا خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہوں بڑی دیر بعد جو بعض اوقات کم بھی معلوم ہوتی ہے اپورب پھر جگاتا ہے اور جب وہ جگا رہا ہوتا ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میں پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔

اب کے اپورب کو کوئی شعر پریشان کر رہا ہوتا ہے "بھئی وہ ایک مصرع ہے نا۔

"ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ کو"

اس کا دوسرا مصرع کیا ہے؟"

اور جب میں دوسرا مصرع اپنے دماغ کے کونوں کھدروں میں تلاش کرنے کی سعی کرتا ہوں تو اپورب کا بنایا ہوا پہلا مصرع بھی مجھے بھول جاتا ہے بس مجھے اپنی منزل کی دوری کا خیال ستانے لگتا ہے۔ بانہال کی اونچائیوں اور بانہال کی برف نے مل جل کے سازش کر لی اور ہمارا راستہ روک دیا۔ اور ہم جو سرینگر جانے کے خواب دیکھتے آئے تھے، بانہال ہی میں رہ گئے۔ بانہال کے ڈاک بنگلے کے ایک کمرے میں، آتش دان کے قریب جیسے ہمیں نظر بند کر دیا گیا۔ متواتر پڑنے والی برف، سرینگر کو ہم سے دور اور دور تر کرتی گئی، اور ہم اداس ہوتے گئے اور اب اپورب "ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ کو" کا دوسرا مصرع پوچھ کر، اپنی اداسیوں پر شاید شاعری کا رنگ چڑھانا چاہتا ہے، اور میں سوچتا ہوں میں بھی یونہی کروں اور اس سے پوچھوں کہ، "اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے" والے مصرع کے متعلق اس کا کیا خیال ہے، اور اس سے کہوں کہ اگر ہم اس شعر کے دوسرے مصرع پر غور کرنے کی بجائے اس شعر کے پہلے مصرع پر غور کریں تو زیادہ بہتر ہو اور میں گنگنانے لگتا ہوں "اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے" ———— اور اپورب جیسے بہت زیادہ غصہ مان کر اپنا پہلو بدل لیتا ہے اور اپنے جسم کے گرد لحاف کی گرفت اور مضبوط کر لیتا ہے اور اپنا منہ بھی ڈھک لیتا ہے۔

رات کو اپورب کو موسم، خواب اور شعر ہی پریشان نہیں کرتے، بلکہ کبھی کبھی آدھ اور باتیں بھی اس کی مجبوریوں میں اضافہ کرنے کے لئے اس کے ذہن پر آ تسلط جاتی ہیں "بھئی اگر اقبال اس وقت زندہ ہوتا تو کس طرح کی شاعری کرتا؟" ــ اور یا ــ "بھئی، گندے انڈوں کا پتہ کیسے چلایا جاتا ہے؟

"پانی میں ڈال کر"

"اور پھر ــ؟"

"پھر جب ہلکے ہوں گے وہ تو پانی کے اوپر ہی اوپر تیرتے رہیں گے اور بھاری ڈوب جائیں گے بس اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے۔"

"مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، اچھے انڈے ہلکے ہوتے ہیں اور یا بھاری؟"

اور اس وقت میں بھول جاتا ہوں کہ اچھے انڈے ڈوبا کرتے ہیں یا بُرے، لیکن عین اس وقت ایک خیال میری مدد کو آ موجود ہوتا ہے، عام طور پر انڈوں میں اچھے زیادہ ہوتے ہیں اور بُرے کم، اور اسی لئے میں کہتا ہوں، "اگر زیادہ انڈے ڈوب جائیں تو سمجھو ڈوبنے والے اچھے ہیں، اور اگر زیادہ انڈے تیرتے رہیں تو سمجھو کہ وہی اچھے ہیں۔ یہاں بھی اکثریت ہی کا بول بالا ہے، سیاست کی طرح۔"

اپورب سمجھتا ہے کہ میں نے اپنی بات میں لطیفے کا انداز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے وہ ہنسنے لگتا ہے اور میں سوچتا ہوں مگر اب کے جلد ہی جیسے نیندوں کے سمندر کا آخری سرا آ جاتا ہے۔ ادھورے خوابوں کے ٹکڑے ذہن کی جھولی سے گرنے لگتے ہیں۔ اور غنودگی میں کہی سنی جانے والی باتوں کا لطف چھیننے کے لمحے آ پہنچتے ہیں۔ صبح آ رہی ہوتی ہے "صبح ہونے والی ہے۔"

"ہاں! صبح ہونے والی ہے" اپورب کہتا ہے اور پھر کوئی اور بات چھیڑ دیتا ہے، کوئی ملیمی سی بات، سرینگر کی بات، اپنے گھر کی بات یا اپنی بیوی کی بات، جسے ہمیشہ اس سے

زیادہ ہو گیا، اور ہم گھر نہیں جا سکتا۔"

اب پورب بابا میں۔ کبھی وہ اور کبھی میں اسے سمجھاتے ہیں کہ اس میں کسی مائی باپ کی زیادتی نہیں ہے، بلکہ زیادتی صرف بانہال کی برف کی ہے، جس نے راستہ بند کر دیا ہے۔

"تم دیکھتے نہیں کہ اس راستہ کے بند ہونے سے ہندوستانی سپاہیوں کو بھی کتنا نقصان ہو رہا ہے، جموں اور راوڑی الگ ہو گئے ہیں اور راوڑی کے محاذ پر ہم کچھ بھی نہیں بھیج سکتے، نہ زخمیوں کے لئے دوائی، نہ لڑنے والوں کے لئے خوراک اور نہ ہی کوئی کمک۔"

"یہ سب ٹھیک ہے صاحب، پر ہم اب بہت تنگ آ گیا ہے" — اور پھر کچھ اس انداز میں جیسے وہ آج اپنے دل کی بہت سی باتیں کہنے کا عزم لے کے آیا ہے وہ آہستہ آہستہ کہنے لگتا ہے: "صاب! برف کا یہ سب تکلیف، ہندوستان کے فوج کی وجہ سے ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں اور پورب دونوں چونک پڑتے ہیں اور "عرض رپورٹ کرنے والا ہوم گارڈ" اب ایک بہت بڑے سیاست دان کی مانند، اپنے چہرے کو بالکل غیر جذباتی بنائے بڑے سکون سے کہتا ہے: "صاب! اس بانہال میں ہندوستانی فوج نے بہت ظلم کیا۔ پہلے جو پٹیالہ کا رجمنٹ تھا، وہ مسلمان گھروں میں جا کے عورتوں کو بے پردہ کر دیتا تھا اور نشانہ پکا کرنے کے لئے، ہر وقت راہ گذر لوگوں پر گولی چلاتا رہتا تھا۔ اور اب جو ملٹری آیا ہے وہ شراب بہت پیتا ہے، ہر وقت نشہ میں گٹ رہتا ہے، اس لئے پیر پنچال ان پر ناراض ہے، اور اس نے ان کا اسی واسطے راستہ بند کر دیا ہے۔" اور پھر وہ دفعتہً جذباتی بن جاتا ہے "ہائے شیر کشمیر ہمارا مائی باپ ہے، مگر اس نے کیا کر دیا، وہ ان کو یہاں کشمیر میں کیوں لایا، اب ہمارا بھی راستہ بند ہو گیا ہے۔ اور یہ پیر پنچال ابھی اور بھی عذاب لائیں گا، توبہ! توبہ! صد بار توبہ" اور اس کی انگلیاں کانوں پر جا لگتی ہیں، اور اس کے بعد وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ وہ ہوم گارڈ

یہی شکوہ رہا کہ وہ صبح دیر سے اٹھتا ہے "ارے کاش! وہ بانہال میں آکر دیکھے، جہاں میں منہ اندھیرے ہی جاگ اٹھتا ہوں، بلکہ ساری رات ہی جاگتا رہتا ہوں" اور پھر وہ گنگنانے لگتا ہے "جتنی لمبی برہا کی گھڑیاں اتنے لمبے بال۔۔۔" اور اس کے بعد اسے بھیرویں سُر کا خیال آ جاتا ہے، اور اپنے دادا جان یاد آ جاتے ہیں، جو نوے برس کی عمر میں، جب پنچم سُر کے لئے آواز کو اونچا کرتے تھے، تو ان کی آواز پھٹ جاتی تھی اور بے بس ہو کر وہ رونے لگتے تھے اور ان کے سارے پوتے ہنسنے لگتے تھے۔ "گندے انڈے" پورب زیرِ لب کہتا ہے، شاید اسی پرانی بات پر اسے اب غم ہو رہا ہے، اور پھر وہ شاید بات بدلنے کے لئے کسی فقہ کالمسٹ کی بات چھیڑ دیتا ہے اور اس وقت مجھے پتہ چلتا ہے کہ رات کو گندے انڈے اسے کیوں پریشان کر رہے تھے؟

صبح ہمارے لئے تو بہت جلد آ جاتی ہے، لیکن ہمارے پڑوسی کمرے والوں کے لئے اور اُن کے لئے جو ہمیں چائے دیتے ہیں، صبح، بڑی دیر میں آتی ہے، اپنی صبح اور ان کی صبح کے درمیانی لمحات میں ہم بے ربط سی باتیں کرتے ہوئے چائے کا انتظار کرتے رہتے ہیں، یا کبھی "ہوم گارڈز" کی باتیں سنتے رہتے ہیں جو صبح صبح ہی عرض رپورٹ کرنے کے لئے آ موجود ہوتا ہے

"صاحب! ہم کچھ عرض رپورٹ کرنے کے لئے آیا ہے" وہ فوجی سلام کے بعد تن کر کہتا ہے

"کہو"

"صاب! اب ہم تنگ آ گیا ہے"

"پھر"

"صاب! شیخ عبداللہ ہمارا مائی باپ ہے، بخشی غلام محمد بھی ہمارا مائی باپ ہے، آپ لوگ بھی ہمارا مائی باپ ہے، مگر ہم نے یہ ظلم کہیں نہیں دیکھا کہ ہم کو پردیس میں ایک مہینہ سے

ہے اور اسے جانے سے پہلے تن کر ایک فوجی سلام کرتا ہے، وہ چپ چاپ دروازے سے باہر نکل جاتا ہے اور جاتے جاتے دروازہ بند کرنا بھی بھول جاتا ہے۔

میں سوچتا ہوں، اپورب اب کہے گا "گندہ انڈہ" آخر وہ گندے انڈوں اور فقہد کا مسلموں کی سی ہی باتیں کر رہا تھا نا! — مگر اپورب نہیں کہتا۔ وہ اس بات پر بھی نہیں جھنجھلاتا کہ وہ دروازہ کھلا چھوڑ گیا ہے، اور سرد ہوائیں اندر آرہی ہیں، اور ہم ٹھٹھرنے لگے ہیں۔ وہ خاموش جیسے کسی گہری سوچ میں جا پڑتا ہے، جیسے توڑنے کی ہمیں اپنے میں بالکل ہمت نہیں رہا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسے وقت میں عام طور پر اپنے آپ کو "حاضر نوکری" ثابت کرنے کے لئے کوئی اور ہوم گارڈ آجاتا ہے، اور ہمارے ذہنوں پر چھا جانے والے بادل جیسے کسی ہوا کے جھونکے سے اِدھر اُدھر بکھر جاتے ہیں۔

"صاب! یہ دیکھو، ہمارا ماں کا خط ہے"۔ نو وارد آتے ہی ہمارے ہاتھ میں ایک میلا کچیلا مڑا تڑا کارڈ تھما دیتا ہے، جس پر طول و طویل منزلوں، اور اِدھر اُدھر کی گھوما پھیری کے آثار صاف نظر آتے ہوتے ہیں۔ خط کے حروف قریب قریب بجھے سے ہوتے ہیں۔ پھر بھی ان حروف میں چھپی ہوئی کوئی آواز صاف کہتی معلوم ہوتی ہے۔ "میں تمہارے لئے مر رہی ہوں"۔ "خدا کے لئے گھر جلد آؤ" — اور اس کے ساتھ ساتھ کارڈ لانے والے کی زبان بھی کھل جاتی ہے۔ "قسم خدا کا صاب! جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ ہمارا ماں کا خط ہے۔ وہ ہمارا واسطے مرنے کو تیار ہے"۔ اور پھر ٹھوڑی کی طرف ہاتھ بڑھے گا، آنکھیں بھی التجا کریں گی اور زبان اور بھی زیادہ کھل جائیگی۔

"صاب! ہم کو معلوم ہے، ہمارا گھر میں نہ نمک ہے، نہ چائے ہے، اور ہم بھی نہیں ہے تو ہمارا ماں کیسے زندہ رہیں گا، وہ مر جائیں گا"۔ اور اس کے بعد آہستہ آہستہ یہ ہوم گارڈ جذباتی نہیں رہتا، بلکہ ایک پُرسکون سیاست دان بن جاتا ہے۔ "صاب! پنڈت جواہر لال نہرو

نے خود شیرِ کشمیر سے بولا تھا کہ وہ ہندوستان سے کشمیر میں نمک بھی بھیج دے گا اور چائے بھی مگر اُس نے ابھی تک نہیں بھیجا" — اور پھر جیسے کچھ سوچ کر، اپنی سیاست میں ایک اور نکتہ کا بھی اضافہ کر لیتا ہے۔ "جناب! نہرو ہمارے شیرِ کشمیر کا بہت دوست ہے، مگر وہ بھی کیا کریں، پنڈی والا سڑک جب تک نہیں کھلتا، نمک اور چائے کیسے آسکیں گا......"

اور اب اپورب کا پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا ہے اور اسے "کم علمی ہمیشہ خطرناک ہوتی ہے" والی انگریزی کہاوت کا نہایت واضح پرتو، اس ہوم گارڈ کی عوامی سیاست دانی میں نظر آتا ہے۔ "کہیں یہ بھی گندہ انڈا تو نہیں بن رہا؟ کم بخت پنڈی کی سڑک کو اتنی اہمیت دے رہا ہے اور نہیں سمجھتا کہ اس کی حد پاکستان سے ملتی ہے جس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں"۔ چنانچہ اب اپورب اُسے سمجھانے لگتا ہے کہ پنڈی کی سڑک ایک ذلیل فرقہ وارانہ سڑک ہے جس کی آخری منزل وہ ہے جہاں رجعت پسندی کا گڑھ ہے اور جہاں پاکستان ہے۔ اس لئے اصل سڑک تو وہ ہے جو جموں سے کٹھوعہ اور کٹھوعہ سے پٹھان کوٹ پہنچ کر کشمیر کو ہندوستان سے جا ملاتی ہے، وہاں بقول شیرِ کشمیر دو قوموں والی تھیوری بھی نہیں ملتی"۔

فرقہ داری، رجعت پسندی اور دو قوموں والی تھیوری۔ نجانے ہوم گارڈ یہ سب کچھ سمجھتا بھی ہے یا نہیں، مگر اس کی سیدھی سادی سیاست دانی اب بھی خاموش نہیں رہتی۔ "پر جناب وہ تو بہت لمبا سڑک ہے۔ اور پھر راستے میں نالے ہوئیں گا، ندیاں ہوئیں گا، اور سب سے بڑھ کر یہ بانہال ہوئیں گا، جو سردیوں میں تو بند ہوئیں گا ہی، گرمیوں میں بھی کبھی کبھی راستہ روک لیں گا، اس لئے جناب، نمک، پنڈی کی سڑک ہی سے کشمیر میں جلدی پہنچتا ہے"۔

اپورب اب واقعی چپ کر رہ جاتا ہے، اور میرا جی چاہتا ہے میں مسکراؤں، مگر میں مسکراتا نہیں، کون جانے میری مسکراہٹ میں اپورب کو کوئی ایسا عنصر نظر آجائے، جو گندے انڈے

میں ہوتا ہے اور وہ اور زیادہ دکھی ہو جائے۔ اس لئے میں نہیں مسکراتا۔

کبھی کبھی کسی صبح کو ہمارے کمرے میں ترسل بھی آجاتا ہے۔ اپنی بیزاری کو اپنی قوم کی روایتی گھبیرتا کے پردے میں چھپائے۔ اصل میں وہ بھی اپنی ذہنی کوفت کے لئے تھپکیوں کی تلاش میں آتا ہے تھپکیوں کی یہ لہریں وہ خود فریبی کے گہرے سمندر سے لیتا ہے اور اپنی آسودگی کا مداوا اپنے ماضی کے ان کارناموں کے تذکروں میں ڈھونڈھتا ہے جو پچھلے دنوں ہوم گارڈز کے ایک کمانڈر کی حیثیت میں اُس نے چھنبنی کے علاقے میں سرانجام دیئے تھے۔۔۔"

"ہم چھنبنی گئے اور پھر مست بھی گئے، جہاں برف ہی برف تھی، جہاں ہر وقت کٹھ کشو لگا رہتا ہے اور جہاں سُورج نکلتا ہی نہیں۔ ہمیشہ چاندنی راتوں کا سا عالم رہتا ہے۔ دھندلی دھندلی روشنی، نم فضا اور بے حد ٹھنڈ، اور جہاں۔۔۔۔۔۔۔۔" اور سرینگر خاص کے رہنے والے ترسل کا یہ بیان، کیپٹن اسکاٹ کے کسی ایسے بھائی کا بیان معلوم ہونے لگتا ہے، جو قطبین سے ہو کر آرہا ہو، اور قطبین جانے سے پہلے، جس نے اپنی ساری عمر راجپوتانے کے گرم اور تپتے صحراؤں میں گذاری ہو۔ جہاں اُس نے برف کا کبھی نام تک نہ سنا ہو۔ باتیں کرتے وقت ترسل کا چہرہ کئی رُوپ بدلتا ہے، اب آنکھیں جھپک رہی ہیں۔ اب اوپر کا ہونٹ نیچے کے ہونٹ کو کاٹنے لگا ہے۔ اب اس کا دایاں کندھا جھٹکے کھا رہا ہے اور اب بایاں۔ اور اب اس کی دھبی ٹوپی جیسے پھدک کر سارے سر کو ننگا چھوڑ کر کھوپڑی کے پچھلے حصے کے ساتھ یوں جا چمٹتی ہے، جیسے اب پیچھے کی طرف گری کہ گری۔ اور اب میں اس کی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہوئی اداؤں کو دیکھتے ہوئے، اس کی بیوی کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں۔ جس کو بیاہ کے ساتویں دن بعد ہی ترسل کو سرینگر اس لئے چھوڑنا پڑا تھا کہ وہ ہوم گارڈز کا ممبر بن چکا تھا اور اسے فوری طور پر جموں کے صوبہ میں جا کے نیشنل کانفرنس کا پرچار کرنا تھا۔ اب مجھے دفعتہً یہ خیال آنے

لگا ہے کہ ترسل کی بیوی آج کل کیا سوچ رہی ہو گی؟ اس نیشنل کانفرنس کی خاطر جو سرینگر والوں کو نمک اور چائے تک نہیں دے سکتی، اپنے خاوند کی اس قربانی کو وہ کس نظر سے دیکھ رہی ہو گی، اور کیا ترسل کو اپنی بیوی کبھی یاد نہیں آتی؟

مگر ترسل اپنے دل کی بات کبھی نہیں کرتا، وہ بے حد باتیں کرتا ہے، پھر بھی بہت کچھ چھپا لیتا ہے۔ وہ آپ کو یہ تو بتائے گا کہ جن علاقوں سے وہ ہو کے آیا ہے، وہاں پچھلے فساد کے دنوں میں نیشنل کانفرنس کے پرانے سارے ہندو کارکن، ڈوگرہ سپاہیوں اور سنگھ والوں کے ساتھ مل کر اپنے مسلمان کامریڈوں کے خُون ہی کی ہولی کھیلنے لگ گئے تھے، مگر یہ کبھی نہیں کہے گا کہ جن لوگوں کو وہ اب نیشنلسٹ بنا کے آیا ہے، ان کے متعلق بھی اسے شبہ ہے کہ وقت آنے پر وہ اپنے سیاسی عقیدے کے امتحان میں پورے نہ اتر سکیں گے، کیونکہ صدیوں سے رگ رگ میں رچے ہوئے دو تمدن ہندو اور مسلمانوں کو الگ الگ کھڑا کر دیں گے اور عمل کے میدان میں بھائی چارے کے کاغذی اصول کو حقیقت کی بے رحم آندھی اڑا کے دُور کہیں پھینک دے گی۔ اسی طرح ترسل آپ کو یہ تو بتا دے گا کہ چھنبنی کا نیشنلسٹ لیڈر شفیع فساد کے دنوں میں اپنی جان بچا کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس لئے وہ وہاں صرف نیشنل کانفرنس کے سیکرٹری شرما ہی سے مل سکا تھا اور اس کے ہاں ہی کھانا کھاتا رہا تھا اور یہ کہ جن پلیٹوں میں وہ کھانا کھایا کرتا تھا، ان میں سے اکثر پر اُس نے شفیع کا نام کھدا ہوا دیکھا تھا، مگر وہ آپ سے یہ کبھی نہیں کہے گا کہ ان پلیٹوں کے علاوہ اس نے وہاں اور بھی بہت سی ایسی چیزیں دیکھی تھیں جنہیں دیکھنے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ شفیع کے گھر کی لوٹ میں اس کا کامریڈ شرما بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ اسی طرح ترسل سے اگر آپ یہ پوچھیں کہ اپنی شادی کے ساتویں دن بعد ہی اپنی بیوی کو تنہا چھوڑ کے میلوں دور گاؤں گاؤں کی ٹھوکریں کھانا اس نے کیوں پسند کیا؟

تو وہ جواب میں کچھ ایسے جملے کہے گا جن سے آپ یہ مطلب لیں گے جیسے یہ سب کچھ محبت اور فرض کی کش مکش کا کرشمہ ہے اور یہ کہ اس نے اپنے رویّے سے ثابت کرنا چاہا تھا کہ محبت اور فرض کی وہ ساری کہانیاں سچّی ہیں جن میں محبّت کے مقابلے میں فرض کی جیت ہوتی ہے۔ مگر وہ آپ سے یہ کبھی نہیں کہے گا کہ اس کی ان ٹھوکروں کی جڑیں، اندر ہی اندر اس کے اُن سیب کے باغوں سے جا ملتی ہیں جن کے سیب اس سال سرینگر میں ہی سڑ رہے ہیں۔ کیونکہ پنڈی والی سڑک جس سے وہ باہر جایا کرتے تھے اور اس کے گھر میں راحتوں کے انبار سکوں کے رُوپ میں لایا کرتے تھے، بند ہو چکی ہے۔ ہمیں پاکستان کے خلاف کر دیا گیا ہے۔ اور ہمارا ایمان محبّت ہندوستان سے بندھ چکا ہے۔ اور کٹھوعہ، پٹھان کوٹ روڈ اگرچہ بڑی اچھی ہے۔ کیونکہ وہ ہمیں ہندوستان سے ملاتی ہے، مگر اس کے باوجود، اس کے طویل فاصلے سیبوں کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ وہ آپ کو یہ بھی نہیں بتائے گا کہ بیاہ سے پہلے جب اس نے اپنی بیاہتا زندگی کے خواب تعمیر کئے تھے تو ان خوابوں میں اس کے سیب کے باغوں کی لطافتیں شامل تھیں۔ ان کے شگوفوں کی خوشبوئیں تھیں اور ان خوشبوؤں سے بھرپور ہواؤں کے جھونکے بھی تھے یہی وجہ تھی کہ جب اس نے اس زندگی کی دہلیز پر قدم رکھا اور اس نے دیکھا کہ عین اُس وقت ہی یہ لطافتیں کھونے کو ہیں اور کٹھوعہ، پٹھان کوٹ روڈ میں اس کے خوابوں کو سہارا دینے کی کوئی سکت نہیں تو اس نے ہوم گارڈز میں بھرتی ہو کر اپنے ڈگمگاتے ہوئے مستقبل کو سنبھالنا چاہا اور یُوں اپنے دل پر پتھر رکھ کر اُن راحتوں کو اپنانے کی خاطر اپنا گھر چھوڑ دیا۔ جو اگرچہ وصلِ محبوب کی طرح شیریں نہیں ہوتیں مگر جن کے بغیر وصلِ محبوب شیریں نہیں بنا کرتا۔ وہ جذباتی نہ تھا اور اُس کی حقیقت پرستی اُسے کہتی تھی کہ وصل کی راحت کا انحصار، سراسر دوسری راحتوں پر ہے اور جب پیٹ بھوکا ہو اور جیبیں خالی ہوں تو خواہ سات دنوں کی بیاہتا بیوی کی محبت ہی کیوں نہ ہو،

اس میں بال آجاتا ہے اور آہستہ آہستہ یہ کھوکھلی ہونے لگتی ہے۔ اور نرسل نے اس سب کچھ پر غور کر کے چپ چاپ غم کی سل اپنی چھاتی پر رکھ لی اور ہوم گارڈز کے ساتھ ہو گیا۔ شاید سیبوں کے کھو جانے کے بعد اب اس کا مستقبل اسی طرح درخشاں ہو جائے۔ اس کی جیبیں ہلکی ہونے سے بچ جائیں، اور زندگی کے اس جُوئے میں وہ کامیاب رہے۔ شاید اسی طرح پنڈی روڈ اور کٹھوعہ روڈ کے سیاسی ٹکراؤ سے، سرینگر میں جو اقتصادی آگ بھڑک رہی ہے اور جو ابھی اور بھڑکے گی، وہ اس کے شعلوں سے محفوظ رہ سکے اور اس کی بیوی کی محبت کا چراغ زمانے کی تیز و تُند ہواؤں سے محفوظ رہ سکے۔ نرسل دن رات یہ سوچے گا مگر آپ سے یہ کبھی نہیں کہے گا وہ بے حد باتیں کرتا ہے مگر اپنے دِل کی بات کبھی نہیں بتاتا۔

جانے کے بعد ہم امین صاحب کے کمرے کا رُخ کرتے ہیں جو یہاں کے ایمرجنسی آفیسر ہیں نیشنل کانفرنس کے یہاں واحد نمائندہ ہیں اور جن کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کو سارا دن یہ یقین دلاتے رہیں کہ نیشنل کانفرنس کشمیر کے ۴۰ لاکھ باشندوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اس کے صدر شیخ عبداللہ ہیں، جو یہاں کے واحد قائدِ اعظم ہیں اور پنڈت نہرو کے سب سے بڑے دوست بھی، اور پنڈت نہرو ہندوستان کے سب سے بڑے وزیر ہیں اور ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا امیر ملک ہے اور پاکستان سب سے غریب اور بانہال کے سارے لوگ بے وقوف ہیں جو یہ بات نہیں سمجھ سکے "بولو، اب سمجھے کہ نہیں"

لیکن جب سے امین صاحب آئے ہوئے ہیں۔ بانہال کے سب لوگ یہ ساری باتیں سمجھ گئے ہیں اور اب مزید سمجھنے کے لئے امین صاحب کے کمرے میں باقاعدگی سے آتے رہتے ہیں امین صاحب کا کمرہ بانہال کی دنیا کا محور ہے جس کے گرد یہاں کے لوگوں کا سارا دکھ سکھ گھومتا ہے یہیں امین صاحب کے دربارِ عام لگتے ہیں اور دربارِ خاص بھی یہیں ان لوگوں کی سیاست

پرکھی جاتی ہے اور پھر ان کا نصیبہ جاگتا ہے یا سوتا ہے۔ اور یہیں اس امید پر کہ ان کا نصیبہ جاگتا رہے، بانہال کا ہر شخص آتا ہے۔ یہاں محمد دین دکاندار بھی آتا ہے۔ مکئی کی روٹیاں اور شہد لئے اور اپنے نصیب کی سلامتی کے لئے، اپنی خوشامدانہ گفتگو کا سہارا لئے .... "جناب! یہ بانہال کا تحفہ چیز تھا۔ ہمارا بی بی روز بولتا تھا ہم جناب کی خدمت میں یہ پیش کرے، مگر جناب ہم خود قصوروار تھا۔ تاخیر کر دیتا تھا۔ اب جناب یہ نوش کرے ...." اور یہاں رحیم ڈار بھی آتا ہے بظاہر "جناب امین صاحب کا زیارت کا واسطے" لیکن دراصل باتوں باتوں میں یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ نیشنل کانفرنس کا اخبار "خدمت" اس کا سب سے محبوب اخبار ہے اور اگر کسی زمانے میں وہ مسلم کانفرنسی اخبار "جاوید" پڑھا کرتا تھا تو وہ اس کی سب سے بڑی غلطی تھی "جناب وُہ وقت اور تھا۔ ہم ظلمات میں تھا۔ اب ہم نے جاوید کا پرانا سارا فائل آگ میں ڈال دیا ہے" لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے "جاوید" کا فائل ہرگز ہرگز آگ میں نہیں ڈالا۔ بلکہ جب اس کی بیوی نے نئی سیاسی ہوائیں دیکھ کر اس ڈر سے کہ کہیں دوسرے مسلم کانفرنسیوں کی طرح اس کے خاوند کو بھی قید نہ کر لیا جائے۔ "جاوید" کے پرچوں کو جلا دینے کا مشورہ دیا تھا تو بھی وہ نہ مانا تھا "پگلی دن ایک جیسے نہیں رہتے اور پھر "جاوید" کو جلا ڈالوں جو میری جان ہے تو دیکھتی رہ۔ اس چیتھڑے "خدمت" کی باتیں کر کر کے اس چھوکرے "امین" کو یوں قابو میں رکھوں گا کہ میری طرف وہ نظر اٹھا کر نہ دیکھ سکے گا" ـــــــ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ امین صاحب بانہال میں سب سے زیادہ قائل اسی رحیم ڈار کے ہیں "کتنی محبت ہو گئی ہے اسے نیشنل کانفرنس سے؟ اور پھر وہ خود کہتا ہے کہ آج تک وہ صرف تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھتا رہا تھا ورنہ وہ کبھی کا نیشنلسٹ بن چکا ہوتا" امین صاحب لوگوں کے سامنے رحیم ڈار کے متعلق اکثر یہ کہا کرتے ہیں۔

امین صاحب کے کمرے میں افضل اخیر بھی آتا ہے۔ اگر برف بند ہو تو اسے مثل کی جانب راستہ کھلوانے کے لئے جانا چاہیئے لیکن اگر برف باری ہو رہی ہو تو؟ ـــــــ چونکہ عام طور پر برف باری ہوتی رہتی ہے اسی لئے وہ صبح سویرے ڈاک بنگلے کے برآمدے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اور دوسرے سرے سے اس سرے تک پانچ چھ چکر لگا کر صبح کی سیر قسم کی کوئی چیز کرتا ہے اور اس کے بعد امین صاحب کے کمرے میں آکر جیسے "اون ڈیوٹی" ہو جاتا ہے، وہ سارا دن وہاں کمبل اوڑھے بیٹھا رہتا ہے اور امین صاحب کو دیکھتا رہتا ہے۔ اب امین صاحب مسکرا رہے ہیں اور اس لئے وہ بھی مسکرا رہا ہے اور اب امین صاحب کو کسی پر غصّہ آگیا ہے اب افضل کیا کرے؟ اور اب افضل چُپ چاپ اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو گھما گھما کر بیگ کی طرف دیکھنے لگتا ہے جو امین صاحب کا باڈی گارڈ ہے اور جو اس سردی کے عالم میں بھی اپنی قمیص کی آستینیں چڑھائے اور آنکھوں اور پیشانی کی تیوریوں میں ایک غیر معمولی سا ربط باہمی پیدا کئے امین صاحب کے پاس بیٹھ کر جیسے ہر ایک کو "بزبان حال" یہ بتاتا رہتا ہے کہ وہ کوئی ایسا ویسا نہیں، بلکہ بہت کچھ ہے۔ جب امین صاحب غصّے میں ہوں تو سب سے پہلے افضل اُس پر ایمان لاتا ہے "بیگ واقعی بہت کچھ ہے" اور افضل کی ساری توجہ اور سارے انہماک کا مرکز بیگ بن جاتا ہے جو یُوں پینترے بدل رہا ہوتا ہے جیسے ابھی امین صاحب کو اپنے غصے کو عملی صورت دینے کی ضرورت پڑی اور ابھی اُس کا ہاتھ اٹھا۔ اگر یہ ہاتھ اٹھ گیا تو پھر کیا ہو گا؟ اور ایسے وقت میں افضل کے فرائض کیا ہونے چاہئیں؟ وہ کام جس کے لئے افضل کو یہاں بھیجا گیا تھا اُس سے نہیں ہو سکا، اور اگرچہ اس کے نہ ہونے میں اس سے زیادہ برفانی موسم کا قصور ہے، تاہم اسے یہ ڈر کھائے جا رہا ہے کہ کہیں اسی وجہ سے ہی اسے ناکارہ نہ سمجھ لیا جائے، چنانچہ امین صاحب کے کمرے میں ہر لمحے وہ یہی سوچتا رہتا ہے "اب میں کیا کروں؟ اب میرا فرض کیا ہونا چاہیئے؟" یہ دوسری بات ہے کہ ہر شام کو جب وہ اپنے کمرے میں جاتا ہے تو اس کی تسلّی

کے لئے صرف یہ ایک خیال ہوتا ہے کہ کم از کم وہ سارا دن امین صاحب کی آنکھوں کے سامنے تو رہا ہے "آن ڈیوٹی"۔ اور اگر وہ برف صاف کرنے والے مزدوروں کو کام پر دیکھنے نہیں گیا تو اپنے کمرے میں آرام سے بھی تو نہیں بیٹھا۔

امین صاحب کے کمرے میں لوگوں کی آمد اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جب وہ دن میں پہلی مرتبہ اپنے زخمی ہاتھ پر پٹی بندھوا رہے ہوتے ہیں۔ اسی لئے باتیں پٹی ہی سے چلتی ہیں۔ سب سے پہلے امین صاحب اپنے ملاقاتیوں کا خیر مقدم ایک نہایت میٹھی مسکراہٹ سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد پٹی بندھواتے بندھواتے وہ ایک مرتبہ جب اپنے چہرے کو بیحد تکلیف زدہ بنانے اور اپنے دانتوں میں اپنی زبان کو دبانے کے بعد، وہ دیکھتے ہیں کہ کمرے میں بیٹھے ہوئے سارے لوگ بھی ان کی اس تکلیف میں شامل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اور ماحول ذرا غمگین سا ہو رہا ہے تو مزید خوش اخلاقی کے طور پر اور "معذرت" کے طور پر وہ اس پٹی کی "شان نزول" سنانے لگتے ہیں۔

روایت یوں چلتی ہے کہ ایک پولیس والا تھا، اور وہ پولیس والا یہاں بانہال کی بستی میں الٹ شنٹ خبریں سنا کر لوگوں میں انتشار پھیلایا کرتا تھا۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ امین صاحب کو پتہ چل گیا اور پھر ایک دن جبکہ وہ ان کے کمرے میں آیا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے دیکھتے اور اس کی باتیں سنتے سنتے امین صاحب کو اس پر دفعتہً غصہ آگیا، اور جب یہ غصہ آیا تو وہ اپنے آپے میں نہ رہے اور مجبور ہو گئے کہ اسے ماریں اور جب انہوں نے اسے مارا تو اتفاق ایسا ہوا کہ وہ بدبخت تو ویسے کا ویسا رہا اور الٹا امین صاحب کا وہ ہاتھ جس سے وہ اسے مار رہے تھے، زخمی ہو گیا ___

اور اب اس زخمی ہاتھ پر پٹی بندھواتے ہوئے امین صاحب کہتے ہیں "کیا کروں۔ جیل نے بہت کمزور کر دیا ہے۔ یہ سب جیل کی کارستانیاں ہیں۔ جیل میں ہمیں سڑے ہوئے چاول ملتے تھے اور.........."

اور اب وہ اپنے ملاقاتیوں پر یہ واضح کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ وہ یونہی ایمرجنسی آفیسر نہیں بنے بلکہ اس منزل پر پہنچنے کے لئے انہیں بڑی بڑی قربانیاں دینا پڑی ہیں۔ جیل میں رہنا پڑا ہے۔ سڑے ہوئے چاول کھانے پڑے ہیں اور اس حد تک کمزور و ناتواں ہونا پڑا ہے کہ اب وہ کسی کو زخمی کرتے کرتے خود زخمی ہو جاتے ہیں اور اپنے ہاتھ کو سہلا لیتے ہیں۔

اور پھر شاید اس خیال سے کہ لیڈروں کی طرح انہیں بھی اپنی قربانیوں پر فخر کرنا چاہیئے اُن کے چہرے پر ایک فخریہ مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے اور وہ خالص لیڈرانہ انداز میں باتیں کرنے لگتے ہیں "......پر مجھے اس کا ذرہ بھی غم نہیں، آخر یہ ہماری ان ریاضتوں ہی کا نتیجہ ہے جو اب ہم آزادی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے ہیں۔ ہمارا کشمیر اب آزاد ہونے کو ہے اور ہندوستانی فوجیں جو یہ آزادی دلوانے کے لئے ہمارے ہاں آکر لڑ رہی ہیں اور........"

اور یہ سنتے سنتے میں الورب کے چہرے کی طرف دیکھنے لگتا ہوں، کہیں اس وقت فردوس کے رسیا الورب کو کوئی شعر تو نہیں یاد آ رہا۔ اقبال نے کہا تھا ___

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

کہیں الورب کو بھی یہ آزادی اور یہ پادشاہی، جسے ہم اپنے لہو سے نہیں، بلکہ ہندوستانی سپاہیوں کے لہو سے حاصل کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں ننگ تو نظر نہیں آ رہی، کہیں اسے بھی یہ سب کچھ فریب تو نظر نہیں آ رہا۔ اسے یہ شعر تو نہیں یاد آ رہا؟

لیکن الورب کو یہ شعر غالباً اس وقت یاد نہیں آتا۔ الورب کو ایسے وقتوں میں عام طور پر کوئی نہ کوئی شعر یاد آیا کرتا ہے۔ اور یوں بھی وہ اقبال کا بڑا مداح ہے، مگر چونکہ اس شعر میں اقبال نے "مسلمان" کا لفظ استعمال کیا ہے، اسی لئے اسے یہ شعر یاد نہیں آسکتا، وہ کمیونسٹ ہے اور

اس لئے اسے اس کی اٹل حقیقت والی بنیاد نظر نہیں آئے گی۔ اس میں اسے طبقاتی نظام کی بو آئے گی۔ اس لئے اُسے یہ شعر کبھی یاد نہیں آئے گا۔ اور امین صاحب کو تو خیر یوں بھی شعر یاد نہیں آتے اور پھر یہ شعر تو امین نے بھی بھلانے کے قابل ہے۔ کہ اس سے دو قوموں کی تھیوری کا خیال آتا ہے۔ جس کا خیال آنا ہی نیشنل کانفرنس کی تعزیرات میں گناہِ کبیرہ ہے۔ اس لئے نہیں یہ شعر ہرگز یاد نہیں آتا۔ اور وہ کہے جاتے ہیں...... "یہ لڑائی جو ہم لڑ رہے ہیں عوام کی لڑائی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم پر کوئی غیر حکومت کرے"...... اور اس وقت انہیں کوئی نہیں کہتا کہ عوام کی اس لڑائی میں عوام میں سے کتنے محاذ پر ہیں؟ اور کیا پٹھانکوٹ پار کے رہنے والے یہ ہندوستانی سپاہی غیر نہیں اور کیا یہ سپاہی یہاں صرف خدا واسطے لڑنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ لڑائی کے بعد اگر یہ جیت گئے تو کیا، ملک ہمارے حوالے کر کے چپ چاپ واپس چلے جائیں گے؟ مگر یہ بات کوئی نہیں کہتا۔ یہ بات کوئی نہیں کہہ سکتا۔

اس لئے سب چپ چاپ سنتے رہتے ہیں۔ اور امین صاحب کہتے جاتے ہیں......

"جب لڑائی ختم ہو جائے گی اور ہم ایک آزاد قوم ہوں گے تو اس وقت ہم یہ فیصلہ کریں گے کہ ہمیں ہندوستان کے ساتھ شامل ہونا ہے یا پاکستان کے ساتھ؟"...... اور اس وقت ایوب کمرے میں بیٹھے ہوؤں پر ایک نگاہ ڈالتا ہے۔ شکر ہے یہاں کوئی ہندوستانی سپاہی نہیں ہے ورنہ امین صاحب کی اس آخری بات پر وہ ضرور ہی تلملا اٹھتا۔

ایوب کو یہ بات کبھی نہیں بھولتی کہ ایک دن جب اُن کے پاس صوبیدار بے لال بیٹھا ہوا تھا اور انہوں نے یہی بات کہی تھی تو اس نے بہت برا منایا تھا اور کہا تھا کہ "امین صاحب! تو اس کا مطلب یہ ہوا نا کہ ہم ہندوستانی یہاں خواہ مخواہ قربانی کے بکرے بنے ہوئے ہیں اور آپ کے جھنڈے پر ہل کا نشان یونہی ہے۔ ورنہ اصل میں وہاں ترازو کا نشان ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ ابھی تو آپ

کو بنیئے کی طرح ہمیں بعد میں تولنا ہے"......... اور صوبیدار بے لال اتنا ناراض ہو گیا تھا کہ اگر ایوب درمیان میں آکر اپنی ذہانت سے اُس کو ٹھنڈا نہ کرتا تو نہ جانے کیا ہوتا، توبہ! امین صاحب بعض دفعہ کتنی غیر ذمہ دارانہ باتیں کر جاتے ہیں۔

امین صاحب اگرچہ باتیں ایسی ہی کرتے ہیں مگر ہیں وہ بہت اچھے، اور انہیں دیکھ کر ایوب کو ہمیشہ تاریخِ ہند کا نیک دل بادشاہ ناصر الدین یاد آ جاتا ہے۔ امین صاحب کو بتایا گیا ہے کہ اگر وہ اپنے سوجے ہوئے ہاتھ پر گرم گرم نمک کی ٹکور کریں تو مفید ہوگا۔ مگر وہ مدتوں صرف اس لئے اس علاج کے خلاف رہے کہ اس طرح استعمال کیا ہوا نمک بعد میں کھایا نہیں جا سکے گا۔ اس لئے وہ ضائع ہو جائیگا۔ اور وہ نمک جو پنڈی روڈ کے بند ہو جانے سے یوں بھی ہمارے پاس بہت کم آتا ہے اور بھی کم ہو جائیگا۔ اور امین صاحب نے یہ علاج اس وقت تک نہیں کیا جب تک کہ انہیں محمد دین دوکاندار نے اپنے کوٹے میں سے اتنا نمک بطور تحفہ ان کی خدمت میں پیش نہیں کیا جتنا کہ یوں خرچ ہوتا تھا۔ اور انہیں یہ تحفہ قبول کرنے پر رضامند نہ کر لیا۔ اسی طرح وہ اپنے آتش دان میں محض اپنی ذات کے لئے کبھی لکڑی نہیں جلاتے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ چونکہ ان کے پاس ملنے ملانے والے ہر وقت آتے رہتے ہیں اس لئے ان کی خاطر انہیں کمرہ گرم رکھنا پڑتا ہے اور لکڑی کا خرچ ذرا زیادہ ہو جاتا ہے۔ بہر کیف

امین صاحب کے کمرہ میں عام طور پر لوگ کہنے کے لئے کم جاتے ہیں اور سننے کیلئے زیادہ، اس لئے اپنے عقیدت مند سامعین کو محظوظ کرنے کے لئے امین صاحب کو متواتر باتیں کرنی پڑتی ہیں اور چونکہ قارون کے خزانے کی طرح باتوں کا خزانہ بھی آخر ختم ہو جاتا ہے اس لئے انہیں بعض اوقات ایک ہی بات کو کئی بار دہرانا پڑتا ہے۔ مثلاً ہاتھ کی پٹی کی کہانی

انہیں کئی بار سننی پڑتی ہے۔ بانہال کی چٹی سے شروع ہو کر کبھی تو یہ داستان نیشنل کانفرنس پر ختم ہوتی ہے۔ جس کی بات ہی کیا ہے! کبھی بانہال والوں پر جو بُرے تھے مگر اب اچھے بن رہے ہیں اور کبھی اُن ہندوستانی سپاہیوں پر جو پہلے بھی اچھے تھے اور اب بھی اچھے ہیں۔ ان باتوں کے دوران میں البتہ سرد سے قسم کی باتیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی کوئی اہم مہمان آجاتا ہے، کوئی ہندوستانی سپاہی۔ اور امین صاحب کا عضو عضو جیسے خیر مقدم کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے اور کمرے میں بیٹھے ہوئے سارے "سامعین" کی نگاہیں دروازے کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ اور پھر امین صاحب کی میٹھی آواز کی بجائے کمرے کی فضا میں کوئی مدراسی لہجہ گونج اٹھتا ہے، "صاحب! ہمارا صوبیدار صاحب بولتا ہے، ہم کو چینی منگتا۔ جوان کے واسطے چینی خلاص پڑ گیا۔" اور اب بیگ بیچارا کر کر باتیں کرنا صرف امین صاحب ہی کو زیب دیتا ہے۔ دفعتاً اپنی زبان کھول دیتا ہے۔

بیگ پوچھتا ہے "کیا وہ ایک من چینی جو پرسوں سے گئے تھے، ساری ختم ہو گئی؟"

امین صاحب گھور کر بیگ کی طرف دیکھتے ہیں۔ تاکہ وہ ان کا باڈی گارڈ ہونے کے علاوہ اسٹور کیپر بھی ہے۔ تاہم آزادی دلوانے والے اچھے لوگوں سے یوں تھوڑے پوچھا جاتا ہے۔ امین صاحب کچھ کہنے ہی کو ہوتے ہیں لیکن ہندوستانی سپاہی فوراً بول اٹھتا ہے "صاحب چینی جوان نے پی لیا۔ کیا کرے۔ یہاں پر برف بہت پڑتا ہے۔ چائے نہ پیے اور رم نہ پیے تو مر جائے۔"

اور امین صاحب فوراً ایک من مزید چینی کے لئے احکامات صادر کر دیتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے ممکن ہے کہ انہیں یہ خیال آتا ہو کہ یہ چینی دے کر وہ بانہال کے بہت سے لوگوں کی حق تلفی کر رہے ہیں مگر ایک خیال فوراً ان کی تسکین کے لئے آموجود ہوتا ہے، ہندوستانی

سپاہی جو پردیس سے آکر ان برفوں میں ہمیں آزادی دلوانے کے لئے پریشان ہو رہے ہیں، ان کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ اور اس کے علاوہ جتنی زیادہ انہیں چینی ملے گی، اتنی ہی وہ زیادہ چائے پئیں گے اور جتنی زیادہ وہ چائے پئیں گے اتنی ہی وہ رم کم پئیں گے کیونکہ مقصد تو اپنے آپ کو گرم رکھنا ہے نا۔ پھر یوں چینی دے کر اگر کسی کو زیادہ شراب پینے سے بچا لیا جائے تو کیا یہ کارِ ثواب نہ ہوگا؟ اور اس استدلال سے امین صاحب کا ضمیر ہلکا ہو جاتا ہے چنانچہ سپاہی کو جب وہ رخصت کرتے ہیں تو وہ اس سے مصافحہ بھی کرتے ہیں، اور چونکہ یہ مصافحہ بائیں ہاتھ سے ہوتا ہے کیونکہ دائیں پر پٹی بندھی ہوتی ہے۔ اس لئے لگے ہاتھ معذرت کے طور پر وہ اس پٹی کی کہانی بھی جلدی جلدی، ہنستے ہنستے سنا دیتے ہیں اور پھر چلتے چلتے اسے یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ "بھئی! اگر اور چینی چاہیئے تو اور بھی لے جانا اور چائے بھی کم ہو تو وہ بھی ہم دے دیں گے۔"

سپاہی چلا جاتا ہے اور امین صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے سارے درباریوں کے منہ پر جیسے کوئی ہلدی چھڑک دیتا ہے کیا وہ امیدیں بھی ختم ہو جائیں گی جن پر اب تک وہ جی رہے تھے؟ ہندوستان سے محدود تعداد میں اور دور دراز کے فاصلے طے کرنے اور بارش اور برف کے بے پناہ ریلوں کا مقابلہ کرنے کے بعد آنے والی چینی، چائے اور دوسری چیزیں جب اس بیدردی سے ختم کر دی جائیں تو پھر بانہال کے رہنے والوں کا کیا بنے گا؟

امین صاحب شاید ان کے دل کی بات سمجھ جاتے ہیں اور اس لئے اپنا استدلال دہراتے ہیں مگر ان کا چہرہ بدستور بے رنگ رہتا ہے اور ان کی آنکھوں میں کوئی چمک نہیں لہراتی۔ غالباً بات نہیں بن سکی لیکن چونکہ ان کے کمرے میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس لئے کوئی نیا آنے والا جلد ہی آ جاتا ہے اور پھر موضوع بدلتا ہے، ماحول بدلتا ہے

ور بگڑی ہوئی بات بن جاتی ہے۔ ایبن صاحب کسی نئے معزز مہمان کی آمد آمد میں پہلی بات بھلا ڈالتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بات بن گئی ہے یا کم از کم بات ٹل گئی ہے۔

نئے آنے والوں میں کبھی کوئی لفٹیننٹ سنگھ ہوتا ہے، کبھی کوئی کپتان بالی اور کبھی کوئی میجر ڈاؤ، اور چونکہ ان میں سے ہر ایک اپنی گورنمنٹ سے یہاں بے حد خوش اخلاق بن کر رہنے کی ہدایات لے کر آیا ہوتا ہے کیونکہ کشمیر کی لڑائی میں جہاں ہندوستان کو حملہ آوروں سے "بزور بندوق" نبٹنا ہے۔ وہاں اس کے رہنے والوں کو بھی زبان کی تلوار سے گھائل کرکے اپنے ساتھ ملانا ہے، اس لئے انڈین ملٹری کے رسالے حاکم، اپنی حکومت سے یہاں "خوش خوش رہنے اور خوش خوش رکھنے" کے احکامات لے کر آئے ہوتے ہیں اور اس لئے اپنے فرائض سے پورے طور پر نپٹتے ہوئے ہر کشمیری کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آتے ہیں اور یہ اخلاق کچھ اس وجہ سے بھی بڑھ جاتا ہے کہ ان کے سپاہی کم از کم اسی سلسلے میں احکامات سے ذرا بے نیاز رہتے ہیں۔ اس لئے ان کے اخلاق کی کمی کا "پرائسچت" بھی انہیں ہی کرنا پڑتا ہے، اور یوں "پرائسچت" کرتے کرتے اگر کوئی اپنی اصلیت کھو دے یا اس کا تصنع پریشان ہونے لگے، تو اس میں اس بے چارے کا کیا قصور؟

خوش اخلاق بننے کے یہ روپ آدمی آدمی پر منحصر ہیں مثلاً لفٹیننٹ سنگھ جو معمولاً پنجابی میں بات چیت کرنے کا عادی ہے، جس کے خمیر میں ہی وہ بے باکی اور بے تکلفی ہوتی ہے جو خوش اخلاقی کی بنیادوں کو اکثر متزلزل کئے رکھتی ہے۔ اس لئے وہ اکثر خاموش رہ کر مسکرانا پسند کرتا ہے، وہ جب کبھی آتا ہے، اپنی زبان سے زیادہ اپنے ہونٹوں سے کام لیتا ہے ہمیشہ مسکراتا ہے۔ ایبن صاحب باتیں کرتے ہیں اور وہ مسکراتا ہے۔ ان کا باڈی گارڈ اپنی کبھی نہ ٹلنے والی تیوریوں کو اپنی پیشانی پر بکھیرے لفٹیننٹ سنگھ کی مسکراہٹ کو بے معنی

سی نگاہوں سے گھورتا ہے اور لفٹیننٹ سنگھ اور زیادہ مسکراتا ہے۔ اب وہ اقبال کا کوئی شعر بغیر کسی تُک کے الاپتا ہے اور لفٹیننٹ سنگھ پھر بھی مسکراتا رہتا ہے۔ ہر بات خواہ بے تُکی ہو، خواہ سنجیدہ، خواہ غمناک، لفٹیننٹ سنگھ اسے ایک لطیفہ سمجھ کر اپنے سینے میں جگہ دیتا ہے۔ ایک لطیفہ سمجھ کر ہی اپنے ہونٹوں سے اس کا اعتراف کرتا ہے۔ مسکراتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے یوں ہندوستان کے مرکز میں بیٹھے ہوئے اپنے سارے سیاسی دیوتاؤں کے کہے پر احسن ترین طریق سے عمل کر لیا ہے، اور خوش اخلاقی کی ساری منزلیں ایک مسکراہٹ کے بل بوتے پر طے کر لی ہیں۔

کیپٹن بالی کے انداز البتہ مختلف ہیں، وہ خوش اخلاقی کی بنیاد نرم و نازک مسکراہٹ میں نہیں ڈھونڈھتا بلکہ اس کے لئے وہ قہقہے کی گونج کا قائل ہے۔ وہ قہقہہ جو آپ کو چونکا دے اور سارے ماحول کو جو ایک ہی رو میں بہا دے وہ رو جس میں بہتے ہوئے ایبن صاحب تک اس ماحول کا ایک حصہ بن جائیں، جزو کل میں مل جائے۔ اور کل میں سب سے نمایاں کپتان بالی کا وجود ہو۔ کپتان بالی نے پچھلی لڑائی کے دوران میں خوب سیریں کی ہیں اس لئے وہ ہمیشہ ان سیروں ہی کی باتیں کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کشمیر کے دوسرے اکثر علاقوں کی طرح بانہال میں بھی مسلمان اکثریت میں ہیں۔ اس لئے وہ ان کی نازک رگ کو خوب پہچانتا ہے وہ جانتا ہے کہ شیر کشمیر سے دو قوموں والی تھیوری کے خلاف بہت کچھ سننے کے بعد، اب شیر کشمیر کی اس نئی حکومت میں اگرچہ ہر ایک شیر کشمیر کی ہی ہاں میں ہاں ملاتا ہے لیکن اس کے باوجود اسے معلوم ہے کہ ان سب کے دلوں کی گہرائیوں میں اب بھی وہ تصورات دبے ہوئے موجود ہیں، جو انہیں ان کی "مسلمانی" کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ اس لئے۔ کپتان بالی ایک عیار سوداگر کی طرح ایک نیا لیبل لگا کر اس مال کی نمائش کرتا ہے جو اسی بازار میں

ممنوع ہے لیکن جسے گاہک خریدنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں وہ امین صاحب کے کمرے میں آکر، بانہالیوں کے سامنے ہمیشہ اسلامی ممالک ہی کے قصے سناتا ہے......

......"جب میں سیریا میں تھا تو ایک دن مجھے ایک عرب ملا۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا، السلام علیکم، اور میں نے جواب دیا، وعلیکم السلام"...... اور پھر کپتان بالی سننے والوں سے اپنی اس فراخ دلی کی داد طلب کرنے کے لئے ان کی طرف دیکھتا ہے۔ اور چونکہ اسے ناز ہے کہ وہ "وعلیکم السلام" ہمیشہ مسلمانوں کی طرح کہتا ہے۔ اس لئے وہ اسے بار بار دہراتا ہے۔ "السلام علیکم" کپتان بالی، سلام کے معاملے میں ہمیشہ پہل کرتا ہے۔ اور اگر کوئی نووارد بازی لے جائے اور کپتان بالی سے پہلے ہی یہ فریضہ ادا کرے تو کم از کم کمرے میں بیٹھے ہوؤں میں سے سب سے پہلا جواب کپتان ہی کا ہوتا ہے "وعلیکم السلام" اور یوں اس کی خوش اخلاقی سب پر چھا جاتی ہے۔ لفٹیننٹ سنگھ کی خوش اخلاقی سے بڑھ جاتی ہے۔ امین صاحب کو بیٹی کا غم بھلا دیتی ہے۔ اور اب جب کپتان بالی کوئی قہقہہ بلند کرتا ہے تو امین صاحب کی ہنسی روکے سے نہیں رکتی۔ اُن کا نحیف جسم ہنسی کے ہچکولوں میں لرز لرز اٹھتا ہے۔ اور وہ اپنے بازوؤں کو بار بار پھیلاتے ہیں۔ اے کاش! کپتان بالی، ان کے پاس بیٹھا ہوتا، تو وہ اسے اپنے گلے سے لگا لیتے۔

لیکن کپتان تو ایک سیماب پارہ ہے۔ آیا، ذرا کی ذرا بیٹھا، قہقہے بلند کئے، پھر اٹھ کھڑا ہوا کھڑے کھڑے "السلام علیکم، وعلیکم السلام کہا۔ وہ ایک اور قہقہے اڑائے اور پھر اپنی خوش اخلاقی کی لہریں، کمرے میں چھوڑ، یہ جا، وہ جا، اور اس کے جانے کے بعد امین صاحب کو اس کی تعریفیں کرنے کے سوا اور کسی بات سے دلچسپی ہی نہیں رہتی۔ اس کی تعریفیں اُس کی روشنی میں، ہندوستانی فوج کی تعریفیں، بلکہ سارے ہندوستان کی تعریفیں، حتیٰ کہ میجر راؤ

آجاتا ہے۔ اور کمرے میں کسی تیسری طرز کی خوش اخلاقی کا مظاہرہ شروع ہو جاتا ہے۔

کھوئے کھوئے اور مضطرب سے میجر راؤ کو دیکھنے کے بعد پہلی مرتبہ جو خیال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے کندھوں پر میجری کا چمکتا ہوا کراؤن اپنے وقت سے بہت پہلے آگیا ہے اس کے بعد جب وہ باتیں شروع کرتا ہے اور اس کی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے کا وقت آتا ہے تو فوراً احساس ہوتا ہے کہ اس چھبیس سالہ میجر کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ اسے گفتگو کے لئے کوئی موضوع نہیں ملتا۔ وہ دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو کر سکتا ہے لیکن نہیں جانتا کہ ہر محفل میں جہاں اسے ایک مصنوعی قسم کی خوش اخلاقی کے لبادے میں اپنے آپ کو ڈھالے رکھنا ہے وہ کون سی بات کرے۔ اس کی ذہانت اور اس کا احساس اسے مارے ڈالتے ہیں۔ اور ــــ باتوں کے ڈھیروں کے ڈھیر اس کے دماغ میں پڑے رہتے ہیں اور وہ انتخاب نہیں کر سکتا۔ کون جانے کون سی بات اس موقع کے لئے مفید ہو کون سی زہر۔ چنانچہ جب وہ کوئی بات کرتا ہے فوراً ہی اسے احساس ہوتا ہے کہ اسے اس کے سوا کچھ اور کہنا چاہیئے تھا، اور اسی لئے فوراً ہی وہ پچھتاتا ہے، معذرت کرتا ہے اور انتخاب کا یہ مسئلہ اس کے لئے اور بھی دشوار ہو جاتا ہے

شاید اس خیال سے کہ مہذب ملکوں میں گفتگو عام طور پر موسم سے شروع کی جاتی ہے۔ میجر راؤ کہتا ہے "آج بہت زیادہ برف پڑ رہی ہے"

"ہاں، اور ابھی شاید کچھ دن اور پڑتی رہے گی" ہم میں سے کوئی کہتا ہے اور میجر راؤ چونک پڑتا ہے۔ "کیا کہا آپ نے؟ ابھی اور پڑے گی؟"

کیا برف میں آپ بہت پریشان ہیں؟" اب امین صاحب ایک میزبان کی حیثیت سے خوش اخلاق بننے کی کوشش کرتے ہیں اور میجر راؤ کا چہرہ بتاتا ہے کہ اسے کاش! امین صاحب یہ

خوش اخلاق نہ برتتے —— کتنی غلطی ہو گئی ہے اسے اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اس طرح عام مورال خراب ہو جاتا ہے اور پھر وہ تو فوج کا ایک باوقار افسر ہے۔ پریشانی کا اس سے کیا تعلق۔ چنانچہ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ہے، اپنے آپ کو کوستا ہے اور پھر جیسے معذرت کرتا ہے "نہیں تو، لیکن ہم لوگ ہٹ کے عادی نہیں ہیں۔"

"تب تو آپ کے سپاہیوں کو بہت تکلیف ہوتی ہوگی" ٹھیک ایمن صاحب خوش اخلاقی کا موقع نہیں گنواتے اور میجر کے ذہن میں جیسے آندھیاں چلنے لگتی ہیں۔ اب معاملہ اس سے ہٹ کر اس کے سپاہیوں پر جا پڑتا ہے، ان سب کا وقار خطرے میں ہے، ایک اچھے فوجی افسر کی طرح اسے بھی اپنے آپ سے زیادہ اپنے سپاہی عزیز ہیں اور اس لئے انہیں بچانے کے لئے وہ جیسے آخری تنکے تک کا سہارا لینے کے لئے ہاتھ پھیلا دیتا ہے "نہیں نہیں، بات نہیں ہے، میں اور میرے سپاہی برابر لڑتے رہے ہیں۔ فرانس میں لڑتے رہے ہیں۔ ہم نے بڑی بڑی لڑائیاں دیکھی ہیں مگر دیکھئے نا، یہاں معاملہ ذرا مختلف ہے۔"

"وہ کیسے؟" کسی کا تجسس پکار اٹھتا ہے اور میجر راؤ سمجھتا ہے جیسے اب سب کچھ ہاتھ سے جا رہا ہے۔ پر ہمت وہ اب بھی نہیں ہارتا جواب دیتا ہے کہ "پہلے جب ہم لڑا کرتے تھے تو ہماری پشت پر انگریز تھے، امریکی تھے، اتحادی طاقتیں تھیں۔ مگر اب بے چارہ ہندوستان اکیلا ہے ...."

اڑا دھم —— اور سارا بنا بنایا محل جیسے گر جاتا ہے۔ میجر راؤ ان برفوں میں۔ کشمیر کے اس محاذ پر اتنا پریشان ہو گیا ہے کہ اس کا اپنے حواس پر بالکل قابو نہیں رہا، وہ بیوقوف نہیں سب کچھ سمجھتا ہے، اپنے دوستوں کی محفل میں کبھی بڑا خوش گو سمجھا جاتا ہوگا۔ لیکن یہاں آ کے جیسے وہ اپنے محور سے اکھڑ گیا ہے۔ اور اس لئے پریشان ہے یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی ادھر کی کہتا ہے اور

کبھی ادھر کی۔ اس کے ذہن میں بڑے بڑے جھمیلے ہیں، وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے کہہ نہیں سکتا۔ اور جو اسے کہنا چاہیئے، وہ محسوس نہیں کرتا۔

میجر راؤ۔ دو قوموں والی تھیوری کا قائل نہیں ہونا چاہتا۔ مگر اس کے سپاہی اس کے قائل ہیں یہی وجہ ہے کہ جب وہ اس سے آ کر یہ پوچھتے ہیں کہ وہ کشمیر میں کیوں لڑ رہے ہیں؟ اور وہ انہیں جواب دیتا ہے کہ کشمیریوں کو حملہ آوروں سے بچانے کے لئے، تو وہ بھڑک اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ آخر پچاسی فیصدی مسلم اکثریت والی ریاست میں اپنی جانوں کو خواہ مخواہ کیوں لڑائیں۔ جب ان سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کی شمولیت ابھی محض عارضی ہے اور فیصلہ بعد میں ہوگا —— ایسے وقتوں میں میجر راؤ بالکل لاجواب ہو جاتا ہے اور اس کے ذہن میں کچھ ایسے ایسے خیالات آنے لگتے ہیں جن کا اگر اس کے کمانڈر انچیف کو پتہ چل جائے تو وہ فوراً گولی کا نشانہ بنا دیا جائے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالے نہیں سنبھال سکتا۔ یہاں آ کر بیچارہ راؤ اپنے آپ سے جیسے کھو گیا ہے۔ پرانے اصلی راؤ سے بہت دور چلا گیا ہے اور جب وہ ایمن صاحب کے کمرے میں آتا ہے تو یہ فاصلے اور بھی بڑھ جاتے ہیں، ہائے یہ مدراسی ذہانت۔ فوجی فرائض۔ اس کے احساسات اور کشمیر کی یہ اجنبی برفیں!!!

ایمن صاحب کے کمرے میں رام موکا ایک مہاجن بھی اکثر دکھائی دیتا ہے۔ پچھلے دنوں افراتفری میں یہ لٹ گیا تھا اور اب تسلی کے لئے ایمن صاحب کو اپنے نقصانات کی تفصیلات سناتا رہتا ہے اور ساتھ ساتھ اس بات پر بھی زور دیتا رہتا ہے کہ ایمن صاحب یہ ساری تفصیلات نہ صرف سنیں بلکہ لکھیں بھی۔ نہ صرف لکھیں بلکہ اس کے بعد نیشنل کانفرنس کے صدر دفتر میں بھی بھیجیں اور گورنمنٹ سے کہیں کہ وہ ان کی تلافی کرائے۔

رونی صورت بنائے، رام سو کا یہ مہاجن سارا سارا دن امین صاحب کے کمرے میں بیٹھا رہتا ہے اور یونہی سر تھامے دیکھتا ہے۔ اپنی راگنی الاپنے لگتا ہے "سرکار! اگر مہاراجہ بہادر کاتک کی دس تاریخ کو سری نگر سے نہ بھاگتے اور بھاگتے بھاگتے یہ خبر نہ اڑاتے جاتے کہ ان کے پیچھے پیچھے ہی قبائلی بھی آرہے ہیں تو میرا یہ حال کبھی نہ ہوتا۔ جب مہاراجہ ہی بھاگ رہا ہو تو پرجا کیا کرتی؟ رام سو کی سڑک سے جب ہم نے مہاراجہ بہادر کی موٹریں جموں کی طرف بھاگتی دیکھیں تو ہم بھی وہاں سے بھاگے۔ اس دن رام سو سے جموں تک لاریوں نے پانچ پانچ سو روپے فی سواری کرایہ لیا۔ ہم نے سونا چھوڑا، زیورات چھوڑے اور بھاگ گئے پھر بعد میں جب ہمیں پتہ چلا کہ بات کچھ بھی نہ تھی اور قبائلی نہیں آئے تو ہم واپس لوٹے۔ لیکن ہم سے پہلے وہاں ٹھاکر پہنچ گئے اور انہوں نے ہمارا سب کچھ لوٹ لیا۔"

"ٹھاکروں نے؟"

"جی سرکار! وہ ہمارے قرض دار تھے نا۔ انہوں نے سمجھا کہ ہم اپنے بہی کھاتے بھی وہیں چھوڑ گئے ہوں گے۔ حالانکہ وہی ایک شے تھی جو ہم لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔"

ہم سب ہنسنے لگتے ہیں۔

لیکن رام سو کا مہاجن بدستور کہتا رہتا ہے "سرکار! مہاجن اپنا سب کچھ چھوڑ سکتا ہے لیکن بہی کھاتے نہیں تو اس کی جان ہوتی ہے۔ اس بھاگم بھاگ میں جن کو لاری میں جگہ نہ مل سکی وہ پیدل ہی جنگلوں میں مارے مارے پھرتے رہے۔ پر بہی کھاتے ان کے بھی ساتھ ہی رہے، رام نام زبان پر اور بہی کھاتے پیٹھ پر......"

رام سو کے مہاجن کی آواز ہماری ہنسی میں دب جاتی ہے بلکہ یہ دیکھ کر کہ ہم بہت ہی زیادہ ہنسنے لگے ہیں وہ بھی اپنی بتیسی نکال دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ سب لوگ

بھی ہنسنے لگتے ہیں جو امین صاحب کے کمرے میں آکر اصولی طور پر ہنسنے کے خلاف ہیں۔ اب پیرس ہوٹل کا مینیجر بھی ہنسنے لگتا ہے جو یہاں صرف اس لئے آیا کرتا ہے کہ یہ کہہ کر ہندستانی سپاہی اکثر اس کے ہاں سے چائے پیا کرتے ہیں، وہ زیادہ سے زیادہ چینی کی مقدار لے سکے اور بلیک مارکیٹ کرنے میں اسے آسانی ہو۔ اس کے علاوہ اب مسٹر گوردیپ اسسٹنٹ انجینئر کی بھی ہنسی نکل جاتی ہے جو اس بے پناہ سردی کے موسم میں بھی سرد پتلون پہنتے ہیں۔ تاکہ سب پر واضح ہوتا رہے کہ وہ رشوت نہیں لیتے اور چونکہ محض تنخواہ پر ہی گذر ہوتی ہے۔ اس لئے زندگی ذرا غربت میں کٹتی ہے مسٹر گوردیپ کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ امین صاحب کے کمرے میں آکر وہ اپنے چہرے پر ایک ازلی غم اور درماندگی کا تاثر قائم کئے رکھیں لیکن اب سب کے ساتھ انہیں بھی ہنسنا پڑتا ہے اور اب سورج مل اوورسیر کی ہنسی بھی نکل جاتی ہے جسے رسیوں سے باندھ کر یہاں لایا گیا تھا۔ اور جس کی حیثیت اس دربار عام میں ایک ملزم کی تھی۔ کیونکہ اس کے متعلق یہ شکایت تھی کہ وہ سڑک کھولنے کی کوشش کم کرتا ہے اور آتشدان کی گرمی سے لطف اندوز ہونے میں زیادہ مصروف رہتا ہے اب وہ بھی ہنس دیتا ہے۔

اور جب وہ ہنستا ہے۔ تو حالات دفعتاً بدل جاتے ہیں "! مجرم کیوں ہنسا" امین صاحب گھور کر اس کی طرف دیکھتے ہیں "ایاز قدر خود بشناس" مجمع پر سکوت چھا جاتا ہے اور اوورسیر فوراً اپنی قدر پہچان لیتا ہے اور ———— تیں بچھتاتا ہے جناب۔ بس اب قلیوں سے یہ نہیں کہے گا کہ برف کا ناپ نہیں ہوا۔۔ اس لئے وہ سڑک صاف نہ کرے میں بہت پچھتاتا ہے جناب......"

حالات پھر اسی رو میں بہنے لگتے ہیں۔ امین صاحب کے کمرے میں زندگی کی ندی کا پانی ہمیشہ اپنی سطح ہموار رکھتا ہے۔

لیکن کبھی کبھی اس ندی میں بعض لوگ جیسے کنکر بن کر اس میں ایک ہلچل بھی مچا دیتے ہیں اور یہ لوگ ہوتے ہیں "گندے انڈے" اس پولیس کے سپاہی جیسے' جس کی وجہ سے اب امین صاحب کو ہر روز اپنے ہاتھ پر پٹی بندھوانی پڑتی ہے لیکن اب ایسے گندے انڈوں سے بیگ نبٹا کرتا ہے کیونکہ جب سے امین صاحب کا ہاتھ زخمی ہوا ہے بیگ اپنے فرائض کے سلسلے میں زیادہ چوکنا ہو گیا ہے اور اس لئے اب جب امین صاحب کو غصہ آتا ہے تو بیگ فوراً ان کی مدد کو آ پہنچتا ہے۔ آخر ان کا باڈی گارڈ ہے۔ ان کے جسم کا محافظ۔ مثلاً جب امین صاحب کسی سے معمول سے ذرا اونچی آواز میں پوچھتے ہیں "تم نے محمد علی جناح کو قائداعظم کیوں کہا؟ —— کیوں کہا تم نے اسے قائداعظم؟" تو بیگ فوراً خبردار ہو جاتا ہے اور پھر امین صاحب کی تیوری چڑھتی ہے۔ اور وہ کہتے ہیں "معلوم ہوتا ہے ابھی تک تمہارے دماغ سے پرانی باتیں نہیں گئیں ابھی تک تم پرانے خواب دیکھ رہے ہو۔ ابھی تک ش——" تو بیگ سمجھ جاتا ہے۔ کہ اب امین صاحب کی زبان ان راہوں پر آ گئی ہے جہاں اسے ہاتھوں کے ساتھ کی ضرورت پڑتی ہے اور زبان کے ساتھ ساتھ امین صاحب کا ہاتھ بھی بروئے کار آنے والا ہے۔ ہاتھ اٹھنے والا ہے۔ تو فوراً امین صاحب کے ہاتھ کو زخمی ہونے سے بچانے کے لئے بیگ اپنا ہاتھ اٹھا دیتا ہے اور پھر امین صاحب کے کمرے میں بہنے والی زندگی کی ندی میں جیسے طغیانی آ جاتی ہے۔

یا کسی دن وہ لوگ آ جاتے ہیں جو اس روز جب پہلی بار برف گری تھی 'بانہال' کی چوٹی پر گھر گئے تھے اور جنہیں پچھلے پانچ چھ دن ٹنل کے اندر رہ کر موت اور زندگی کے بالکل پاس کھڑے ہو کر یہ سوچنا پڑا تھا۔ کہ اب زندگی سے ان کا رشتہ ٹوٹا اور اب موت نے انہیں اپنے دامن میں چھپا لیا وہاں وہ زندگی کی متواتر کم ہوتی ہوئی گرمی کو محسوس کرتے رہے تھے۔ اور موت کی خونیں مسکراہٹ بھی انہیں برابر نظر آتی رہی تھی۔ مگر پھر بھی وہ اس سے بچ آئے تھے۔ اور اب امین صاحب کے کمرے میں آ کر وہ چلانے لگتے ہیں "آگ آگ چائے چائے" - اور پھر امین صاحب کا آتشدان لکڑیوں سے بھر جاتا ہے ہم لوگ دور جا بیٹھتے ہیں اور نو وارد اپنے پاؤں لمبے کر کے انہیں آگ کے شعلوں میں دھنس دیتے ہیں اور پھر چائے پی پی کر قے کرنے لگتے ہیں۔ ٹنل پر گزارے ہوئے دنوں میں وہ صرف ذہنی طور پر ہی پریشان نہیں رہے تھے۔ بلکہ ان کے پیٹ کی آنتیں بھی اپنا معمول بھول گئی ہیں۔

اب امین صاحب کے کمرے میں زندگی کی ندی کا پانی جیسے گدلا ہو جاتا ہے اور لہریں ایک دوسری کے ساتھ سر ٹپکتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں پھر آہستہ آہستہ آپ بیتیاں شروع ہوتی ہیں اور ہم ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں۔

تھانیدار دیسراج کہہ رہا ہے: "یہ مدراسی بے حد ڈرپوک ہوتے ہیں۔ بے حد ناکارہ جب ہم ٹنل کے اندر پہنچے۔ اور برف باری نے ہمیں آگے بڑھنے سے روک دیا تو جلد ہی ٹنل کے دونوں منہ بند ہو گئے وہاں منوں برف پڑ گئی اور ٹنل میں اندھیرا ہو گیا۔ اب ہمیں موت سے مقابلہ کرنا تھا ٹنل کے منہ پہ برف کے لمحہ بہ لمحہ بڑھتے ہوئے انبار کو پرے ہٹا کر ٹنل کا منہ کھولنا تھا۔ تاکہ باہر کی دنیا سے ہمارا رشتہ

جڑ سکے۔ لیکن بجائے اس کے کہ کوئی ہمت کرتا وہ سارے کے سارے مدراسی سپاہی جن کی وہاں PICKET ہے اور جو پہرہ دینے کے لئے وہاں رہتے ہیں رونے لگے۔ اور ادھر ادھر کونوں کھدروں میں چھپ گئے تاکہ ہم انہیں تلاش کر کے کام پر نہ لگا سکیں۔ ناچار میں اور دھرم پال تھالیوں اور گلاسوں سے برف کو ہٹاتے رہے ٹنل کا منہ کھولتے رہے پورے دو دن اور پوری دو راتیں ہم دو شخص ٹنل کے منہ پر پڑی ہوئی برف میں ایک سوراخ نکالنے کی آس میں متواتر اپنے ہاتھ چلاتے رہے تھک کر ہم چور ہو گئے۔ بھوک نے ہمیں بے حال کر دیا۔ احساسات ہمارا ساتھ چھوڑ گئے اور شائد ہم نڈھال ہو کر گر ہی پڑتے اگر زندگی کا پیار نہ ہوتا' امید کا سہارا نہ ہوتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

اور کرنیل بھگوتی سنگھ کہہ رہا ہے "میں ٹنل پر رہ آیا ہوں بانہال کو اس کی دونچائیوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اور اس لئے پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں اس زمانے میں نہ کوئی انسان رہ سکتا ہے نہ ان راہوں سے کوئی ادھر ادھر جا سکتا ہے میں ہیڈ کوارٹرز میں پہنچتے ہی کوشش کروں گا کہ ہماری وہ PICKET جو اس وقت بانہال کی چوٹی پر ہے وہاں سے ہٹالی جائے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ان برفوں میں کوئی انسانی دشمن وہاں سے نہیں آسکتا اگر آئے گا تو وہ خود بخود مر جائے گا۔ اس لئے میں ہیڈ کوارٹرز میں پہنچتے ہی کوشش کروں گا کہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

اور دھرم پال کہہ رہا ہے "ہم بانہال پہاڑ کے اس ٹنل میں بیکس جانوروں کی طرح چڑھا کے آئے میں موت وہاں اتنی عام ہو گئی تھی کہ زندگی ہمیں اجنبی دکھائی دینے لگی تھی دن اور رات ٹنل کے اندھیروں میں کہیں غائب ہو گئے تھے اور وقت کا سارا تصور مٹ چکا تھا۔ لوگ

بر لحظہ، ہر دم چپ چاپ موت کو اپناتے رہتے تھے اور ان کی لاشیں ہمارے قریب پڑی، جیسے ہماری کوشش، ٹنل کا منہ کھولنے کی کوشش، اور تھالیوں اور گلاسوں سے موت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کا منہ چڑاتی رہتی تھیں۔ اور پھر جس دن وہ مدراسی سپاہی مرا ہائے جس دن وہ مدراسی سپاہی مرا وہ کہنے لگا "بھائیو! میں مر رہا ہوں۔ اس پردیس میں مر رہا ہوں پر میں جانتا ہوں، تم یہاں سے بچ نکلو گے۔ یہ ٹنل تمہارے دیس کا ہے، تمہارا ہے، تمہیں یہ نہیں نگلے گا۔ یہ تمہارا لحاظ کرے گا اس لئے جب تمہیں راستہ مل جائے۔ اور تم یہاں سے واپس جاؤ تو کم از کم میری لاش، میرے دیس ضرور پہنچا دینا۔ یہ برفوں والا کشمیر نہ میرا دیس ہے نہ بن سکتا ہے۔ میں خواہ مخواہ ہی یہاں آیا۔ یہ تمہیں کو مبارک ہو۔" اور پھر وہ مر گیا۔ اور اس کی لاش اب تک وہیں پڑی ہے۔ قلیوں کی مدد سے ہم خود بڑی مشکل سے اترے تھے لاش کیسے لاتے۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

انڈین ملٹری کا ایک کپتان بھی اسی طرح کی ایک کہانی سنا رہا ہے۔ "ناممکن ہے۔ ٹنل پر رہنا ناممکن ہے۔ ٹنل کے راستے سفر کرنا بھی ناممکن ہے۔ ہم کو حکم ہے۔ کہ ہم پنسلین لے کر جلد سے جلد اوڑی کے محاذ پر پہنچیں۔ لیکن جب ہم کو بانہال ہی روک لے تو ہم کیسے پہنچیں؟ اب ہم کرنل بھگوتی سنگھ کے ساتھ واپس جموں جائے گا اور وہاں سے ہوائی جہاز پر چڑھ کر سری نگر پہنچے گا۔ اور پھر وہاں سے اوڑی جائے گا۔۔۔۔۔۔۔"

انڈین ملٹری کا یہ کپتان، بندوق کو ہاتھ میں پکڑنا خوب جانتا ہوگا لیکن بیلچہ پکڑنا اسے نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ اوڑی کے محاذ پر پہنچنے سے قبل ہی اس کے ہاتھ پر پٹی بندھ چکی ہے ٹنل سے واپسی پر ایک مزدور کے بیلچے کا سہارا لینے کی کوشش میں اس نے اپنا ہاتھ زخمی کر لیا ہے اور اس لئے اب کہہ رہا ہے: "ہم مزدور نہیں کپتان ہے، ہمارا ہتھیار بندوق ہے

بیلچہ نہیں، ہم گھر سے ٹنل پر خراب ہونے کے لئے نہیں آیا تھا۔ بلکہ اوڑی پر لڑنے کے لئے چلا تھا، زخمی سپاہیوں کو پنسلین دینے کے لئے چلا تھا.........."

کپتان بہت اداس ہے، کیا کشمیری نزمعہ کے بیلچے نے اسے جو چوٹ لگائی ہے وہ بہت سخت ہے؟ مگر کپتان نہیں چاہتا کہ ہم اس کی اداسی کا تذکرہ کریں۔ اس میں وہ اپنی سُبکی محسوس کرتا ہے۔ اس لئے اس کی عین خواہش یہی ہے کہ ہم سب کچھ سن تو لیں۔ لیکن سنتے ہی بھول جائیں اور اگر یاد رکھیں تو صرف اتنا کہ اوڑی کے محاذ پر ہندوستانی فوج بڑی بے جگری سے لڑ رہی ہے اور چونکہ "گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں" اس لئے زخمی بھی ہو رہی ہے اور وہاں پنسلین کی سخت ضرورت ہے۔

ہم کپتان کی یہ باتیں سن رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ یہ پنسلین کہیں عراق سے لائے جانے والا وہ تریاق تو نہیں جس کو فارسی محاورے کے مطابق اس وقت پہنچنا ہوتا ہے جب مار گزیدہ مُردہ ہو چکتا ہے اور پھر چونکہ بانہال کا پہاڑ تخییل کی راہوں میں حائل نہیں ہو سکتا، اس لئے اس کی ساری برفوں کو چیر کر پل کی پل میں ہم اوڑی پہنچتے ہیں جہاں میدانِ جنگ میں "شہسوار" دھڑا دھڑ گر رہے ہیں اور چونکہ پنسلین دہلی اور اوڑی کے برف زدہ فاصلوں کے درمیان بے حقیقت ہو کر رہ گئی ہے، اس لئے حاجت مندوں کا انتظار بتدریج ختم ہو رہا ہے۔ منتظر نگاہیں بند ہوتی جا رہی ہیں اور وہ اپنے وطن ہندوستان سے آنے والی دواؤں سے بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں اور ان کا کوئی ایسا خدا نہیں جو کشمیر کے اس دیارِ غیر میں ان کی بے کسی کی شرم رکھ لے، اور سب مجبور ہیں۔ نہرو بھی، شیخ عبداللہ بھی، امین صاحب بھی، افضل انجینئر بھی، اور تدبین ملٹری کا کپتان بھی، جو بانہال پہاڑ کا اور ایک بیلچے کا زخم خوردہ ہے اور اس لئے اداس ہے۔

اور ہم بھی اداس ہیں۔ اور تخییل جیسے بھٹکنے پھرنے کی ہمیشہ سے عادت ہے اوڑی سے ہمیں واپس بانہال ٹنل پر لے آتا ہے، جہاں ایک مدراسی سپاہی کی لاش پڑی ہے اور اس کے ہونٹوں پر فریاد ہے "کشمیر میرا دیس نہیں بن سکتا" میں خواہ مخواہ یہاں آیا، التجا ہے، "میری لاش، میرے دیس میں پہنچا دو" مگر کوئی نہیں سنتا۔ کوئی نہیں دیکھتا۔ اس کے ساتھی سپاہی، سامنے کی برفانی چوٹی پر ایک PICKET میں اپنے گھٹنوں میں سر دبائے خاموش بیٹھے ہیں اور شاید اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب ان کا بھی یہی انجام ہو گا۔ اس پردیس میں وہ بھی اپنے دیس کو یاد کرتے کرتے ختم ہو جائیں گے اور کوئی ان کا پُرسانِ حال نہ ہو گا۔ وہ اپنے ساتھی کی لاش کو نہیں جلائیں گے کیونکہ اس طرح تاپنے کے لئے لکڑیاں کم ہو جائیں گی۔ اور اس طرح وہ دنوں کے لئے ٹھٹکنے کا سہارا بھی نہ رہے گا اور اسے دبائیں گے بھی نہیں، کون ٹھنڈی برف کو ہٹاتا پھرے۔ اور پھر وہ خود جو برف سے اس درجہ خائف ہیں۔ کیا اپنے ہاتھوں اپنے اس عزیز ساتھی کو برف کے اندر سلا دیں اور اس لئے وہ اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، بس چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ اپنی بے بسی کو اپنے اوپر طاری کئے، اور سرد برفانی ہوائیں اور لگتی ہوئی برف انہیں جیسے زیادہ سے زیادہ رلانے پر تلی ہوئی ہے اور وہ نہیں جانتے کہ امین صاحب کے کمرے میں بیٹھا ہوا کرنیل بھگوتی سنگھ، ان پر مہربان ہو چکا ہے اور وہ مرم پال بھی ان کو یاد کر رہا ہے۔ لیکن کون جانتا ہے یہ مہربانیاں اور یہ یادیں محض عارضی ہوں۔ یہ سارے تذکرے محض اس لئے ہوں کہ ابھی تک خوف کا احساس خود ان کے ذہن پر چھا رہا ہے اور وہ یوں باتیں کر کر کے اسے زائل کرنا چاہتے ہیں اور وہ دوسروں کے دکھ کا یہ ذکر محض اپنے دکھ پر قابو پانے کے لئے ہے بہرحال ذکر ہو رہا ہے اور ہم سن رہے ہیں۔ وہاں برف بغیر کوئی آواز پیدا کئے گر رہی

ہے۔ اور اندر آتش دان لکڑیوں سے بھرتا جا رہا ہے اور امین صاحب کے کمرے میں نوحۂ غم کو نغمۂ شادی میں بدلنے کی ہر ممکن کوشش ہو رہی ہے۔

امین صاحب کا کمرہ ہنگاموں کا گھر ہے، بذاتِ خود ایک دنیا ہے اور میں اکثر سوچتا ہوں، اگر بانہال میں امین صاحب کا یہ کمرہ نہ ہو تو شاید بانہال ویران ہو جائے۔ اس پر کسی شہرِ خموشاں کا شبہ ہونے لگے اور میری یہ سوچ اس وقت تو یقین کی حد تک پہنچ جاتی ہے جب میں اور اپورب، امین صاحب کے کمرے کی بجائے شہر کے بازار میں ہوتے ہیں یہاں ہر طرف برف ہی برف ہوتی ہے۔ سامنے کا اونچا پہاڑ، درخت، تار کے کھمبے، لاریاں، فوجی ٹرک، رات بھر باہر کھڑی رہنے والی، بار برداری والی، ریاستی فوج کی خچریں سب برف سے لدی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان سب کے درمیان میں سے گذرتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہم اونچی نیچی قبروں میں سے گذر رہے ہوں جن پر سفید برف یوں دکھائی دیتی ہے، جیسے کسی نے سفید موتیا کے پھول بچھا رکھے ہوں۔ اس قبرستان میں خال خال بانہال کے لوگ بھی چلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، مگر ان کی زبانیں ہمیشہ بند ہوتی ہیں۔ یہاں بازار میں چلتے ہوئے کوئی کسی سے بات نہیں کرتا کیونکہ انہیں ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ اگر انہوں نے آپس میں کوئی بات کی، اور یہ بات ان کے سوا کوئی اور نہ سن سکا تو فوراً ان پر شبہ ہو جائے گا کہ انہوں نے کوئی خطرناک بات کی ہے، جسے وہ اوروں سے چھپانا چاہتے تھے۔ اس لئے ان پر فوراً ففتھ کالم ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا جائے گا۔ اور امین صاحب کی عدالت میں ففتھ کالم ہونا سب سے بڑا جرم ہے۔ چنانچہ یہ لوگ یہ خطرہ کبھی مول نہیں لیتے۔ اس خطرے کو دور کرنے کے لئے اونچی آواز میں بات کی جا سکتی ہے مگر یوں چیخ چیخ کر بات کرنے کے

یہ لوگ عادی نہیں، اور پھر یوں بھی چیخ کر باتیں کرنے کا انداز کچھ ایسا ہو جاتا ہے، جیسے کوئی تقریر کر رہا ہو۔ اور نہ جانے کیسے ان لوگوں کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ اس زمانے میں تقریر کرنے کا حق صرف شیخ عبداللہ کو پہنچتا ہے اور یا بانہال میں امین صاحب کو، اس لئے یہ لوگ خموشی ہی میں سلامتی سمجھتے ہیں۔ اور بانہال کی یہ چلتی پھرتی لاشیں، جن کے جسم پر متواتر پڑنے والی برف نے انہیں سفید کفن بھی اوڑھا دیا ہوتا ہے، اس پُراسرار خاموشی سے قبرستان کے سے اس تاثر کو اور بھی شدید اور گہرا بنا دیتی ہیں۔ اور یوں بازاروں میں سے گذرتے ہوئے بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم کسی ویرانے میں گھوم پھر رہے ہیں ——

—— اور اس ویرانے میں بہار بہت کم آتی ہے، بہت کم۔ بانہال کے اس "شہرِ خموشاں" میں زندگی اپنی آنکھیں کھولتی تو ہے لیکن دم بھر کے لئے، اور بادلوں کے پیچھے سے سورج اگر نکلتا بھی ہے تو پھر سے چھپ جانے کے لئے۔

ایک دن سورج نکلتا ہے اور اس کی کرنیں سفید برف پر یوں چمکتی ہیں کہ آنکھیں، اطمینان سے نہیں دیکھ سکتیں، تاہم اسے جی بھر کر دیکھنے کے لئے ہم امین صاحب کے کمرے سے باہر نکلتے ہیں اور بازار میں کھڑے ہو کر دور بانہال کی چوٹی پر نگاہ جما دیتے ہیں جہاں دھوپ، برف کے ڈھیروں کو چاندی بنا رہی ہے اور جہاں راستہ صاف کرنے کے لئے ان گنت مزدور جا رہے ہیں۔ "اب راستہ کھل جائے گا اور ہم سرینگر جائیں گے۔" افضل انجینئر، جس کے پاس ڈگری ہے لیکن تجربہ نہیں کہہ رہا ہے "اب راستہ ضرور کھل جائیگا اس دھوپ کا صاف مطلب ہے کہ اب آئندہ چھ سات روز برف نہیں گرے گی، راستہ صاف ہوتا رہے گا اور راستہ صاف ہوتا جائے گا۔" اپورب یوں چہرہ بنا رہا ہے جیسے ابھی ابھی کوئی شاداں و رقصاں قسم کا شعر اس کے لبوں پر آنے والا ہو۔ میں مسکرا رہا ہوں لو زندگی

پیاری معلوم ہونے لگی ہے۔

لیکن دوسرے ہی دن زندگی کے معنی بدل جاتے ہیں اور اسی بازار میں کھڑے سڑک کا تجربہ کار ٹھیکیدار کچھ اور ہی قسم کی باتیں شروع کر دیتا ہے، سامنے کے پہاڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ کہتا ہے: "وہ دیکھیے اُن چوٹیوں پر ہوائیں چلنے لگی ہیں۔ وہ دیکھیے، برف اڑ رہی ہے، وہ بادل نہیں ہیں، دھند بھی نہیں ہے، بلکہ ہواؤں سے اڑنے والے برف کے ذرے ہیں جنہوں نے پہاڑوں پر ایک دیوار سی کھڑی کر دی ہے۔ اب یہ دیوار بڑھتی جائیگی۔ اور پھر یہ ہوائیں آہستہ آہستہ نیچے کی طرف اتر آئیں گی۔ اس وقت یوں بازار میں کھڑے رہ کر باتیں کرنا دشوار ہو جائے گا اور بانہال کا راستہ کھلنے کے امکانات اور بھی کم ہو جائیں گے کیونکہ پھر مزدوروں کا اوپر جانا ناممکن ہو جائے گا۔"

"اور ہم اداس رہیں گے۔" ہم سوچتے ہیں۔

"سڑک کا ڈگری یافتہ افضل انجینئر پوچھتا ہے "کتنے دنوں تک یہ حالت رہے گی؟"

شاید آج ہی ہوا بند ہو جائے یا شاید کل ہو اور یا شاید بالکل ہی بند نہ ہو۔ اس بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہوا کسی وقت بھی بند ہو سکتی ہے۔ میں آپ کو بادلوں کے متعلق بتا سکتا ہوں، برف کے متعلق بھی بتا سکتا ہوں۔ مگر ہوا کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہوا آزاد ہوتی ہے، اپنی مرضی کی مالک۔ زمین اور آسمان، اور ان کے درمیان ہر جگہ اس کا گھر ہوتا ہے۔

"اور اپنے گھر میں بلی بھی شیر ہوتی ہے" ہم میں سے کوئی اپنے لمحہ بہ لمحہ بوجھل ہوتے ہوئے ذہن کو ہلکا کرنے کے لئے غیر سنجیدگی کا سہارا لیتا ہے۔

ٹھیکیدار بھی ہنس پڑتا ہے "ہاں، ہوا یہاں شیر کی طرح چنگھاڑتی رہتی ہے اور جب تک وہ وہاں رہتی ہے، بادل لرزتے رہتے ہیں، اور برف پیدا نہیں ہو سکتی۔"

سڑک کے ٹھیکیدار کو اپنے تجربہ پر ناز ہے، اور وہ اس کا اظہار بڑے زور شور سے کرتا ہے، یہ سوچے بغیر کہ ہمارا دل بجھ رہا ہے اور چہروں پر پژمردگی چھائے جا رہی ہے۔

پھر ہماری دم توڑتی ہوئی امید ہمیں ایک سہارا دیتی ہے: "کیا ہم پیدل نہیں جا سکتے؟" پر ٹھیکیدار کا تجربہ، اور اس کی ظالم حقیقت بیانی ہمیں رلائے جاتی ہے۔ "نہیں" وہ کہتا ہے۔ "یہ ہوا آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے۔ اور انسان کے جسم کو ایک تنکا سمجھ کر پرے پھینک دیتی ہے۔ اس لئے پیدل کوئی نہیں جا سکتا۔ البتہ جب یہ ہوائیں نہ ہوں۔ اور برف بھی نہ گر رہی ہو تو بانہال کو پیدل عبور کیا جا سکتا ہے، پر ہے یہ بڑے دل گردے کا کام۔"

"ہم یہ دل گردے کا کام کریں گے"

اور ٹھیکیدار ہماری بے تابی پر مسکرانے لگتا ہے۔

پھر ایک دن یہ دل گردے کا کام کرنے کا وقت آ جاتا ہے۔ ہمیں ویرانے میں پھر سے بہار آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

ٹھیکیدار کہتا ہے۔ "کل کا دن سہانا ہوگا، نہ برف ہو گی، نہ ہوا۔ اگر آپ بانہال کو پھاند کر پار ہونا چاہیں تو آپ پھاند سکتے ہیں۔"

ہم اسے ضرور پھاندیں گے۔ ہمارا ایک ہوم گارڈ، ہر قیمت پر گھر جانے کے لئے بے تاب ہے۔ جس پہاڑ نے درمیان میں کھڑے ہو کر ہمیں سری نگر جانے سے روک دیا تھا، ہم اسے روندتے ہوئے چلے جائیں گے۔ ایک دفعہ ہمیں موقعہ تو ملے:

"کل موقعہ ہے" ٹھیکیدار کہتا ہے اور پھر اس خیال سے کہ ہم اس مہم کے مزید پیچ

پہنچ بھی سمجھ لیں۔ اور اس کے تجربوں سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو جائیں وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہمیں اگر جانا ہی ہے تو جانے سے پہلے یہ جان لینا چاہیئے کہ بانہال کی چوٹی پر برف ہی برف ہوگی اور اس لئے چلتے چلتے اگر ہم ایک لحظہ کے لئے بھی رُکے تو سردی ہمارا خون منجمد کر دے گی۔ ہمارے ساتھی سمجھیں گے کہ رکنے والا دم لینے کے لئے رکا ہے لیکن دراصل وہ خدا کا پیارا ہو چکا ہوگا۔ اس لئے ہم تھکن سے چور ہو جائیں تو بھی چلتے ہی رہیں، رُکیں ہرگز نہیں کیونکہ اسی میں سلامتی ہے۔

"یونہی ہوگا۔ ہم یونہی کریں گے۔" ہم جانے پر تلے ہوئے ہیں۔

اور ٹھیکیدار ہمیں سمجھا رہا ہے کہ اگر چلتے چلتے ہم میں سے کوئی رک جائے تو اُسے رُکنے نہیں دینا چاہیئے۔ ایسے وقت میں اس کے ساتھی کا یہ فرض ہے کہ وہ اسے چلتے لگائے، گھونسے مارے اور اگر اسے گھسیٹنا پڑے تو گھسیٹے بھی۔

میں ایلوب کی طرف دیکھتا ہوں اور ایلوب میری طرف۔ اور ہم مسکراتے ہوئے ٹھیکیدار کو یقین دلاتے ہیں کہ یونہی ہوگا۔

اور ٹھیکیدار کہتا چلا جاتا ہے کہ "بانہال کی اونچائیاں صرف تھکاتی ہی نہیں ہیں جادو بھی کرتی ہیں اور جب ہم اس کی چوٹی پر پہنچیں گے، جہاں سے آسمان صرف دو ہاتھ اوپر معلوم ہوتا ہے، تو ہمیں گانے کی آوازیں آئیں گی اور یوں محسوس ہوگا جیسے ہمارے قریب ہی کہیں پریوں نے رقص و سرود کی کوئی محفل گرم کر رکھی ہو۔ اگر ہم نے اس کی طرف ذرا بھی دھیان دیا یا وہ گانا سننا چاہا تو ہماری رُوح پر کسی اور کا قبضہ ہو جائے گا اور یہ دنیا ہمارے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔"

اور ہمارے تحت الشعور میں کہیں کوئی رومانوی حس بیدار ہو جاتی ہے۔ بانہال کی

چوٹی پر کسی الف لیلوی سرزمین کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ہمیں وہاں ضرور جانا چاہیئے۔ ہم ضرور جائیں گے۔

ٹھیکیدار کہتا ہے، "یہ گانا، اصل میں موت کا راگ ہے۔ بظاہر بے حد میٹھا لیکن اصل میں جان لیوا۔ اسے ہرگز نہ سنیئے گا۔"

"نہیں سنیں گے۔"

اور ایلوب میری طرف یوں دیکھتا ہے، جیسے پوچھ رہا ہو، "کیا واقعی نہیں سنو گے؟"

ٹھیکیدار اپنی رَو میں بہتا ہوا، اپنے تجربوں کے موتی بدستور تار بکھیرتا رہتا ہے اور پھر امین صاحب کے کمرے سے ہوتی ہوئی یہ خبر سارے بانہال میں پھیل جاتی ہے۔ کہ ہم جا رہے ہیں۔ بانہال کے ہر گھر میں، ہمارے لئے مکی کی روٹیاں پکنے لگتی ہیں۔ جو ہم زادِ راہ کے طور پر ساتھ لے جائیں گے۔ اب ہمارے لئے پُولے یعنی گھاس کے جوتے بھی بننے لگتے ہیں، جنہیں ہم کل پہن کر برف پر چلیں گے کیونکہ اُن کے بغیر ہمارے بوٹوں کا قدم قدم پر پھسلنے کا ڈر ہے۔ امین صاحب کے کمرے میں ان ساتھ تلیوں کے انتخاب کے بارے میں بات چیت شروع ہو جاتی ہے جو ہمارے ساتھ چلیں گے۔ میں اور ایلوب اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ ہم پر کچھ رومانٹک سا موڈ طاری ہو رہا ہے۔ آتشدان کے پاس بیٹھ کر ہم بادام توڑتے ہیں، انہیں شہد کے ساتھ کھاتے ہیں اور سگریٹ پیتے ہیں۔ کھڑکی کے شیشوں میں سے نظر آتی ہوئی زمین پر گری ہوئی برف آج بھی حسین معلوم ہوتی ہے۔ ستاروں کی روشنی میں اس پر چاندنی کا گمان ہوتا ہے اور ہم اسے دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں رات ختم ہو، صبح آئے، اور ہم روانہ ہوں، پر رات ہے کہ ختم ہوتی ہی نہیں اور نیند ہے کہ آتی ہی نہیں۔

لیکن اے کاش! یہ رات یونہی رہتی، صبح نہ آتی، کم از کم ہمارے میٹھے خیالوں کی دنیا تو نہ بکھرتی۔

جب رات ختم ہوتی ہے اور صبح آتی ہے تو بانہال کی موسمی روایات، سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہیں۔ اس ویرانے کی ایک رات کی بہار بیت چکی ہے صبح بغیر سورج کے آتی ہے۔ صبح سویرے سویرے ہی سڑک کا ٹھیکیدار ہمارے کمرے میں آتا ہے اور بتاتا ہے کہ "نئی برف گر رہی ہے۔ تین انچ پڑ چکی ہے جس کا صاف مطلب ہے۔ کہ ٹنل کے دوسری طرف تین فٹ ہوگی۔ اب راستہ پھر بند ہو جائے گا۔"

ہم حیران ہو کر اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگتے ہیں "لیکن کل آپ نے ہی تو کہا تھا کہ آج کا دن سہانا ہوگا، نہ برف ہوگی نہ ہوا۔"

اجی صاحب! یہ بانہال ہے۔ اور پھر میں نے آپ کو کہا تھا نا کہ ہوا اپنی مرضی کی مالک ہوتی ہے یہی ہوا تو اس برف کو اڑا کر یہاں تک لائی ہے۔ ٹھیکیدار اپنی کل کی پیشین گوئی کے غلط ہو جانے پر ذرا بھی نادم نہیں۔ بلکہ اب بھی وہ اپنے پرانے انداز نہیں چھوڑتا اور کہتا ہے، "دس دن کم از کم دس دن اور یہ برف متواتر گرتی رہے گی۔ ہوائیں جس برف کو لائیں وہ معمولی نہیں ہوتی۔"

ہمارا جی چاہتا ہے، ہم اپنا سر پیٹ لیں۔

اب مکی کی روٹیاں ہمارا زادِ راہ نہیں بن سکتیں اور گھاس کے جوتے پہننے کی ہمیں حسرت ہی رہے گی۔ پُراسرار خیالوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ اور پریوں کی سرزمین اور ان کا رقص و سرود، ہماری پہنچ سے دور ہو چکا ہے۔ ہم اب وہاں نہیں جا سکتے۔ بندھے ہوئے بستر پوری طرح کھول دیئے جاتے ہیں۔ اور ہوم گارڈز ان لکڑیوں کو پھر سے

اکٹھا کرنے لگتے ہیں، جو انہوں نے اس خیال سے کہ اب جا ہی تو رہے ہیں۔ ڈاک بنگلے کے نوکروں اور بانہال میں اپنے نئے نئے بنے ہوئے دوستوں میں سوغات کے طور پر تقسیم کر دی تھیں۔ اپوروپ میرے غم کو، اور اپنے غم کو دور کرنے کی کوشش میں مسکرا کر پنجابی کا ایک شعر گنگنانے لگتا ہے۔ جس میں کسی بدنصیب نے اپنے نصیب کو ایک بھرپور گالی دی ہے۔ میں بھی مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور پھر ہم کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ جہاں برف بدستور گر رہی ہے۔ تین انچ بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور بانہال کے پہلی طرف اسی طرح فٹوں میں اضافہ ہو رہا ہوگا۔ اے کاش! کوئی کھڑکی کے پردوں کو گرا دے۔ اگرتی ہوئی برف کا یہ منظر دیکھا نہیں جاتا۔

آتش دان میں آگ جل رہی ہے اور شعلے ناچ رہے ہیں اور ہم اس کے قریب بیٹھے ایک ہوم گارڈ سے کشمیری زبان کی وہ کہاوت سن رہے ہیں۔ جس میں کہا گیا ہے کہ اگر تم نے سری نگر چھوڑا اور بانہال پہنچے تو یاد رکھو، بانہال کی بستی میں تمہارا گوشت کوّے کھا جائیں گے۔ اور تمہارا پنجر، ہوائیں اڑا لے کر بکھیریں گی۔

ہوم گارڈ کہہ رہا ہے "صاحب یہ بات کتنا سچ ہے۔ ہم نے سری نگر چھوڑا۔ اور اب اسی واسطے یہاں بانہال میں پھنس گیا اور اب ہم یہاں مر جائے گا، اس برف میں اور سردی میں مر جائے گا۔ ہمارا بزرگ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ جو کہتا تھا۔ وہ سچ ہوتا تھا۔"

اور ہم اسے تسلی دیتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ اگرچہ بانہال واقعی بُرا ہے۔ لیکن اتنا

پر انہیں کہ ہمیں مار ہی دے۔ اور یہ کہ سری نگر سے محبت کرنے والے کسی بوڑھے کشمیری نے جب یہ کہا ہو گا تو سری نگر کو خیر باد کہنے والے کسی منچلے سے اس لئے کہا ہو گا تاکہ وہ وہیں اس کے پاس رہے، اور اُس وقت جب کہ اس کہاوت نے پہلے پہل جنم لیا ہو گا۔ اس کے قدامت پسند جنم داتا نے، بانہال کی برائی صرف اس لئے کی ہو گی کہ وہ سری نگر کے حق میں کہنا چاہتا تھا۔

مگر ہوم گارڈ ہماری نہیں مانتا وہ کہتا ہے "قسم ہے خدا کا صاب! جو بات بڑا لوگ بول گیا ہے وہ جھوٹ نہیں ہوتا تھا، اب ہم مر جائے گا اسی بانہال میں مر جائے گا ہم نے سری نگر کیوں چھوڑا تھا، یہ کیوں بولا تھا۔ کہ ہم اس پہاڑ کو پار کرے گا۔ ہم نے کیوں بولا تھا کہ ہم اس پیر پہ اپنا پیر رکھے گا۔ اب پیر پنجال ہم سے ضرور بدلہ لے گا"۔

ہم اسے پھر تسلی دیتے ہیں مگر بے سود۔

"چرسی!"

جب وہ چلا جاتا ہے تو اپو رب مجھے بتاتا ہے کہ یہ ہوم گارڈ چرس کا عادی ہے۔ اور اگر یہ بانہال کے اتنا خلاف ہو گیا ہے اور یہ پرانی کہاوت اسے اس زور شور سے یاد آنے لگ گئی ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے بازاروں میں چرس نہیں ملتی۔ اب اگر یہ بار بار مرنے کی بات کر رہا ہے تو برف سے ڈر کر نہیں، بلکہ اس لئے کہ اب اسے چرس نہیں ملے گی۔ اور بانہال میں چرس کے بغیر رہنا بھی کوئی رہنا ہے بانہال میں چرس نہیں ملتی۔ اور سگریٹ بھی نہیں ملتے، اور اگر کچھ دن اور یہیں رہنا پڑا۔ تو ہمارے ریڈ لیمپ کے وہ سگریٹ بھی ختم ہو جائیں گے۔ جو بڑی تلاش کے بعد ہمیں صرف محدود تعداد میں ملے تھے۔ اور جو اتنے ذلیل تھے کہ پیتے ہوئے بار بار بجھ جایا کرتے

تھے اور اپو رب انہیں اسی لئے DONT TALK سگریٹ کہا کرتا ہے۔

کیا پھر ہمیں بھی اس چرسی ہوم گارڈ کی طرح اس بانہال میں اس کشمیری کہاوت پر ایمان لانا پڑے گا؟

اپو رب کہتا ہے "آؤ کوئی اور بات کریں۔ غمِ عشق کی کوئی بات۔ کسی ایسے غم کی بات جو ہو تو غم، مگر میٹھا ہو"۔

مگر میں کوئی بات نہیں کرتا، بس بھڑکتی ہوئی آگ اور ناچتے ہوئے شعلوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ اور کوئی بات نہیں کرتا

اور پھر جب رات ہوتی ہے، ہم لحاف اوڑھ کر سو جاتے ہیں تو لحاف کے اندر بھی وہی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ جو آتش دان کے سامنے بیٹھ کر ہوا کرتی ہے خیال انگیز اور جاگتے میں ہی خواب دکھانے والی۔ فرصت کی ان گھڑیوں کی سی جب "بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے" والے مصرعے میں جان پڑ جاتی ہے۔

اور ان خیالوں کے محل میں کسی بن بلائے مہمان کی طرح اچانک ہی اپو رب کی آواز داخل ہوتی ہے:۔

"کیا سو گئے؟"

اور میں جواب دیتا ہوں "نہیں"

اور اپو رب کہتا ہے: "میں سوچ رہا ہوں، کل صبح اپنی بیوی کو ایک تار دوں گا

جس میں صرف ایک ہی لفظ ہوگا، "محبت"!

اور میں سوچتا ہوں: "میں کس کو تار دوں"؟

آتش دان کی لکڑیاں، راکھ بن چکی ہیں، کمرے میں اندھیرا ہے، اور باہر برف چپ چاپ گرے جا رہی ہے، اور ہم پیر پنجال کے قیدی ہیں، اپنے اپنے لحافوں میں سکڑتے جا رہے ہیں، سکڑتے جا رہے ہیں، اور نیند ہے کہ آتی ہی نہیں، اور وقت ہے کہ گزرتا ہی نہیں۔

نفرت کے درمیان

مقام : بٹوت جو جموں سے سری نگر جانے والی بڑی سڑک پر ایک مشہور صحت افزا قصبہ ہے اور جو بانہال اور جموں کے درمیان واقع ہے۔ ہوم گارڈز کی کمپنی جو جموں کے صوبے میں امن قائم کرنے کے لئے آئی تھی۔ لیکن جو اس فساد زدہ اور فساد دیدہ زندگی میں آ کے اپنا سکون بھی کھو بیٹھی ہے۔ چونکہ بانہال کو پار کر کے سری نگر نہیں جا سکی۔ اس لئے بٹوت کے نسبتاً کم سرد مقام پر امن جو سے رکی ہوئی ہے کہ اس کا آئندہ پروگرام ہیڈ کوارٹرز سے طے ہو کر ابھی تک نہیں آیا

وقت ——— جنوری ۱۹۴۸ء کا پہلا ہفتہ

ثبوت میں زندگی کا انداز بڑا انوکھا ہے۔

صبح جتنی دیر سے اٹھ سکتے ہو۔ اٹھو۔ تاکہ بے کاری کی وجہ سے بیحد لمبا دکھائی دینے والے دن کی لمبائی میں کچھ تو کمی ہو اس کے بعد دیر تک دروازوں اور کھڑکیوں کے پردے گرا کر کمرے کی تاریکی میں آتشدان کے پاس بیٹھے ہوئے اپنے آپ کو یہ یقین دلاتے رہو کہ ابھی دن نہیں چڑھا۔ اس کے بعد جب دن اس حد تک چڑھ آئے۔ کہ پردوں کے باوجود سورج کی کرنیں اندر گھس آئیں اور اپنے آپ کو منوانا شروع کر دیں۔ تو دانت صاف کرنے کا برش وغیرہ سنبھال کر وہ انداز اختیار کر لو۔ جو صبح اٹھنے کے بعد کئے جاتے ہیں۔ اور پھر جب دوپہر اپنے شباب پر ہو۔ تو ثبوت کے "پناہ گزین ہوٹل" ناشتہ کے انداز میں چائے پیو۔ پراٹھے کھاؤ اور پھر شام تک اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے آپس میں یہ گفتگو کرتے رہو۔ صبح کے ناشتہ کے بعد ہمیں بھوک کیوں نہیں لگتی؟

"ہمیں ثقیل چیزیں نہیں کھانی چاہئیں" میں کہتا ہوں۔

"ہاں پراٹھے بے حد ثقیل ہوتے ہیں" اپورب کہتا ہے۔

"پر اور کچھ یہاں ملتا بھی تو نہیں" میں غمگین ہو جاتا ہوں۔

"اے کاش! ہم جلد اپنے گھر جا سکیں" اپورب بھی غمگین ہو جاتا ہے۔

اور پھر ایسی ایسی باتیں کرتے ہوئے ہم کمال کامیابی کے ساتھ یہ بھلا دیتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ صبح کھایا تھا۔ وہ اصل میں صبح کے ناشتے دوپہر کے کھانے اور شام کی چائے کا ایک ایسا بھرپور مجموعہ تھا جس کے بعد شام تک کچھ اور کھانا قطعی طور پر ناممکن ہو جاتا ہے۔ اور اگرچہ کہنے کو تو ہم نے گنتی کی صرف دو چیزیں چائے اور پراٹھے ہی کھائے تھے لیکن ان کی تعداد "پناہ گزین ہوٹل" کا سکھ مالک خوب جانتا ہے۔ اور اگر ہم اُسے بل روز کا روز ادا کر دینے والے ہوتے تو ہم بھی خوب جانتے ہوتے۔

پناہ گزین ہوٹل میں ہم صرف اپنا پیٹ ہی نہیں بھرتے بلکہ چائے اور پراٹھے

والے اصلی ناشتے کے بعد چائے کی ایک آخری پیالی کی چسکیاں لیتے ہوئے اور اسے زیادہ سے زیادہ وقت میں ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دن کو گھٹانے اور اپنے لئے مصروفیت پیدا کرنے کی تاک میں بھی لگے رہتے ہیں۔

"سردار: تم راولپنڈی سے کب نکلے تھے" چائے کی پیالی کو جواب ٹھنڈی ہو کر شربت بن چکی ہے اپنے منہ سے ذرا دیر کے لئے ہٹا کر ہم پوچھتے۔

لیکن سردار ہماری ہمت افزائی نہیں کرتا "یہ نہ پوچھئے جناب" اور ہماری طرف دیکھے بغیر وہ اک آہ بھرتا ہے اور اپنے کام میں اس کا استغراق اور شدت اختیار کر لیتا ہے اگر وہ آٹا گوندھ رہا ہو تو آٹے پر اب وہ زور زور سے مکیاں مارنے لگتا ہے اور اگر ہانڈی میں چمچہ ہلا رہا ہو تو اب چمچے اور دیگچی کے ٹکراؤ کی آواز زیادہ اونچی ہو جاتی ہے جیسے وہ ہماری آواز کو دبا لے گی مگر ہم جو کسی نہ کسی طور پر وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ اور جن کا مقصد کوئی نہ کوئی بات کرنا ہے اب "پناہ گزین ہوٹل" کے عملے میں سے کسی اور کی طرف مخاطب ہو جاتے ہیں "سردار کیا راولپنڈی میں بھی تم یہی ہوٹل کا دھندہ کیا کرتے تھے؟"

"یہ نہ پوچھئے" وہ بھی ایک سانس سے کر وہی تنبیہ کرتا ہے جو ہمیں پہلے نے کی تھی مگر اس کے ساتھ ہی ہمارے سوال کا مختصر سا جواب بھی دے دیتا ہے "جناب" "سیلاب گلے پڑی ہے" کسی طرح کی مزید تفصیل کے بغیر اس کے بعد پھر سے چپ سادھ لیتا ہے اور کرسیوں اور میزوں کو دوبارہ ترتیب سے لگانے لگتا ہے۔ چولہے کے سامنے کے برتنوں کی قطار میں سے اگر کوئی برتن اِدھر اُدھر ہو کے قطار کی سیدھ کو خراب کر رہا ہو تو اسے ٹھیک کر دیتا ہے اور اگر اس دوران میں چائے کی پیالیاں خالی ہو چکی

ہوں تو انہیں ہمارے سامنے سے اٹھا کر ذرا فاصلے پر رکھی ہوئی گندے برتنوں والی بالٹی میں ایک چھپاکے کے ساتھ ڈبو دیتا ہے اور ہم اور اپورب دونوں ایک دوسرے کی طرف مسکرا کے دیکھتے ہیں اور ہماری مسکراہٹ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اب ہمیں یہاں سے کہیں اور چلنا چاہیئے، اب ہماری گذر یہاں ممکن نہیں ممکن نہیں ہم بیکاروں کے لئے بھلا ان مصروف آدمیوں میں کیا کام ہو اور ہم کسی اور منزل کی تلاش میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں

ٹھوٹ کے بازار میں بہت کم دکانیں کھلی رہتی ہیں میرا مطلب ہے بازار میں بہت کم دکانیں ہیں جن کے کواڑ کھلے رہتے ہیں۔ ان کھلے کواڑ والی دکانوں میں سے ہر دوکان پر کسی نے چاک سے "مسلم دوکان" لکھ رکھا ہے۔ یہ لکھائی کسی ایک ہی ہاتھ کی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے لکھتے وقت لکھنے والا بڑی جلدی میں تھا۔ ممکن ہے کسی زمانے میں ان دوکانوں کے لکھنے والے بھی کچھ ہو مگر اب تو ان کے اندر صرف بے کسی نظر آتی ہے۔ بلکہ اگر کواڑوں پر "مسلم دوکان" والے حروف نہ ہوں تو شاید یہ پتہ ہی نہ چل سکے کہ کبھی یہاں بھی کوئی دوکان تھی۔ باقی کی دوکانیں جن کے باہر "ہندو دوکان" لکھا ہوا ہے ہمیشہ بند دکھائی دیتی ہیں سنا ہے کھلتی بھی ہیں لیکن ہم جب بھی بازار سے گذرتے ہیں سوائے "پناہ گزین ہوٹل" کے باقی کی ساری دوکانیں ہمیں بند ملتی ہیں ہمیں صابن کی تلاش ہے مگر وہ ہمارے لئے نایاب ہے کیونکہ "پناہ گزین ہوٹل" میں جہاں تک ہماری رسائی ہے یہ نہیں بکتا۔ ہمارے ہوم گارڈز کو نائی کی تلاش ہے کیونکہ ان کے بال بہت بڑھ گئے ہیں لیکن ہم نہیں جانتے وہ ہمیں کیسے مل سکتا ہے اور "پناہ گزین ہوٹل" کے سکھ مالکوں سے ہم اس بارے میں کچھ پوچھتے ہوئے اس لئے گھبراتے ہیں کہ کہیں

ودا سے گالی ہی نہ سمجھ لیں اور ہم پر جو تھوڑی بہت نوازشات انہوں نے ارزاں کر رکھی ہیں۔ ہم ان سے بھی محروم نہ ہو جائیں وہ "سیم سیم" جو دوسری دوکانوں کو کھول سکتا ہے ہم نہیں جانتے اور یہ بات کہ آخر ہم اتنے بدنصیب کیوں ہیں کہ ہمارے سامنے بھی نہیں کھلتیں ہمارے لئے ایک راز ہے۔

اس راز کو دریافت کرنے کے لئے کبھی کبھی ہم بے چین ہو جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت کسی نیم واکواڑ میں سے جھانکتا ہوا کوئی دوکاندار ہمیں نظر آجائے تو قبل اس کے کہ وہ اپنی ایک ہی جھلک دکھا کر پھر سے پردے میں ہو جانے کی سعی کرے ہم اس کے پاس جا پہنچتے ہیں اور موقع کو غنیمت جان کر فوراً استفسار کرتے ہیں کہ آخر بازار پر یہ ہڑتال کی سی کیفیت کیوں طاری ہے۔

دوکاندار ایسے وقتوں میں عام طور پر گھبرا جاتا ہے اور "ہائے میں ان سے کیوں ملا" اور "ہائے یہ مجھ سے کیوں ملے" کی ایک تصویر بن کر۔ رُک رُک کر اور سوچ سوچ کر۔ جیسے آئی بلا کو ٹالنے کے لئے ہاتھ جوڑ دیتا ہے اور اگر کچھ کہتا ہے تو بس یہی۔ کہ "جناب میں غریب آدمی ہوں، میں کیا عرض کر سکتا ہوں"

بظاہر اس کا یہ عذر بڑا معقول نظر آتا ہے کیونکہ غریبوں کی باگ ڈور اکثر کسی اور مہاپرش کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس لئے ایسے موقعوں پر وہ اس طرح کی کوئی بات واقعی ٹھیک طور پر عرض نہیں کر سکتے مگر ہم پھر بھی اپنا اصرار جاری رکھتے ہیں۔ اب اتفاق کی بات ہے کہ آج تک اس معاملہ میں ہم جب بھی مصر ہوئے ہیں ہمارے سوال کا جواب اس "غریب آدمی" کی بجائے ہمیشہ کسی اور ہی سے ملا ہے چنانچہ ایسے وقت میں چپکے سے چند اکر اور دوکاندار کہیں سے آوارد ہوتے ہیں اور ہمارے گرد کھڑے ہو کر "اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا"

کو عملی صورت دینے کے بعد ہم پر اس امر کی وضاحت شروع کر دیتے ہیں کہ ہمارا یہ سوال قطعی طور پر بے معنی ہے اور اس میں کوئی بھی ایسی راز کی بات نہیں جس کے لئے ہم پریشان ہوں اور بات صرف اتنی ہے کہ بھلا یہ بھی کوئی دن ہیں جب دوکانوں میں سودا رکھنے کی توقع کی جائے اور بھلا یہ بھی کوئی وقت ہے جب کہ آدمی ٹھوت سے جموں جائے اور جموں سے کٹھوعہ جائے ——— کٹھوعہ اس لئے کہ اب سیالکوٹ منڈی نہیں رہی نا سیالکوٹ پاکستان میں جو شامل ہو چکا ہے ——— اور پھر کٹھوعہ سے پٹھان کوٹ جائے اور پٹھان کوٹ سے سودا خریدنے کے بعد اپنے لئے یہ دردِ سر مول لے لے۔ کہ یہ سودا ٹھوت تک اب پہنچے تو کیسے؟ لاریاں ساری تو ملٹری کو ڈھونے پر لگی ہیں اور یہ ملٹری والے راہ چلتوں کو لوٹنا اپنا دائمی حق سمجھتے ہیں۔ پھر خواہ مخواہ کسی کی شامت آئی ہے۔ جو وہاں جائے اور "آ بیل مجھے مار" کہے۔ اور فرض کیجئے کہ کوئی من چلا یہ سارے پاپڑ بیلنے پر تل ہی جائے اور پٹھان کوٹ سے سودا یہاں لانے میں کامیاب بھی ہو جائے۔ تب بھی اس کی کیا گارنٹی ہے کہ یہ سودا بک سکے گا سیالکوٹ سے لانے میں سودا سستا پڑتا تھا۔ اس لئے سستا ہی بکتا تھا لیکن اب پٹھان کوٹ سے لانے میں چونکہ لاگت بہت آئے گی۔ اس لئے مہنگا بیچنا پڑیگا اور آج تک نسبتاً سستی چیزیں خریدنے والے گاہک اب یہی چیزیں مہنگے داموں خریدنے کے عادی بنتے بنتے بنیں گے؟

تجارت کے سلسلہ کے بڑے بڑے حقائق ہم پر روشن ہونے لگتے ہیں لیکن عین اس وقت جموں کے "اخبار چاند" کا بلاناغہ مطالعہ کرنے والے اور اپنی دوکان کے تھڑے پر بیٹھ کر ہر روز بڑی باقاعدگی سے اپنے پاس پڑوس والے دوکانداروں کو زمانے کی رفتار۔ پاکستان کی برائیاں اور ہندوستان کی اچھائیاں سنانے والے رام دھن کو خیال پیدا ہونے لگتا ہے کہ اس طرح کی

باتوں سے پاکستان کے سیالکوٹ کو ہندوستان کے پٹھان کوٹ سے بڑھایا جا رہا ہے اور یہ سیاسی طور بری بات ہے —— اور چونکہ ریاست کی ہندوستان کے ساتھ عارضی شمولیت کو ابھی مستقل بنانا ہے اس لئے یہ اور بھی بری بات ہے چنانچہ اس انداز میں جیسے وہ ملک اور قوم کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دے سکنے والا کوئی لیڈر ہو۔ وہ حال سے مستقبل کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ اور ہمیں مخاطب کرتے ہوئے اور سب کو سناتے ہوئے کہتا ہے "صاحب وہ دن دور نہیں جب ہم پٹھان کوٹ سے ہی سودا لایا کریں گے۔ اور پھر ہماری تجارت خوب چمکے گی سستی مہنگی چیزیں خریدنا تو عادت کی بات ہوتی ہے اور بھلا ہم اتنا بھی نہ کر سکیں گے۔ اپنے آزاد ہندوستان کی خاطر بھلا اتنا بھی نہ کر سکیں گے ——"

دوکانداروں کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا جاتا ہے اور جس جگہ ہم کھڑے ہیں وہاں بھیڑ سی لگ جاتی ہے بازار سے گذرنے والے دو ایک ہوم گارڈز بھی شاید ہمیں دیکھ کر اس بھیڑ میں آ شامل ہوتے ہیں جنہیں یہ لوگ یوں دیکھتے ہیں جیسے کوئی کسی بن بلائے مہمان کو دیکھے چنانچہ الپورب اور میں دونوں پریشان ہو جاتے ہیں۔ آہ ہماری ذمہ داریاں! جو ٹھوت میں آ جانے کے بعد ہم سے سنبھالے نہیں سنبھلتیں!

بازار سے واپسی پر الپورب اپنے بوجھل ذہن میں شاید لطافت پیدا کرنے کے لئے گنگناتا ہے "اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا ...... آں آں آں آں ...... اک تماشہ ہوا ......"

اور میں مسکرا دیتا ہوں۔

الپورب کہتا ہے "کہو پنڈت جی۔ دیکھ سن لیا نا ان دوکانداروں کو"

اور مجھے کوئی جواب نہیں سوجھتا۔

جب سے ہم ٹھوت میں ہیں الپورب مجھے اکثر "پنڈت جی" کہہ کے بلایا کرتا ہے۔ کیونکہ ٹھوت کے اکثر لوگ۔ مجھے "پنڈت جی" ہی کہتے ہیں۔ تخاطب کا یہ انداز سب سے پہلے مجھے "پناہ گزین ہوٹل" کے عملے میں سے کسی نے بخشا تھا۔ اور چونکہ ساتھ ہی اس نے اپنی اس مسرت کا اظہار بھی کر دیا تھا جو اسے یہ جان کر ہوئی تھی۔ کہ میں اور الپورب دونوں ہندو ہیں اس لئے ہم نے آج تک اس کی اس خوش فہمی کو برقرار رکھنا ہی مناسب سمجھا ہے آج تک ہم نے اسے یہ کبھی نہیں بتایا۔ کہ ہم میں سے ایک "پنڈت جی" ہے اور ایک نہیں۔ اگر کوئی اسی طور خوش رہتا ہے تو ہم خواہ مخواہ اس کی خوشی اس سے کیوں چھینیں۔ جب کہ اس میں ہمارا کوئی نقصان بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہے۔ یہ اسی کی بدولت ہے کہ ٹھوت کے واحد ہوٹل کے دروازے ہمارے لئے وا ہیں۔ لوگ ہم سے نسبتاً کھل کے بات کر لیتے ہیں اور پناہ گزین ہوٹل والے بھی اپنی مصروفیات کے باوجود کبھی کبھار لہر میں آ کر ہم سے ملکی دکھ سکھ پر تبصرہ بھی کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر انہیں معلوم ہوتا کہ ہم دونوں میں سے صرف الپورب ہی ہندو ہے تو وہ ہمیں ٹھوت کے لوگوں کا یہ نکتۂ نظر کبھی نہ بتاتے کہ ٹھوت کے یہ سارے دوکان دار ہمارے ہوم گارڈز کو صرف اس لئے نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کہ ان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور اس کے علاوہ یہ عبداللہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ جو خود بھی مسلمان ہے اور بقول ٹھوت کے لوگوں کے بھلا مسلمانوں کا ٹھوت کی اس ہندو بستی میں کیا کام؟

"پنڈت جی سوچا جائے تو آخر کو تو عبداللہ بھی مسلا ہی ہے نا۔ ہمارا ان مسلوں کا اب کیا ناطہ۔ وہ جائیں اپنے پاکستان میں۔ یہاں کشمیر میں کیا کر رہے ہیں۔ کشمیر تو اب ہندوستان میں شامل ہو ہی چکا" ایک دن ان میں سے ایک نے یہ سیاست بھی بگھیری تھی۔ اور پھر

ایمٹ ان کسی اور نے ہم کو یہ راز کی بات بھی بتائی تھی کہ بٹوت کے دوکانداروں نے جو بہانہ تراشا ہے وہ بظاہر تو سچ معلوم ہوتا ہے۔ دراصل میں یہ بات نہیں کہ وہ سودے کی وجہ سے مجبور ہیں بلکہ اب تو مسلمانوں کی دوکانوں کو لوٹ لوٹ کے انہوں نے اپنی دوکانوں کو اور بھی زیادہ بھر رکھا ہے۔ صرف بات یہ ہے کہ وہ ہوم گارڈز کو سودا نہیں دینا چاہتے۔ اور چونکہ ہم بھی ان ہوم گارڈز کے ساتھ ہیں اسی لئے ہم کو بھی مصلحت کے طور پر اسی اصول کی لاٹھی سے ہانکا جا رہا ہے۔ تاکہ ہم جلدی واپس چلے جائیں۔ اور زیادہ دیر یہاں نہ رہیں۔

"پنڈت جی آپ چلے جائیں نا۔ آپ کا کیا جاتا ہے۔ آپ تو ہندو ہیں اور پھر افسر ہیں! اپنے ماتحت ہوم گارڈز کو لے کے چلے جائیں نا۔ تاکہ۔۔۔" کبھی کبھی پناہ گزین ہوٹل والوں میں سے کوئی بڑے لاڈ سے اور بڑے بھولپن کے سے انداز میں ہم سے کہتا ہے کہ پھر بات ادھوری چھوڑ کر ہنسنے لگتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ ہم خود بخود ہی اس کی ان کہی بات سمجھ لیں۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ ہماری ذہانت اس سلسلہ میں ہماری کوئی رہنمائی نہیں کر رہی، وہ کچھ اس طور پر کہ ہمارے احترام کے جذبہ کو بھی ٹھیس نہ پہنچے۔ ذرا جھینپی جھینپی شرمائی شرمائی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں مشورہ دیتا ہے کہ ہم لوگ اب تو جتنے جلدی ہی چلے جائیں تو بہتر ہو تاکہ اس طرح سے ملک اور قوم کی خدمت کا وہ پروگرام جو ہماری آمد کی وجہ سے نہیں لگ سکا تھا اب پھر سے شروع کیا جا سکے "ہم پھر سے سنگھ والوں کو بلا لیں گے۔ وہ نزدیک ہی رہتے ہیں۔" ان میں سے کوئی کہتا ہے۔

اور جب ہم بے تاب سا ہو کر پوچھتے ہیں "کہاں رہتے ہیں وہ؟" تو وہ ہنس کے دوہرے ہو جاتے ہیں۔ مگر بتاتے بالکل نہیں۔

اور شاید یہ ان کی اسی ہنسی کی وجہ سے ہے۔ کہ شام کو جب ہم اپنے کمرے میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ اور سامنے کی سڑک پر ہمیں وہ لوگ لفٹ رائٹ کرتے نظر آتے ہیں جو

للت کمار عرف للی انسپکٹر پولیس بٹوت کے قول کے مطابق مقامی ہوم گارڈز ہیں۔ جن کو ٹریننگ دی جا رہی ہے تو ہمیں اور اپورب شکوک اور شبہات کی دنیا میں آباد کر لیتے ہیں۔

"مجھے یقین ہے۔ یہ سب کے سب سنگھی ہیں جنہوں نے ہوم گارڈز کا چولا بدل رکھا ہے" اپورب اکثر کہتا ہے اور مجھے اس کا یہ خیال بالکل ٹھیک معلوم ہوتا ہے لیکن جب کبھی ہم للی سے اس بارے میں کچھ پوچھتے ہیں تو وہ ہمیشہ ہنس دیتا ہے۔ "واہ بھئی واہ۔ آپ بھی خوب سوچتے ہیں۔" اور پھر یوں ہمیں تھوڑا سا خفیف سا کر کے وہ دفعتاً سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اور بڑے کاشف اسرار پیرائے میں ہم سے کہتا ہے "دیکھئے نا۔ فساد ہوا۔ مسلمان کم تھے اس لئے ڈر کی وجہ سے بھاگ گئے اور یہاں صرف ہندو ہی رہ گئے انہیں لوگوں میں سے ہمیں ہوم گارڈز بھرتی کرنے تھے۔ اب آپ اگر ہر ہندو کو سنگھی سمجھ لیں تو آپ کی مرضی۔"

اب للی کچھ اس انداز میں ہماری طرف دیکھتا ہے۔ جیسے کہہ رہا ہے۔ "ابھی تم ناتجربہ کار ہو تمہیں بہت کچھ سیکھنا ہے اور میں للی ہوں سب کچھ سیکھا ہوا۔"

"آؤ سگرٹ پئیں" للی اب ہم پر شفقت کرنے کے موڈ میں آجاتا ہے۔ اور پھر یہ دیکھ کر کہ سگرٹ جیسی کمیاب شے کے نام نے ہم پر اس کے حسب خواہش اثر کیا ہے اور ہم اور سب کچھ بھولنے لگے ہیں وہ نہایت لاپروائی سے ہنستا ہے "لیکن یہاں نہیں گھر چلتے ہیں وہاں آتشدان کے پاس بیٹھ کر مزے سے سگرٹ پئیں گے۔ اور باتیں کریں گے۔"

اس کے بعد للی جو بٹوتیوں میں ہمارا سب سے بڑا دوست ہے ہمیں گھر لے جاتا ہے سگرٹ پیش کرتا ہے ہمیں بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ بار بار تکلف آمیز جملے کہتے ہوئے اور بار بار ہنستے ہوئے آتش دان کے پاس بٹھاتا ہے لیکن باتیں نہیں کرتا۔

"اوہ معاف کرنا میں ابھی آیا" ہمارے پاس وہ بیٹھتے ہی کو ہوتا ہے کہ اسے کوئی کام

یاد آجاتا ہے۔ اور چونکہ اس وقت ہمیں لّلی سے زیادہ اس کے دیئے ہوئے سگرٹ اہم معلوم ہو رہے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم اس کا یوں دفعتاً چلے جانا نظرانداز کر دیتے ہیں! البتہ آگ کے پاس اکیلے بیٹھے ہوئے ہم یہ ضرور سوچتے ہیں کہ یہاں ثبوت میں ہم سے ہر ایک یہی کہتا ہے کہ سگرٹ نہیں ملتے۔ پھر لّلی کے پاس یہ ڈھیروں کے ڈھیر سگرٹ کہاں سے آجاتے ہیں۔

لّلی کا کام ہمیشہ طویل ہوتا ہے اور اگر طویل نہ ہو تو یوں ہوتا ہے کہ ایک کام میں سے کوئی دوسرا اور دوسرے میں سے کوئی تیسرا نکل آتا ہے اور اس لئے ہمیں اس کی واپسی کا بڑی دیر تک منتظر رہنا پڑتا ہے یہ واپسی کبھی تو ہو جاتی ہے لیکن اکثر نہیں ہوتی اور جب نہیں ہوتی تو ہم بڑی کثرت سے سگرٹ پینے کے بعد تنگ آکر باہر نکل آتے ہیں اب جب ہم بازار میں سے گزر رہے ہوتے ہیں تو ہمیں کہیں نہ کہیں لّلی ضرور مل جاتا ہے بازار کی کسی نکڑ پر سرِ راہ اپنی کچہری لگائے۔ یا بازار میں کسی دوکان کے نیم واکواڑ کے پاس کھڑا کسی دوکان دار سے باتیں کرتا ہُوا۔

وہ معذرت بالکل نہیں کرتا بلکہ ہمیں دیکھتے ہی اس کی باچھیں یوں کھل جاتی ہیں جیسے وہ وہاں کھڑا ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اور چونکہ انتظار کرتے کرتے اُسے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اس لئے اگر ہم اب بھی نہ آتے تو اُسے بڑا دکھ ہوتا۔

"بھئی یہ دیکھو۔ تمہارے کام بھی مجھے کرنے پڑتے ہیں" وہ دور ہی سے ہمیں دیکھ کر چلاتا ہے۔ اور پھر جب ہم قریب پہنچتے ہیں تو وہ ہمارے ہاتھ میں ایک کاغذ تھما دیتا ہے جس پر کوئی درخواست لکھی ہوتی ہے ——— بحضور فیض گنجور جناب والا شیر کشمیر صاحب بہادر گذارش دربارۂ کمترین یہ ہے کہ ......"

اس کے بعد درخواست میں ہمارے ہوم گارڈز کے خلاف شکایت لکھی ہوتی ہے کہ آج سے قریباً ڈیڑھ ماہ پہلے جب یہ لوگ بھدرواہ جاتے ہوئے شب بسری کے لئے ٹبوت میں ٹھہرے تھے تو انہوں نے چاول پکانے کے لئے ایک دیگچی لی تھی جو اب تک انہوں نے واپس نہیں کی۔ اب بھدرواہ سے واپس آنے کے بعد دیگچی کے مالک نے اُن سے اپنی چیز کئی بار مانگی ہے مگر وہ ہمیشہ اسے مذاق میں ٹال دیتے اور اب وہ مجبور ہے۔

"جناب اب میں مجبور ہوں اب میرا انصاف شیر کشمیر ہی کریں گے۔" دیگچی کا مالک ہمیں درخواست پڑھتے ہوئے دیکھ کر بڑا مظلوم سا بن کر کہتا ہے۔

ہمیں اُس کی یہ مظلومیت قطعاً متاثر نہیں کرتی۔ بلکہ اس کے برعکس ہم ہنس دیتے ہیں۔ اور ہماری یہ ہنسی سنجیدگی کے اس ماحول میں چونکہ بڑی بے موقع معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے صورت حال پر اس کا کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا اب لّلی جو پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو چکا ہوتا ہے ہمیں جلدی سے ذرا الگ لے جاتا ہے "تم ہنس رہے ہو لیکن معاملہ واقعی بے حد اہم ہے۔ دیگچی جیسی حقیر شے بھی بڑے بڑے طوفان بپا کر سکتی ہے۔ میں بازار میں آیا تو دیکھا کہ اس کی یہ درخواست بہت سے دوکاندار کھڑے پڑھ رہے ہیں اور ہوم گارڈز پر پیخ پا ہو رہے ہیں۔ یہ بہت بُری بات ہے اور شاید اسی لئے ہی یہ لوگ ہوم گارڈز کو پسند بھی نہیں کرتے" ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ ہوم گارڈز کو کیوں پسند نہیں کرتے ہم اس کی وجہ بھی جانتے ہیں اب بھی ہم ساری بات سمجھ جاتے ہیں لیکن لّلی سے کچھ نہیں کہتے۔ اس سے کہنے میں ہمیں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔

بعض اوقات لّلی کو ہم بازار کے کسی گوشے میں بیٹھا ہوا پاتے ہیں رہگزر پر ہی اپنا دفتر لگائے ہوئے جب ہم قریب پہنچتے ہیں تو لّلی بڑے تپاک سے خیر مقدم کرتا ہے ......" اخاہ

بھئی بڑے وقت پر پہنچے معاملے کا تعلق تمہیں سے تھا۔ آؤ بیٹھو"

للّی کی عدالت میں اس وقت ایک مقدمہ پیش ہوتا ہے جس میں کوئی نیا مدعی ہمارے ہوم گارڈز پر کوئی نیا الزام لگا رہا ہوتا ہے للّی ہمیں اب اپنے ساتھ بٹھا لیتا ہے اور مقدمے کی سماعت میں ہمیں بھی شامل کر لیتا ہے۔

"اچھا تو رچی رام۔ اس سامان کی تفصیل کیا تھی جو ہوم گارڈز نے تم سے چھینا" للّی مدعی سے پوچھتا ہے۔

اور رچی رام مدعی یہ تفصیل بتانے میں بڑی تیزی برتتا ہے" جناب۔ ایک کمبل تھا۔ ایک بٹوہ جس میں مبلغ نو سو روپے تیرہ آنے چھ پائی تھے۔ ایک کلہاڑی تھی۔ ایک ...."

اپنے ہوم گارڈز کی وکالت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہوئے میں رچی رام کی بات کاٹ دیتا ہوں "یہ کلہاڑی تمہارے پاس کیوں تھی۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ اس طرح کے ہتھیار اپنے پاس رکھنے کی ہم نے اس علاقے میں ممانعت کر رکھی ہے"

رچی رام ایک لمحہ کے لئے گھبرا سا جاتا ہے مگر جلد ہی اسے جواب سوجھ جاتا ہے "جناب میں فارسٹ گارڈ ہوں اور جناب جانتے ہی ہوں گے کہ کلہاڑی کے بغیر فارسٹ گارڈ بیکار ہوتا ہے۔

رچی رام کے چہرے پر اطمینان کی اور فتح کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور ذرا سا مسکرا کر اب وہ باقی کی تفصیل سنانے لگتا ہے "جناب جیسا کہ عرض کیا گیا ہے۔ کلہاڑی تھی ایک جرسی تھی تین عدد پرندے تھے اور ...."

تیز وطرار اور چھٹا ہوا رچی رام جس نے اب تک اپنے آپ میں خاصی خود اعتمادی پیدا کر لی ہے۔ ذرا کی ذرا رکتا ہے اور پھر خاص طور پر مجھے مخاطب کر کے کہتا ہے" اب

جناب پوچھیں گے کہ میرے پاس پرندے کیوں تھے تو بڑے ادب سے عرض ہے کہ میں اس وقت اپنے گھر جا رہا تھا۔ اپنی بیوی سے ملنے ...."

یہ کہتے ہوئے رچی رام کی آنکھوں میں شرارت کی ایک چمک لہراتی ہے اور وہ للّی کی طرف دیکھتا ہے۔ جیسے اپنے اس طنز کے لئے اس سے داد طلب کر رہا ہو۔ پر للّی میرا لحاظ کر جاتا ہے اور اس کے اس طنز پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔

میں البتہ رچی رام کی اس حرکت کا برا مان کر زیادہ پروقار اور زیادہ سنجیدہ بن جاتا ہوں "تو رچی رام تم کہتے ہو کہ تم فارسٹ گارڈ ہو۔ پھر اتنی بڑی رقم تمہارے پاس کہاں سے آئی فارسٹ گارڈ کی تنخواہ تو بہت تھوڑی ہوتی ہے"۔

اب کے میرا حملہ کامیاب رہتا ہے۔ رچی رام کی ساری تیزی طراری جاتی رہتی ہے لیکن فوراً ہی للّی اس کی مدد کو آ پہنچتا ہے اور وہ نازک گھڑی آ جاتی ہے جب للّی ایسے موقعوں کا اپنا خاص الخاص حربہ اختیار کیا کرتا ہے وہ مجھے اور اپور ب کو ایک طرف الگ لے جاتا ہے اور پھر اس کا لہجہ بڑا پُر معنی بن جاتا ہے" دیکھئے نا۔ معاملہ بے حد نازک ہے فارسٹ گارڈ ہونا تو خیر پھر بھی بڑی چیز ہے اس زمانے میں تو معمولی معمولی آدمی بھی اپنی عمر بھر کی نقدی قسم کی کمائی اپنی جیب میں رکھنے میں ہی سلامتی سمجھتے ہیں کون جانے کب کیا ہو جائے۔ بہر حال .... بہر حال میں اس سے کہہ سن کر اس معاملے کو رفع دفع کر دوں گا تم بھی اپنے طور پہ اپنے ہوم گارڈز کو سمجھا دینا کہ وہ شہر کے نواح میں ہرگز نہ پھرا کریں اس سے اندیشہ فساد ہے" ہم للّی کی اس خداواسطے کی نوازش پر جھلا اٹھتے ہیں" دیکھو بھئی للّی، ہمارے ہوم گارڈز یہ حرکت کبھی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ لوگ ایک محدود علاقے کے باہر کہیں جا ہی نہیں سکتے اس لئے اصل معاملہ یہ نہیں بلکہ اصل معاملہ یہ ہے ...."

للّی بات کاٹ دیتا ہے اور ہنسنے لگتا ہے بہر حال رہنے دو۔ میں سمجھ گیا اصل معاملہ جو کچھ بھی ہو میں اسے ختم کر دوں گا"

للّی کیا سمجھتا ہے اور وہ ہماری بات کیوں نہیں سنتا ——— ہم دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہیں بڑی بے چینی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور بہت کچھ کہنے کی خواہش کے باوجود کچھ نہیں کہہ سکتے للّی اس دوران میں پھر سے رچی رام کے پاس جا پہنچتا ہے اور اسے پولیس والوں کے مخصوص انداز میں ڈانٹتا ہے اس کے بعد ادھر ادھر کی دو ایک انٹ شنٹ چلا کر پھر سے ہمارے پاس آتا ہے اور پھر ہی ہی اور پھر "لو بھئی سگرٹ پیو"۔ اور اپنے سر کو ہلاتے ہوئے" توبہ ہمارا محکمہ بھی کتنا بک بک والا محکمہ ہے" کہتے ہوئے ٹھوٹ میں پولیس کے کارناموں کے موضوع پر گفتگو شروع کر دیتا ہے جس میں سب سے نمایاں اس کی اپنی ذات ہوتی ہے اور جس میں وہ اپنی ہزاروں لاکھوں برائیاں کچھ اسی انداز میں بیان کرتا ہے جیسے وہی اس کی عظمت کی دلیلیں ہوں۔

ٹھوٹ میں ایسے موقعے اکثر آتے رہتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ جب بھی للّی ہمیں کسی راہگذر پر اپنی عدالت سجائے نظر آتا ہے مقدمہ عام طور پر ہمارے ہوم گارڈز کے متعلق ہوتا ہے انہوں نے فلاں کے ساتھ زیادتی کی یہ سینہ زوری ہے اور اس لئے اندیشۂ فساد ہے فلاں کی فلاں چیز انہوں نے چرائی اور اس سے اندیشۂ فساد ہے فلاں سے انہوں نے کوئی مال چھینا یہ ڈاکہ ہے اور اس سے اندیشۂ فساد ہے انتہا یہ ہے کہ قصہ آدم کی اس کوی کو رنگین کرنے کے لئے اگر کسی کے لہو کا تذکرہ مقصود ہوتا ہے تو وہ لہو بھی ہمارے ہوم گارڈز ہی کا تصور کیا جاتا ہے للّی کی ہر عدالتِ راہگذر کی بنیاد کسی نہ کسی طور ہمارے ہوم گارڈز سے جا ملتی ہے"

"فریاد ہے حضور فریاد ہے!!" للّی کے گرد تین چار مرد کھڑے چیخ رہے ہیں" حضور فریاد ہے۔ ہم فریاد کرنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ رات کو دو ہوم گارڈز نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا۔ ہم سوئے ہوئے تھے کہ وہ ہمارے ہاں ایک کھڑکی کی راہ داخل ہو گئے۔ جو کھلی رہ گئی تھی۔ لیکن چونکہ ہمیں پتہ چل گیا۔ اس لئے انہیں جلد ہی بھاگنا پڑا۔"

قریب ہی ان کی "عزت" بھی ان کی فریاد میں رنگ بھرنے اور ان کے بیان کو مزید تقویت دینے کے لئے کھڑی ہے اور وہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔ حضور ان دونو گارڈز کو ہم پہچان سکتے ہیں لیکن اگر آپ چاہیں تو یہ لڑکی بھی پہچان سکتی ہے"۔

ہماری موجودگی میں ان کی فریاد اور بھی سوزناک ہونے لگتی ہے اور یہ دیکھ کر کہ کسی کی "عزت" ہمارے ہوم گارڈز کی "عزت" کو برباد کرنے پر آمادہ ہے۔ اور گھونگھٹ والی ایک گوری تلی ہوئی ہے کہ ہمارا سارا وقار خاک میں ملا دے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا کریں تاہم چونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے قانون اور ضابطے کچھ ایسے ہیں کہ رات کو "سونی لاج" سے جہاں کہ ہمارے ہوم گارڈز ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہزار کوشش کے باوجود بھی کوئی باہر نکل سکتا۔ اس لئے ہم فوراً اس کی صفائی پیش کرنے لگتے ہیں اور چونکہ یہ صفائی پیش کرتے وقت اپنے سچا ہونے کا اعتماد ہم پر غیر شعوری طور پر کچھ ایسی کیفیت طاری کر دیتا ہے جیسے ہم ابھی ابھی آستینیں چڑھانے والے ہوں اور ابھی ابھی مرنے مارنے والا قصہ بھی شروع ہونے والا ہو۔ مجمع جیسے مرعوب ہو کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اور للّی کا پولیس پن اُسے فوراً اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ ہمیں حسبِ معمول ذرا الگ لے جائے۔ سگرٹ پلائے اور پھر ہم سے کہے کہ دیکھئے نا آپ تو یونہی ناراض ہوئے جاتے ہیں۔ اگر یہ غلط ہے تو پرے ہٹائیے میں بھی اسے غلط ہی سمجھتا ہوں۔ اور ابھی انہیں ٹرخائے دیتا ہوں" اور پھر اس کے ساتھ ہی

یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اس کے ہمارے ساتھ تعلقات کچھ ایسے ویسے نہیں۔ بلکہ بڑے گہرے ہیں وہ نہایت رازدارانہ انداز میں۔ ہم میں سے کسی ایک کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے ——— "میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات ہوئی ضرور ہو گی ورنہ یہ چھوکری یوں کبھی نہ آتی۔ البتہ ممکن ہے معاملہ کرنے والے ہوم گارڈز نہ ہوں بلکہ وہ ہندوستانی سپاہی ہوں جو کل رات یہاں پہنچے تھے اور پناہ گزین ہوٹل میں ٹھہرے تھے"

تو آؤ۔ پناہ گزین ہوٹل میں چلتے ہیں۔ ابھی معاملہ سلجھ جاتا ہے" ہم میں سے کوئی مشورہ دیتا ہے'

لیکن للی وہاں جانا پسند نہیں کرتا "جانے دو۔ اب وہاں کون جائے میں نے کہا ہے۔ ناکہ میں اس معاملے کو ابھی نپٹائے دیتا ہوں"

پھر جلد ہی للی کا رازدارانہ انداز اور بھی رازدارانہ ہو جاتا ہے "بھئی بات یہ ہے۔ کہ ان فوجی لوگوں کو کسی ایسے مقدمے میں پھنسانا ٹھیک نہیں وہ ہمارے مہمان ہیں۔ اتنی دور ہندوستان سے آئے ہیں۔ اور ہماری خاطر اپنی جانیں لڑا رہے ہیں اس لئے یہ بُری بات ہو گی۔ یوں بھی ایسی باتوں سے بڑی بدنامی ہوتی ہے ہندوستان کی عزت پر حرف آتا ہے اور ہمارا فرض تو یہ ہے کہ ہم ہندوستان کا وقار پیدا کریں اس کے قدم کشمیر میں پورے طور پر جمانے میں مدد کریں۔ نہ یہ کہ سربازار انہیں رسوا کرتے پھریں۔ اور ابھی سے ہمارا سلسلہ چوپٹ کر دیں"

للی ہماری طرف دیکھتا ہے۔ جیسے داد طلب کر رہا ہو "دیکھا میں کتنا دوراندیش ہوں"۔ جیسے کہہ رہا ہو "تم بھی مجھ سا بننے کی کوشش کرو۔ فرض شناسی کا سبق سیکھو"

پر ہم اس جیسا بننے کی کوشش نہیں کرتے۔ فرض شناسی کا سبق بھی اس سے نہیں سیکھتے۔ بلکہ اس کے لئے ایک مختلف راہ اختیار کرتے ہیں۔ اب ہماری فرض شناسی ہم سے کہلواتی ہے کہ للی صاحب۔ ابھی ابھی جب آپ ہوم گارڈز کو لتاڑ رہے تھے تو کیا اُس وقت آپ کو کسی کی عزت کا خیال نہیں آیا تھا کہ اس سے بھی بڑی بدنامی ہوتی ہے اور کشمیر کی عزت پر حرف آتا ہے"۔

اب کے ہماری سنجیدگی للی کو چونکا دیتی ہے۔ اور وہ اس معاملے کو ختم کر دینے کا قطعی عزم کر لیتا ہے "ارے بھئی وہ تو اور بات تھی وہ تو ہمارا اپنا گھر کا معاملہ تھا بہرکیف جانے دو۔ خواہ مخواہ بدمزگی ہوئی۔ میں ابھی انہیں نپٹائے دیتا ہوں"۔

اور اس کے بعد للی ان کی طرف مخاطب ہو کر ذرا اونچی آواز میں اُن سے یہ کہتے ہوئے کہ "کل تھانے میں آنا۔ تب تک میں تحقیقات مکمل کر لوں گا" ان کے پاس اپنا ایک آدھ سپاہی چھوڑ کر اور ہمیں ساتھ لے کر چل پڑتا ہے۔

بھئی تھک گیا ہوں۔ چلو تمہارے ہاں چلتے ہیں ڈاک بنگلے میں"۔ للی کہتا ہے اور ہم سب ڈاک بنگلے کا رخ کر لیتے ہیں۔ اندر ہی اندر اپنی بے بسی پر اُبلتے ہوئے اور للی ہمارے اس ابال کو دھیما کرنے کے لئے موضوع کو ہچکولے دیتے ہوئے کبھی ادھر کی اور کبھی ادھر کی ہانکتے اُسے آہستہ آہستہ خوشگوار بنانے کی کوشش کرتے ہوئے ——— "خدا بچائے۔ پولیس کے کیچڑ سے ہم لوگ تو ہر وقت جیسے غلاظت میں جیتے ہیں۔ اِس کی سنو اُس کی سنو اور ہوتا ہے سب اوٹ پٹانگ۔ کاش! ہمیں بھی کہیں کسی کالج کی پروفیسری مل جاتی۔ پڑھے لکھے شریفوں کے ماحول میں رہتے۔ ان کی اونچی اونچی باتیں سنتے۔ کم از کم اس بک بک جھک

جنک سے تو جان چھوٹی رہتی ہے بڑے خوش نصیب ہیں آپ لوگ......"

جب ہم ڈاک بنگلے میں پہنچتے ہیں اور للی ہمارے کمرے میں ہوتا ہے تو کارلو کے ماحول کی عطا کی ہوئی ہماری پیشہ ورانہ "خوش اخلاقی ہمیں سمجھاتی ہے کہ کبھی غصہ اگل دو، ڈ للی کو معاف کر دو جو کچھ اس نے کیا وہ اس کا فرض تھا اور جو کچھ تم نے کیا وہ بھی تمہارا فرض تھا اس لئے اب اپنے اپنے فرض کی ادائیگی کے بعد بدمزگی کو خواہ مخواہ چٹکیاں دے دے کے پالنا کہاں کی عقلمندی ہے" چنانچہ سگریٹوں کے دھوئیں میں ہم ناخوشگوار باتیں بھولنے لگتے ہیں اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس موضوع پر گفتگو کرنے لگتے ہیں کہ نہ جانے ہماری بھوک کو اس ثبوت میں آ کے کیا ہو گیا ہے صبح کے ناشتے کے بعد ہمیں سارا دن بھوک ہی نہیں لگتی للی ہنسنے لگتا ہے۔ اور ہم تو خیر اس کے ساتھ ہنسنے کے قائل ہو ہی چکے ہیں۔

لیکن یہی بات یہ ہے کہ اس ہنسی سے ہمارا دکھ نہیں گھٹتا اس سے تلافی نہیں ہوتی اور ثبوت میں اپنی بے بسی کا احساس ہمیں قدم قدم پر ہوتا ہے یہاں للی کے علاوہ بھی ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں ہم اپنا دوست کہہ سکتے ہیں لیکن وہ تسکین جس کے ہم خواہاں ہیں ہمیں نہ للی سے ملتی ہے اور نہ کسی اور سے ان کے پاس بیٹھے ہوئے ہنسی اور قہقہوں کے درمیان بھی ہمیں کسی خلا کا احساس رہتا ہے کوئی ان دیکھی دیوار ہمارے اور ان کے درمیان حائل نظر آتی ہے اور ہم ان کی روح کو نہیں چھو سکتے ثبوت میں منزلوں کی بھی کمی نہیں چیڑ کے ہر درخت کے نیچے اور اونچی نیچی راہوں

کے کنارے کسے ہر پتھر پر بیٹھ گیا ہے آپ کو قدرت کے وسیع دامن میں سمو کے ہم اپنی ایک دنیا بسا سکتے ہیں لیکن یہ دنیا حقیقی نہیں ہوتی فرار کا یہ انداز جلد ہی ہمارے لاشعور سے شعور میں آ جاتا ہے۔ اور شاید ابھی سے ہر ایسی منزل پر پہنچ کر ہمیں یہ احساس پریشان کر دیتا ہے کہ جس منزل کی ہمیں تلاش ہے وہ کہیں اور ہے اور جس کارواں کے راہی ہم ہیں اس کا کوئی ساتھی اس ثبوت میں نہیں۔

ثبوت میں ہمارا کوئی نہیں اور اسی لئے ہم کئی مرتبہ سارا سارا دن اپنے کمرے میں ہی بیٹھے رہتے ہیں، پناہ گزین ہوٹل سے چائے اپنے کمرے میں ہی منگوا لیتے ہیں اور پہلے پڑھی ہوئی کتابوں کا سہارا لیتے ہیں ان کی باتیں کرتے ہیں۔ اور پھر جب ان کتابوں کی باتوں سے اکتا جاتے ہیں تو جیسے ہمارے احساسات بوجھل ہو کر بوڑھے سے بن جاتے ہیں۔ اپنے خوابوں کے ان ویرانوں کو کریدنے لگتے ہیں جن میں ماضی کی بہت سی یادیں دفن ہوتی ہیں وقت چپ چاپ گزرنے لگتا ہے اور یوں ہی گزرتا رہتا ہے سہ پہر کے بعد سردی شروع ہو جاتی ہے اور پھر جب شام پڑنے لگتی ہے تو ڈاک بنگلے کا چوکیدار چپکے سے آ کر آتشدان کی آگ روشن کر جاتا ہے کہ کمرے میں اندھیرا نہ رہے اور لیمپ اس لئے روشن نہیں کرتا کہ مٹی کا تیل نہیں ہوتا اب کمرے کی دھندلی دھندلی فضا خواب ناک سی ہو جاتی ہے سارا دن بیٹھے بیٹھے باتیں کرتے رہنے کے بعد احساسات کی شدت ہمیں اداس کر دیتی ہے آہستہ آہستہ کتابوں کا ذکر بوجھل بن جاتا ہے۔ اپنے ماضی کی "حسن پرستی" اور اس "حسن پرستی کی" "بوالہوسی" پر اب ہنسنے کو بھی جی نہیں چاہتا ہم خاموش ہو جاتے ہیں اور سلگتی ہوئی لکڑیوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتے ہیں۔ لکڑیاں جل رہی ہیں کوئلے

بن رہے ہیں راکھ بن رہی ہے اور تھوڑی دیر بعد الپورب دفعتاً پھر بولنے لگتا ہے اور اس کی آواز یوں سنائی دیتی ہے جیسے دور دھندلکوں کے کسی جزیرے سے آرہی ہو۔ وہ کہہ رہا ہے۔ نہ جانے ماضی ہمیشہ دلکش کیوں ہو جاتا ہے جب یہ واقعات بیت رہے ہوتے ہیں تو خیال ہی نہیں ہوتا کہ کبھی یہ یادوں کے خزانے بن جائیں گے لیکن جب یہ بیت چکتے ہیں اور زمانہ پھر کبھی ان کی یاد دلاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے جیسے ہم بھی کبھی جوان تھے۔"

اور پھر وہ ذرا سا رک کر خود ہی کہتا ہے یہاں تھرٹ میں اگر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم بوڑھے ہو چکے ہیں وہ جوانی میں ماضی کبھی رلایا نہیں کرتا مستقبل اپنی جھلک دکھاتا ہے۔"

الپورب سچ کہتا ہے تھرٹ نے ہمیں بوڑھا بنا دیا ہے

پھر الپورب دفعتاً جیسے کسی شعوری کوشش سے ان اداس خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دینا چاہتا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تازہ و ہلکی مسکراہٹ دکھائی دیتی ہے اور وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے سگریٹ پینے کو بہت جی چاہ رہا ہے وہ کہتا ہے پھر ایک انگڑائی لیتا ہے اپنی جیبوں کو ٹٹولنے لگتا ہے۔ ساری جیبیں دیکھنے کے بعد کسی ایک سے اپنا پائپ نکالتا ہے اور بغیر یہ کہے کہ تمباکو ختم ہو چکا ہے اور ریا مل نہیں رہا۔ اسے اپنے منہ میں رکھ کے اس انداز میں کش کھینچنے لگتا ہے جیسے سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہو جو تمباکو اب ماضی کی چیز بن چکا ہے کم از کم اپنے منہ میں رکھنے کے لئے اس کے پاس ایک پائپ تو موجود ہے الپورب اچھے موڈ میں نظر آرہا ہے۔

اب اس اچھے موڈ کے خود ساختہ تاثر کو برقرار رکھتے ہوئے وہ مجھ سے دوبارہ مخاطب ہوتا ہے اور کہتا ہے۔ دوست اداسی کی باتیں اب مت کرو اور بجھتے ہوئے کوئلوں کو بھی مت دیکھو کہ یہ اور اداس کرتے ہیں۔ آؤ کچھ اچھی اچھی باتیں کریں۔"

اور پھر خاموشی کا ایک ایسا وقفہ آتا ہے جس میں ہم دونوں اپنے اپنے طور پر کچھ اچھی اچھی باتیں کرنے کا کوئی ڈھب سوچتے ہیں ابھی ہم کسی موضوع کی تلاش ہی کر رہے ہوتے ہیں کہ چوکیدار پناہ گزین ہوٹل سے کھانا لے آتا ہے اور اس وقت ہمیں پتہ چلتا ہے کہ رات خاصی گزر چکی ہے۔ باہر سناٹا طاری ہے۔ اور دور سوفی لاج سے جو ہمارے ہوم گارڈز کی قیام گاہ ہے۔ اس سناٹے کو خوفناک بناتی ہوئی کچھ ایسی آوازیں آرہی ہیں جیسے بہت سے بھوت کسی ویرانے میں اکٹھے ہو کر گا رہے ہوں غالباً ہوم گارڈز گا رہے ہوتے ہیں۔

سوفی لاج کے مختلف کمروں میں بیٹھے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنائے وہ ہر رات خاصی دیر تک یونہی گاتے رہتے ہیں چونکہ ان کمروں میں آتشدان نہیں اس لئے انہوں نے اس مقصد کے لئے بہت سے ٹین اکٹھے کر رکھے ہیں ہر کمرے میں ایک ٹین ہوتا ہے جس میں لکڑیاں سلگتی رہتی ہیں دھواں سارے کمرے میں پھیلتا رہتا ہے ان کی آنکھوں کو اندھا کرتا رہتا ہے لیکن وہ اس سے بے نیاز اس ٹین کے گرد چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بیٹھے اپنی آنکھیں بند کئے گانے میں مگن رہتے ہیں۔ کمرے کی چھت دھوئیں سے کالی ہوتی رہتی ہے اور ان کا دل خوش ہوتا ہے کہ کم از کم اس طور وہ تھرٹ کے سارے بسنے والوں کا

انتظام سونی لاج کے مالک سے توسے ہے ہر کمرے میں ایک مختلف گانا بجتا رہتا ہے اور یہ سارے گانے مل کر مجموعی طور پر ایک ایسا گانا بن جاتے ہیں جو بے حد ہولناک تاثر پیدا کرتا ہے ثبوت کی راتوں کو ڈراونا بنا دیتا ہے اور سونی لاج پر جو یوں بھی آبادی سے ذرا الگ تھلگ ہے ایک ایسی بھوتوں کی بستی کا گمان ہونے لگتا ہے جہاں وہ کوئی جشن منا رہے ہوں۔

لیکن یہ جشن نہیں ہوتا۔ ایک نوحہ ہوتا ہے سری نگر کی یاد میں۔ اپنے وطن کی یاد میں وطن کی گلیوں اور وطن کے عزیزوں کی یاد میں جہاں ان کے لئے محبت ہی محبت ہے یہ ایک فریاد ہوتی ہے پردیس کے خلاف اس پردیس کے باسیوں کے اور ثبوت کے باسیوں کی اس نفرت کے خلاف جو انہیں ان سے ہے سونی لاج کے ہر کمرے میں۔ ہوم گارڈز کی ہر ٹولی کا گیت الگ ہوتا ہے اور ان میں سے ہر گیت میں ہمیشہ کسی متوالے عاشق کی کہانی ہوتی ہے اور یا کسی ایسی محبوبہ کی۔ جو جدائی کا داغ دے گئی ہو یہ گانے بڑی مدہم اور کومل سروں میں گائے جاتے ہیں مگر ان سب کی آواز ایک دوسرے میں مل کر گڈمڈ ہو کر اور ہم آہنگ ہو کر جب سونی لاج سے باہر نکلتی ہے تو وہ نرم اور ملائم نہیں رہتی۔ ایک کرخت چیخ بن جاتی ہے اور جس رات ہم اپنے کمرے میں دیر تک جاگتے رہیں۔ یہ ہمیں بھی سہما دیتی ہے۔

الپورب کہتا ہے "یہ نفرت کا ردعمل ہے۔ نفرت کا نفرت کو جواب ہے دل کو ہمیشہ دل سے راہ ہوتی ہے محبت ہمیشہ محبت پیدا کرتی ہے۔ اور نفرت ہمیشہ نفرت۔ اور میں ڈرتا ہوں کہ جب یہ لوگ واپس سری نگر پہنچیں گے تو نفرت کا۔

یہ جذبہ ان کے دلوں میں مستحکم ہو چکا ہوگا۔ اور یہ نفرت صرف ثبوت کے لئے نہیں ہو گی۔ صرف ثبوت کے ہندوؤں کے لئے نہیں ہو گی۔ بلکہ اس کا دامن اندر ہی اندر پھیل کر وسیع ہو چکا ہوگا۔ اور ان کی نفرت کی اس لپیٹ میں ہر ہندو ہوگا۔ خواہ وہ کہیں بستا ہو کیونکہ ان کے دلوں میں یہ بات اس وقت تک جم چکی ہو گی کہ ثبوت کے ہندوؤں نے اگر ان سے نفرت کی۔ تو صرف اس لئے کہ یہ سب مسلمان تھے نیشنل کانفرنس کا ہندو مسلم اتحاد والا وہ نعرہ جسے ہم سری نگر سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہاں ثبوت میں آ کر جموں کے اس صوبے میں آ کر اور ڈوگروں کی اس نگری میں آ کر ہم سے چھین لیا گیا ہے۔ ہمارے ہوم گارڈز ذہنی طور پر لوٹ لئے گئے ہیں۔ اور یہ ہماری ہار ہے۔"

الپورب کا خلوص اس کی آواز کو جذباتی بنا دیتا ہے اور پھر تھکا ہوا راہی جیسے چلتے چلتے دفعتاً رک جائے۔ الپورب بھی رک جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد بڑی دکھی آواز سے کہتا ہے "اصل میں ہمیں ان لوگوں کو یہاں لانا ہی نہ چاہیئے تھا نیشنل کانفرنس کے سیاسی عقیدوں کے لئے یہاں کی فضا سازگار نہیں۔"

"ہاں یہ فضا نیشنل کانفرنس کے سیاسی عقیدوں کے لئے سازگار نہیں یہ عقیدے کچھ سری نگر میں ہی پنپ سکتے ہیں جہاں سادہ لوح مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اور جہاں شیخ عبداللہ اپنے مسلمانی نام کا واسطہ دے کر انہیں بھیڑوں کی طرح جس طرح چاہے ہانکے پھر سکتا ہے اور پھر جموں کے صوبے میں ہندو مسلم اتحاد کا پرچار اور امن امن کی رٹ یوں بھی بے معنی نظر آتی ہے۔"

الپورب گھور کر میری طرف دیکھتا ہے یہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

[illegible]
آتا جموں کشمیر۔ اور دھرم پور، رام نگر اور ریاسی کے شہر ہندو حکومت نے
انہیں چن چن کر ادھر دیا۔ اب جب کہ یہاں صرف ہندو ہی رہ گئے ہیں ہم ان ہندوؤں
کو آج کے کچھ پڑھائیں کہ مسلمان بھی تمہارے بھائی ہیں صلح صفائی سے رہو تو یہ کتنی
مضحکہ خیز بات ہوگی بھائی سمجھنے اور صلح صفائی سے رہنے کے لئے ہونا [illegible]
اب کوئی مسلمان نہیں۔ پھر یہ نعرے انہیں بے بنیاد اور کھوکھلے کیوں نظر نہ آئیں
نیشنل کانفرنس کو اپنی سرگرمیاں سری نگر میں ہی محدود رکھنی چاہئیں تاکہ وہاں
کے ہندو کسی طور محفوظ رہ سکیں۔ جموں کے مسلمانوں سے تو جو نپٹنا تھا نپٹ چکا
اور پھر شیخ عبداللہ کی لیڈری بھی وہیں سری نگر میں ہی چل سکتی ہے یہاں کے
ہندوؤں میں اس مسلمانی نام کی ساکھ ہی کیا ہے۔"

میں اپنے آخری جملے کی تیزی کو ذرا کم کرنے کے لئے مسکراہٹ کا سہارا
لیتا ہوں مگر اپورب کی گھوری اور تیز ہو جاتی ہے "تو یہ بات ہے۔ یہ خیالات ہیں تیرے
کیا جموں کی نفرت پرور فضاؤں نے تجھ پر بھی اپنا اثر کرنا شروع کر دیا ہے؟"

اپورب شاید مصلحت اسی میں سمجھتا ہے کہ میرے طنز کو نظر انداز کر دے تاہم
میرے دل کی صفائی کی وہ ایک مبہم سی تدبیر ضرور کرتا ہے۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا" وہ کہتا ہے "میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ عام طور پر
ایسے حالات دیکھ کر عام لوگ صحیح راستے سے بھٹک سکتے ہیں کیونکہ اوسط درجے
کا ذہن صرف سطح ہی کو دیکھتا ہے گہرائیوں میں اتر کر تہہ تک نہیں پہنچ سکتا عام
طور پر ایسے ہی حالات میں انسانیت کا اعلیٰ اور معیاری تصور مٹنے لگتا ہے کہ وہ

یہیں سے فرقہ پرستی کی بنیاد پڑی ہے۔"

اپورب نے غالباً میری ذہانت پر حملہ کیا ہے۔

انتقام!

مگر میں خاموش رہتا ہوں۔ کیونکہ خاموشی میں ہی ہم دونوں کی بھلائی ہے
اور صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے بدمزگی کا سر کچلا جا سکتا ہے اب اپورب
بھی جلد ہی اس نقطے کو پا لیتا ہے وہ فوراً محسوس کرتا ہے کہ موضوع بدل لیا جائے
اور اپورب کی ذہنی الجھن کو سمجھتے ہوئے میں بھی یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ موضوع
بدل لیا جائے چنانچہ جلد ہی ہم میں سے کسی کو خیال آجاتا ہے کہ رات بہت زیادہ
گزر چکی ہے۔ اس لئے سونا چاہیئے اور پھر یہ سوچ کر کہ بدمزگی کا ذرہ بھر احساس
بھی ہم میں سے کسی کے ذہن کے ساتھ چمٹا نہ رہ جائے۔ اپورب اپنے تمباکو
سے خالی پائپ کو دوبارہ منہ میں رکھتے ہوئے اور کرسی پر جھولتے ہوئے مسکرا
مسکرا کے گنگنانے لگتا ہے "ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ نوحۂ غم
ہی سہی — ہاں — نوحۂ غم ہی سہی —" اور پھر اپنے کسی پرانے عشق کی کہانی
کو مضحکہ خیز سا بنا بنا کر اس طور سنانے لگتا ہے جیسے وہ ظاہر کر رہا ہو کہ اس
زمانے میں بھی جب کہ وہ عشق کر رہا تھا۔ وہ اسے دماغ ہی کا ایک خلل سمجھتا تھا
اور اس معاملے میں ہرگز ہرگز سنجیدہ نہ تھا پھر اسی دوران میں وہ ذرا سنجیدہ
سا بن کر یہ بھی کہتا ہے کہ اسے سنجیدہ باتوں سے ہمیشہ چڑ رہی ہے سنجیدگی بڑھاپے
کی خصوصیت ہے پھر ہم جو ماشاءاللہ جوان ہیں ابھی سے سنجیدگی کو اپنے اوپر کیوں
طاری کریں ابھی تو عمر پڑی ہے۔ کھا ڈبل روٹی مزے سے پھول جا۔ اور ہم

وہ تو خوش اخلاق سا بن کر ہنسنے لگتے ہیں۔

رات گزر جاتی ہے پھر جب صبح ہوتی ہے تو ایوب کو بستر میں سب سے پہلا خیال رات کی ان باتوں کا آتا ہے جن میں اُسے کسی بدمزگی کے پیدا ہونے کا احساس ہوا تھا اس لئے وہ بستر ہی سے یہ فیصلہ کر کے اٹھتا ہے کہ وہ اٹھتے ہی ایسی باتیں کرے گا جن سے رات کی بدمزگی کا اگر ذرا سا پرتو بھی میرے ذہن میں رہ گیا ہو۔ تو وہ بھی اُتر جائے۔ چنانچہ اٹھتے ہی وہ دوبارہ کوئی مصرعہ لطیفہ پرور انداز میں گنگناتا ہے اور جیسے وہ کوئی مذاق کر رہا ہو کہتا ہے "رات کو ہم نے سیاسیات حاضرہ پر تبصرہ کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ بھی خوب تھی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہم سوچنے سمجھنے والے نوجوان ہیں اور ہمیں حق پہنچتا ہے کہ ہم ترقی اور انقلاب کے اس زمانے میں ضرور زندہ رہیں کبھی کبھی ہمیں سیاسیات پر اس طرح ضرور بحث کرنی چاہیئے سنا ہے اس سے صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا کیا خیال ہے تمہارا؟"

پھر وہ ہنسنے لگتا ہے۔ اور چونکہ ہم ایک دوسرے کی دشواریوں کو خوب سمجھتے ہیں اس لئے میں بھی ہنسنے لگتا ہوں۔ بدمزگی کا نام و نشان نہیں رہتا اور ہماری شرافت کے قیام میں ایک نئے "ن" کا اضافہ ہونے لگتا ہے

آج دن بڑا سہانا ہے ہم نے اپنے کمرے کی کھڑکیوں کے پردے ہٹا دیئے ہیں اور شیشوں میں سے باہر کا منظر دیکھ رہے ہیں ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے اور ارد گرد کے پہاڑوں پر جہاں اس سے پہلے فسادیوں کے جلائے ہوئے دیہاتوں سے اٹھنے والے دھوئیں کے بادل چھائے رہتے تھے۔ آج بادلوں کا دھواں دکھائی دے رہا ہے موسم کا تقاضا ہے کہ ہم آج باہر نہ جائیں چائے کمرے میں ہی منگوا کر پئیں لیکن کل سارا دن کمرے میں بیٹھے رہنے کے بعد اور رات کی قنوطیت پرور باتوں کے بعد آج ہمیں کچھ باہر جانا ہی بھلا معلوم ہوتا ہے چنانچہ اپنے اپنے اوور کوٹ پہن کر جن سے ہم برساتی کا بھی کام لیتے ہیں ہم باہر نکل جاتے ہیں۔

ڈاک بنگلے سے نکل کر اگر ہم ٹھنڈی سڑک پر چلتے ہوئے اس طرف کا رخ کریں جس طرف سری نگر ہے تو سب سے پہلے سوفی لاج آتی ہے اُس کے قریب سے گزرتے ہوئے ہماری یہ ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے۔ کہ یہاں ہمارے قدم آہستہ خرام پاکیزہ خرام کی تمثیل بن جائیں تاکہ پاؤں کی آہٹ سے کسی کو ہمارا پتہ نہ چل سکے۔ ہم اگر باتیں کر رہے ہوں۔ تو اس کے پاس پہنچتے ہی خاموش ہو جاتے ہیں۔ تاکہ ہماری آواز کسی تک پہنچ ہی نہ سکے۔ کوئی جان ہی نہ سکے کہ ہم وہاں سے گزر رہے ہیں اور سوفی لاج کے رہنے والوں کو اپنے دکھ ہمیں دیکھ کر یاد ہی نہ آسکیں تاکہ نہ وہ لوگ ہمیں آ کے اپنے غم میں شریک کرنے کی کوشش کریں۔ اور نہ ہمیں سننے کی کوفت ہو لیکن ہر ممکن احتیاط کے باوجود سوفی لاج والوں کو ہمارا پتہ چل جاتا ہے۔ اور پھر ——

جناب یہ دیکھیے۔ ایک جول اور سڑک پر ایکا ایکی ایک صاحب کھٹاک سے ایک فوجی سلام جیسے ہم پہ پٹخ کر ہمارے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں اور جلدی سے اپنی قمیص اٹھا کر اسے اپنے دونوں ہاتھوں پر پھیلا کر معائنہ کے لئے ہمارے سامنے کر دیتے ہیں یہ قمیص اتنی غلیظ ہوتی ہے کہ بغیر کسی

شک و شبہ کے یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ کہ اس میں نہ صرف ایک بلکہ ہزاروں جوئیں ہوں گی۔ اور ٹانگوں سے سوا ہوں گی لیکن آخر ہم کیا کریں۔

جلد ہی ایک اور عجوبہ بنا۔ ڈاڑھی اور سر کے بالوں میں گنجل سے بناتے اور ان گنجلوں میں اپنی انگلیاں پھنساتے آوارہ ہو گا اور میجر ——— "یہ دیکھو صاحب۔ ہمارا ڈاڑھی کیا کریں گا صاحب۔ یہاں نائی نہیں ملتا۔ قسم خدا کا صاحب ہم مر جائیں گا۔"

اس کی ہیئت دیکھ کر ترس کی بجائے ہنسی آتی ہے اور ہماری یہ ہنسی ان کے لئے اتنی حوصلہ افزا ہوتی ہے۔ کہ اس کی شہ پا کر اب سارے کے سارے ہوم گارڈز ہمارے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ان سب میں نمایاں ان کا پلاٹون کمانڈر ہوتا ہے جو کسی زمانے میں فوج میں حوالدار میجر تھا جس کی عزت افزائی کے لئے اس کے ماتحت گارڈز کچھ عرصہ تک تو اسے میجر حوالدار کہتے رہے ہیں لیکن جب اب مزید عزت افزائی کے طور پر اور غالباً اختصار کو بھی ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے صرف میجر کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم بھی اسے میجر ہی کہنے پر مجبور ہیں۔

"سناؤ میجر کیا حال چال ہے؟" ہم پوچھتے ہیں۔

اور فوراً اٹن شن کی حالت میں اکڑ کر اور تمام تر فوجی آداب پر عمل کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "صاحب ہم خوش ہے ہم نے فوج میں پہلے بھی بہت سال نوکری کیا ہے۔ اس لئے ہم خوش ہے۔ ہم فوج کا سب قانون جانتا ہے اور اسی واسطے ہم مر جائیں گا پر منہ سے نہیں بولیں گا۔ کہ۔ صاحب ہم مر گیا یا صاحب ہم کو بچاؤ۔ یا یہ کہ صاحب ہمارا انتظام کرو۔ یا ہمارا کپڑا بہت میلا ہے اور شوت کا دوکاندار ہم کو صابن نہیں دیتا۔ یا ہم خود میلا ہے اور شوت کا لوگ ہم کو اپنا چشمہ پر نہانے نہیں دیتا۔ کیونکہ وہ ہندو ہے اور ہم کو مسلمان بولتا ہے صاحب ہم ہر وقت خوش ہے ہم کبھی آپ سے نہیں بولیں گا۔ پر اب صاحب نے خود پوچھا ہے اس لئے ضرور بولیں گا اور اس لئے بولتا ہے۔ کہ ......"

میجر اب ذرا کی ذرا رکتا ہے۔ پھر جسم کے نچلے حصے کو بدستور اٹن شن کی حالت میں اکڑائے اوپر کے حصے کو ذرا سا آگے کو جھکا کر ہمیں اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر دکھاتا ہے "یہ دیکھو صاحب۔ اب اس وقت ہم اسی واسطے باہر کھڑا تھا۔ بارش کا بوند بوند ہمارے ہاتھ پر گرتا تھا۔ اور ہم اس سے اپنا ہاتھ مل کر صاف کر رہا تھا۔ ہم اپنا سب کچھ اسی طرح صاف کر لیتا ہے۔ بہت سال فوج کا نوکری کیا ہے۔ اس لئے سب کچھ جانتا ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد وہ نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ایک نظر اپنے جوانوں کی طرف کرتا ہے جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُن سے اپنی برتری کا اعتراف کروانا چاہتا ہو پھر نہایت احترام کے ساتھ ایک قدم پیچھے ہٹ کر وہ ان کو ڈانٹتا ہے "صاحب کا راستہ کیوں روک دیا۔ راستہ بناؤ۔ صاحب کو شاید ابھی چائے کا واسطے جانا ہے۔"

راستہ صاف ہو جاتا ہے اور ہم آگے بڑھ جاتے ہیں پیچھے سے ہمیں میجر کی زوردار آواز سنائی دیتی ہے "جوان اٹن شن" اور پھر غالباً وہ ہمیں سنا سنا کر ان کے سامنے تقریر کرتا ہے۔ "جوان یہ فوج کا قانون نہیں۔ ہم جانتا ہے ہمارا

افسر لوگ بھی اس ثبوت سے بہت تنگ ہے پھر بھی یہ فوج کا قانون نہیں کہ جوان لوگ افسر لوگ کے سامنے اگر لمبا لمبا بات کرے فوج کا قانون یہ ہے کہ۔"

اس کی آواز پیچھے رہ جاتی ہے اور ہم دور نکل جاتے ہیں۔ سامنے پناہ گزین ہوٹل کا سارا عملہ مٹیالے مٹیالے خاکی سے دراز جو یقیناً کبھی سفید ہوں گے پہنے ہوئے۔ اپنے میلے میلے دانت لگائے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے مجسم سوالیہ بنا۔ ہماری پیشوائی کے لئے کھڑا ہے آج بارش کی وجہ سے اب تک کوئی گاہک نہیں آیا اس لئے ان کے ہاں ہماری اہمیت بڑھ گئی ہے۔

نہ اسلام علیکم۔ نہ نمستے۔ نہ ست سری اکال انتہا یہ ہے کہ آداب عرض والا نسبتاً غیر معتر اور غیر فرقہ وارانہ سلام بھی نہیں۔ البتہ ہمارے لئے آج ان کی مسکراہٹیں بڑی ارزاں ہیں جونہی ہم اندر داخل ہوتے ہیں اور ٹین کی کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں ایک سردار اچک کر آمدنی والی صندوقچی کے پاس اپنی بے پناہ میلی گدی پر جا بیٹھتا ہے ایک فوراً چولہے پر توا رکھ کر اس میں جلدی جلدی پھونکیں مارنے لگتا ہے اور تیسرا اس کے قریب ہی بیٹھ کر ایک میلے کپڑے سے وہ راکھ متواتر پونچھنے کا کام سنبھال لیتا ہے جو پہلے کی پھونکوں سے بار بار توے پر آگرتی ہے ایک اور ہمارے سامنے کی میز پر زور زور سے کپڑا پھیرنے لگتا ہے ہم سے ذرا دور ایک کونے میں اب پیالیاں اور چمچے بھی ٹکرانے لگتے ہیں۔ اور پناہ گزین ہوٹل کھل جاتا ہے۔

اب اگر اس کے عملہ کی معروفیت سے نظر ہٹا کے ذرا کی ذرا دوسری چیزوں پر نگاہ ڈالیں۔ تو اس کی وضع قطع تیسرے درجے کے ایک مسلم ہوٹل کی

سی نظر آتی ہے چینی کے پیالوں اور چھوٹی چھوٹی پلیٹوں کی ایک قطار جن میں ہندو کا مخصوص گول تھال کہیں بھی نہیں تانبے کے دیگچے جن میں سے کسی کا رنگ پیلا نہیں۔ ان دیگچوں میں سے اکثر پر اقبال ہوٹل اور گلاسوں پر مالک گلاس کا جمعہ خاں کندہ ہے۔ حالانکہ پناہ گزین ہوٹل کے عملہ میں سے کوئی بھی ایسا نہیں معلوم ہوتا جس کا نام جمعہ خاں یا اقبال ہو سکتا ہو۔

چونکہ چائے میں ذرا دیر ہے اور یوں بھی آج ہوٹل کا عملہ معمول کے خلاف کچھ اس طرح جھک رہا ہے جیسے اگر آج ان سے باتیں کی جائیں تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اور ان کے کام میں کوئی خرابی نہ پڑے گی۔ ہم پوچھتے ہیں "سردار جی یہ برتن تم کہاں سے لائے؟"

تبھی ہوٹل ہی سے ہیں" اور یہ کہہ کر جواب دینے والا پر معنی طور پر مسکرا کر اور اپنے ساتھیوں کی طرف ذرا شوخی سے آنکھ مار کر ہمارے لئے پراٹھے پکانے میں پھر سے معروف ہو جاتا ہے البتہ وہ جو گدی پر بیٹھا ہے مزے لے لے کر ہمیں سنانے لگتا ہے کہ کیسے وہ راولپنڈی سے کشمیر کے اس حصے میں پہنچے۔ کیسے انہیں اس ہوٹل کے مالک کو جو مسلمان تھا دیکھ کر اس کی مسلمانی پر غصہ آگیا اور کیسے وہ ان کے خوف سے سارے برتن ورتن چھوڑ چھاڑ کے راتوں رات ہی بستی کے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کہیں بھاگ گیا اور چونکہ انہیں کہیں اور سر چھپانے کی جگہ نظر نہ آتی تھی۔ اس لئے مجبوراً انہیں اسی ہوٹل میں ڈیرا جمانا پڑا۔ اور اسے چالو کرنا پڑا۔ اور اگرچہ اس سے پہلے انہوں نے ایسے کاروبار کبھی نہ کئے تھے لیکن مجبوری تھی اور اس لئے اب

گلے میں بڑی پوپی ڈھولک کو بجانا بھی پڑتا ہے۔

پوچھتے سکتے۔ وہ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں اور اسی دوران میں ہمارے لئے چائے آجاتی ہے۔

ہم چائے پی رہے ہوتے ہیں کہ ٹھوت کے اس واحد ہوٹل کے کچھ اور گاہک آجاتے ہیں سامنے کی سڑک پر ایک جیپ آتی ہے اس میں سے چار پانچ فوجی افسر نکلتے ہیں۔ اندر آتے ہی ہمیں گھور کر دیکھتے ہیں۔ اور پھر ہمیں نظر انداز کر کے، اور ہماری موجودگی کو ایک طرح سے تسلیم نہ کرتے ہوئے وہ پرے کی ایک میز پر جا بیٹھتے ہیں۔ اور پھر ——

"سردار انڈہ لاؤ۔ پرٹھا لاؤ۔ سب کچھ لاؤ" احکامات جاری ہونے لگتے ہیں "اور ہاں یہ بھی بتاؤ۔ کہ تمہارے پاس کیا کچھ ہے"

پناہ گزین ہوٹل کا سارا عملہ ان کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ان کی آواز دوبارہ گونجتی ہے۔ سردار۔ یہ بتاؤ کہ اس تمہارے ٹھوت میں کیا کچھ ملتا ہے۔ اور یہ بھی بتاؤ۔ کہ وہ ہانجی لوگ کہاں ہیں جن کے لئے کشمیر مشہور ہے۔ جن کے پاس نرم نرم ملتا ہے۔ اور گرم گرم ملتا ہے۔"

اگرچہ آخری بات ذرا مبہم ہے تاہم پناہ گزین ہوٹل کے سردار غالباً سمجھ جاتے ہیں۔ وہ کن انکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں اور پھر ایسی مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ جس کے تصنع کا اظہار بھی مقصود ہوتا ہے انہیں جواب دیتے ہیں کہ وہ خود بھی یہاں پردیسی ہیں۔ پناہ گزین ہیں مغربی پنجاب سے آئے ہوئے ہیں اس لئے یہ ساری باتیں وہ کیا جانیں؟

نو وارد نہ جانے کیوں ایک قہقہہ بلند کرتے ہیں۔ اور پھر ان میں سے ایک اپنے فوجی اوورکوٹ کی جیب میں سے رم کی ایک بوتل نکال کے اپنے سامنے میز پر رکھ دیتا ہے جس پر باقی کے چیختے ہیں ارے۔ اسی وقت؟ اور وہ بڑی بے نیازی سے اسے کھولتے ہوئے کہتا ہے۔ ہاں۔ اسی وقت۔ ذرا موسم تو دیکھو اور پھر یہ کشمیر ہے"

جب بوتل کھل چکتی ہے تو پینے سے پہلے ہی وہ جیسے سرور کی لہر دل میں بہنے لگتا ہے جیسے ابھی سے اس کی آنکھوں میں مستی بھر جاتی ہے اور وہ متوالا سا بن کر کہتا ہے۔ آہ۔ سری نگر تو نے ہمیں مار ڈالا۔ امرتسر سے دلی گئے۔ اور تیری خاطر دلی بھی چھوڑی۔ پر تو اپنے ہانجیوں سمیت پھر بھی ہم سے دور ہی رہا۔ ہائے۔ ہائے۔ اس کے انداز ڈرامائی ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھی ہنسنے لگتے ہیں۔ اور پناہ گزین ہوٹل والے بھی جیسے کسی حقیقی خوشی سے سرشار ہو گئے ہیں۔ ان کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور مسکراتے ہیں۔ مسکرائے جاتے ہیں۔

ہماری چائے ختم ہو چکی ہے۔ اس لئے ہم باہر نکل جاتے ہیں۔

بارش تیز ہو چکی ہے۔ اور سردی بھی کچھ بڑھ گئی ہے اپوربا اپنے اوورکوٹ کے کالر اونچے کرتے ہوئے دور۔ بانہال کے ان پہاڑوں کی طرف دیکھتا ہے جن کے پیچھے سری نگر ہے اور پھر ذرا سا پُر معنی انداز میں۔ محزوں سی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ہے۔ "اگرچہ ہمارے پاس رم نہیں۔ اور اگرچہ ہم موسم کو اس کا DUE بھی نہیں دے سکتے۔ تاہم اتنا ضرور کہیں گے کہ اے سری نگر ہم بھی تیرے لئے مرتے"

میں مسکرا دیتا ہوں اور پھر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہتا ہوں "آؤ۔ اپنے کمرے میں چلیں۔"

مگر اپورب آج کمرے میں بند رہنے کا قائل نہیں۔ اس لئے ہم بڑی سڑک پر بارش ہی میں چلنے لگتے ہیں۔ جہاں راستے میں ہمیں پادری ڈاؤننگ مل جاتا ہے۔

"ہلو مسٹر ڈاؤننگ۔ اس بارش میں کہاں؟"

اور وہ بتاتا ہے کہ وہ ذرا ٹیلیگراف آفس تک گیا تھا۔ تاکہ کوئی خبر معلوم ہو سکے ٹیلیگراف آفس ثبوت کی نیوز ایجنسی بھی ہے۔ سری نگر، جموں، بانہال، کشتواڑ، بھدرواہ۔ ڈوڈہ ہر جگہ کی تار یہاں سے ہو کے جاتی ہے اور آج کل چونکہ ایسی سرکاری تاروں کی کثرت ہوتی ہے جن میں مقامی گڑبڑ یا سیاست کے کسی اُلٹ پھیر کا تذکرہ ہوتا ہے اس لئے ہر شخص ان تاروں کے مضمون سے آگاہ ہونے کے لئے وہاں جاتا ہے۔ اور پھر ٹیلیگراف ماسٹر بھی لوگوں میں اپنے آپ کو مقبول بنانے کے لئے گورنمنٹ کے یہ سارے راز ذرا جھجک جھجک کے افشا کرتا رہتا ہے۔ اس لئے وہاں خاصی رونق رہتی ہے۔

"کوئی خبر؟" ہم پوچھتے ہیں۔

اور ڈاؤننگ ہمیں یہ خبر سناتا ہے کہ کشمیری ہوم گارڈز کی جو کمپنی ان دنوں بھدرواہ میں ٹھہری ہوئی ہے اس کے آٹھ سپاہی مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ اور انہوں نے اپنے کمانڈر مہاراج کشن کو DESERT کر دیا ہے

ہم نہیں مانتے۔

لیکن ڈاؤننگ جو یہ مان چکا ہے۔ کہتا ہے یہ سب ممکن ہے۔ آپ والے

ہوم گارڈز کی طرح وہ بھی مسلمان تھے نا! آپ لوگوں کی طرح لاکھ ان کا کمانڈر بھی ہندو ہو۔ پر مسلمان پر کبھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ میں جانتا ہوں۔ مسلمانی سیاست کچھ ہوتی ہی ایسی ہے۔"

اپورب میری طرف دیکھ کر مسکراتا ہے۔ پناہ گزین ہوٹل والوں کی طرح ڈاؤننگ بھی مجھے ہندو ہی سمجھتا ہے۔

ڈاؤننگ اپورب کی مسکراہٹ کا مطلب نہیں سمجھتا۔ تاہم یہ خیال کر کے کہ اگرچہ اس نے اپنی طرف سے توچھان بھٹک کے ایک ایسی بات کی تھی۔ جو ہندوؤں کو پسند آجانی چاہیئے تھی۔ پھر بھی شاید معاملہ کچھ ایسا ویسا ہو گیا ہے وہ فوراً موضوع بدل دیتا ہے اور پوچھتا ہے "کہیئے۔ آپ لوگ کل سارا دن کیا کرتے رہے۔ کہیں نظر نہیں آئے؟"

"ہم اپنے کمرے میں ہی رہے" اپورب کہتا ہے۔

"میں بھی کبھی کبھی سارا دن اپنے کمرے میں ہی رہتا ہوں۔ اور تنہائی میں خدا کی صحبت سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہوں۔"

لیکن ہم لوگ تو ایک دوسرے کی صحبت سے ہی لطف اندوز ہوتے رہے اور یہ تجربہ خاصا خوشگوار تھا۔ خدا کی صحبت سے بھی زیادہ خوشگوار۔ اپورب ڈاؤننگ کو چھیڑتا ہے۔

لیکن ڈاؤننگ نہیں چڑتا۔ کچھ تو اس لئے کہ وہ ثبوت میں رہ کر ہمیشہ ایسی ہی باتیں کرنا چاہتا ہے جس سے یہاں کے لوگ خوش رہیں اور اس کے قیام میں کسی طرح کی بدمزگی پیدا نہ ہو۔ اور کچھ شاید اس لئے بھی کہ بائبل گناہ سے تو نفرت اور

ناراضگی سکھاتی ہے لیکن گناہگاروں سے نہیں۔ اور یہ کہہ کر اپورب نے محض اپنی گناہ گاری کا اظہار کیا تھا۔

"خدا نے انسان کو پیدا کیا۔ اس لئے انسان بھی بڑی چیز ہے اس کی صحبت بھی بڑی چیز ہے" ڈاؤننگ سمجھوتے کے موڈ میں ہے۔

مگر اپورب سمجھوتہ نہیں کرتا۔ اور کہتا ہے "مسٹر ڈاؤننگ میں یہ بھی نہیں مانتا کیونکہ میرا یقین ہے۔ کہ خدا نے انسان کو پیدا نہیں کیا۔ بلکہ انسان نے خدا کو پیدا کیا ہے آپ کہتے ہیں کہ خدا نے انسان کو اپنی شبیہ کے مطابق بنایا لیکن میں کہتا ہوں۔ کہ انسان کے دماغ نے خدا کا تصور پیدا کیا۔ اور پھر اُسے بڑی قدرت والا اور حکمت والا ظاہر کرتے ہوئے ذرا اپنے جذبۂ تفاخر کو تسلی دینے کے لئے یہ بھی کہہ دیا۔ کہ خدا کی شبیہ بھی بس انسان کی سی ہے۔"

کوئی اور وقت ہوتا تو ڈاؤننگ فوراً بحث شروع کر دیتا اور اسی بہانے بائبل کے صفحوں کے صفحے ہمارے سامنے دہرا دیتا لیکن آج وہ واقعی سمجھوتے کے موڈ میں ہے اب وہ اپورب کی بات یوں سنتا ہے۔ جیسے کوئی لطیفہ سن رہا ہو۔ ہنسنے لگتا ہے اور پھر اپنے ہیٹ کو سر سے اُتار کر اُس سے بارش کا پانی جھاڑتا ہے پھر اپنی برساتی کو اپنے ہاتھوں سے تھپتھپاتے ہوئے اور پانی کی بوندوں کو نچڑ نچڑ کر آہستہ آہستہ نیچے پھیلتے ہوئے دیکھنے لگتا ہے۔ "اگر بارش کا یہی عالم رہا۔ تو یہاں جلد ہی برف گرے گی۔ اور بانہال کی اونچائیوں پر تو آج بھی برف گر رہی ہے۔"

جس طرف ہم جا رہے ہیں اسی طرف سڑک کے دائیں جانب نیچے گھاٹی

میں ڈاؤننگ کا گھر ہے۔

بارش تیز ہونے لگی ہے اس لئے ہم اپنے اپنے اوورکوٹ کے سارے بٹن احتیاط سے بند کر لیتے ہیں تاکہ پانی ہمارے اندر کے کپڑوں کو نہ بھگو سکے۔ آہستہ آہستہ بارش کے قطرے ہمارے ننگے سروں سے کانوں کے پاس سے گذر کر نیچے کو بہنے لگتے ہیں، ہماری عینکوں کے شیشے چونکہ اب دھندلا گئے ہیں اس لئے ہم اپنی اپنی عینک اتار کر جیب میں ڈال لیتے ہیں۔

ڈاؤننگ کا گھر سامنے نظر آ رہا ہے۔ برآمدے میں اُس کی بیوی اور اُس کا بچہ اُس کے منتظر کھڑے ہیں۔ ڈاؤننگ ہمیں کافی پینے کی دعوت دیتا ہے اس کی بیوی آج کل قسم قسم کے کیک بنانے کے تجربے کر رہی ہے۔ اس لئے اس دعوت میں بڑی ترغیب ہے لیکن چونکہ بارش میں چلتے چلتے ہمیں بڑا لطف آ رہا ہے اس لئے ہم اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اور جدا ہو جاتے ہیں۔ ڈاؤننگ سڑک چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف جانے والی ایک پگڈنڈی پر ہو لیتا ہے۔ اور ہم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ دور نکڑ پر کرنل چوپڑہ کی کوٹھی نظر آ رہی ہے۔

چوپڑہ ہمیشہ اپنے گھر پر رہتا ہے تن تنہا۔ اس کے سارے گھر والے جموں جا چکے ہیں۔ لیکن وہ اب تک یہیں ہے۔ اور وہ بھی یقیناً جا چکا ہوتا اگر پنجاب میں فسادات نہ ہوتے اور راولپنڈی کے بہت سے سکھ یہاں دفعتاً پناہ گزین بن کر نہ آ گئے ہوتے۔ وہ اپنی کوٹھی کو صرف چوکیدار کے بھروسے پر اور ان سکھوں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس نے اپنی آنکھوں سے ان سکھوں کے ہاتھوں بہت سی کوٹھیوں کو لٹتے دیکھا تھا۔ اور کوئی انہیں روکنے والا نہ تھا

یہ سکھ کرسیاں تک نہیں چھوڑتے بلکہ کرسیاں ہی سب سے پہلے لے جاتے ہیں کیونکہ ان کی سوکھی لکڑی کا ایندھن بڑا اچھا بنتا ہے جنگل کی لکڑی گیلی ہوتی ہے اور ٹھوت میں ان دنوں سوکھی اور بغیر دھواں پیدا کئے جلدی جلنے والی لکڑی کی بڑی ضرورت ہے کھانا پکانے کے لئے گھر کو گرم رکھنے کے لئے اور گھر کو روشن کرنے کے لئے بھی۔ کیونکہ ٹھوت میں آج کل مٹی کا تیل نہیں ملتا۔ اور اس لئے لیمپ صرف کسی کسی گھر میں ہی جل سکتا ہے۔ ان حالات میں وہ بھلا اپنی کوٹھی کو چھوڑ کے کیسے جاتا چنانچہ اس سال وہ پہلے کی طرح سردیاں گذارنے جموں نہیں گیا۔ اور اب یہاں ٹھوت میں صبح سے لیکر شام تک گیرج میں پڑی ہوئی اپنی کار کے انجن کو کھولے اُس کے پُرزوں کو نکالتا اور انہیں پھر سے ترتیب دیتا رہتا ہے۔ اور رات کو اپنی کوٹھی کی حفاظت کرتا ہے۔ دُور سے چوپڑہ ہمیں ہاتھ اٹھا کر سلام کرتا ہے۔ آج وہ کار کی بجائے اپنی بندوق کے ساتھ مصروف ہے۔ بندوق اس کے گھٹنوں پر پڑی ہے۔ اور وہ برآمدے میں بیٹھا اُسے صاف کر رہا ہے۔

ہوا کے تیز جھونکے اور بارش کی موسلا دھار اب ہمیں مجبور کر دیتی ہے کہ ہم چوپڑہ کی کوٹھی میں پناہ لیں جہاں چوپڑہ بڑے تپاک سے ہمارا خیر مقدم کرتا ہے۔ اٹھ کر بڑے زور سے دبا دبا کے ہاتھ ملاتا ہے انگریزی زبان میں اپنی اُس خوش نصیبی کا اظہار کرتا ہے جس کا احساس اُسے ہم لوگوں کو اپنے گھر میں دیکھ کر ہوا ہے۔ اس کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھاتا ہے۔ جہاں فوراً ہی جیسے اس کی آنکھ کے ایک اشارے سے اس کا نوکر دو نہایت صاف ستھرے تولئے ہمارے سر پر آ رکھتا ہے اور جتنی دیر میں ہم اپنے پانی سے شرابور سر اُن سے سکھاتے ہیں۔ ڈرائنگ روم کے آتشدان میں پڑے ہوئے

لکڑیوں کے ایک اچھے خاصے ڈھیر میں آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اور ان کے ساتھ ہمارے میزبان چوپڑہ کی مسکراہٹ مل کر کمرے کی فضا کو ہمارے لئے بالکل گھریلو سا بنا دیتی ہے۔

چوپڑہ کہتا ہے "ٹھوت میں جب سے سکھ پناہ گزین آئے ہیں لوگوں کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ ہر شخص کو اب اپنی پڑی رہتی ہے۔ اس لئے کوئی کسی کے ہاں نہیں جاتا۔ آپ نے بڑی عنایت کی۔ جو آج یہاں آ گئے۔"

"آپ بھی تو گھر سے نہیں نکلتے" ہمیں کہنے کے لئے اور کچھ نہیں سوجھ رہا۔

چوپڑہ فضا کو اور زیادہ آرام دہ اور پُرمسرت بنانے کی کوشش کرتے ہوئے ہنستا ہے "ہاں میں گھر سے ذرا کم ہی نکلتا ہوں۔ وہی فرصت کا جھگڑا اور میری ذمہ داریاں ہیں جنہیں ان پناہ گزینوں نے بڑھا دیا ہے۔ اصل میں کوٹھی کی حفاظت کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ پھر اس شورش کے زمانے میں اور پھر مجھ ایسے بوڑھے کے لئے"

ہماری نظر اس کی سفید مونچھوں پر جا پڑتی ہے۔ اور اس کے بعد سامنے پڑی ہوئی ان خوبصورت کرسیوں پر بھی ٹکتی ہے۔ جو اب تک کسی سکھ پناہ گزین کے چولھے کا ایندھن صرف اس لئے نہیں بن سکیں کہ چوپڑہ ان کی حفاظت کر رہا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں ہمارے پہلو کی تپائیوں پر الگ الگ چائے کی پیالیاں آ جاتی ہیں اور ساتھ ہی چھری۔ کانٹے۔ پلیٹ اور نیپکن وغیرہ کا اہتمام بھی ہو جاتا ہے۔ غالباً چائے بڑے پُرتکلف لوازمات کے ساتھ آنے والی ہے۔

"آپ جانتے ہیں۔ یہ ٹھوت ہے۔ اور یہاں کچھ بھی نہیں ملتا۔ کاش ہم جموں میں ہوتے"۔ چوپڑہ بڑے تکلف میں آ کر کہتا ہے۔ اور اس جملے کی سچائی ہم پر اس وقت پورے طور

پر واضح ہو جاتی ہے. جب چائے آتی ہے.

جب چائے آتی ہے. تو چھریاں. کانٹے پلیٹیں وغیرہ دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور ان کے استعمال کا موقع ہی نہیں آتا. یہ ثبوت جو ہے. غالباً ان کی نمائش اس لئے مقصود تھی کہ دیکھو. میں صرف کوٹھی ہی کی حفاظت نہیں کر رہا. بلکہ میں نے اپنے گھر کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی سنبھال کے رکھی ہوئی ہے.

چائے کے دوران میں کرنل ذرا اندا قیہ بننے کی کوشش بھی کرتا ہے "دنیا کا خیال ہے کہ میں بوڑھا ہوں. مگر میں سمجھتا ہوں. دنیا کا یہ خیال غلط ہے. کیونکہ وہ صرف میری سفید مونچھیں دیکھتی ہے".

ہم مسکرا دیتے ہیں.

اور کرنل تکلف. خوش اخلاقی. مہمان نوازی. اور خوش مذاقی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ہمیں گراموفون ریکارڈ سنانے کا ارادہ کرتا ہے اور ساتھ ہی اپنی اُس حسرت کا اظہار بھی کرتا ہے جو اُسے اپنے ریڈیو سیٹ کی بیٹری خراب ہونے کی وجہ سے ہو رہی ہے.

گراموفون پر پہلے انگریزی ٹیونز کے ریکارڈ بجتے ہیں اور پھر "مجھے سپیدہ سحری سے قبل ملنا" "اور ہم کشتی کی سیر کریں گے." "او ماہی گیر کی لڑکی" والے انگریزی گیت. ٹیونز سنتے وقت ہم چوپڑہ کے ہونٹوں کی وہ مدھم سی سیٹی بھی سنتے ہیں. جو نہایت باقاعدگی سے ٹیونز کے ساتھ ہم آہنگ رہتی ہے گیتوں کے وقت بھی چوپڑہ آہستہ آہستہ گنگناتا رہتا ہے "او. ماہی گیر کی لڑکی .... کشتی کی سیر کریں گے .... او ماہی گیر کی لڑکی" اور ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں. اس کے ہاتھ اور اس کے پاؤں

بھی جیسے گیت کے ہم نوا ہو کر ناچتے رہتے ہیں اور ہم سوچتے ہیں کہ کم از کم اس حد تک تو دنیا کا خیال واقعی غلط ہے. کہ کرنل بوڑھا ہے.

ساز اور سنگیت کی اس تفریح کے دوران ہی ہمیں باتوں باتوں میں وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اگر یہ ریکارڈ نہ ہوں تو اس کی کوٹھی لٹ جائے کیونکہ یہی اس کی تنہائی کے سب سے بڑے ساتھی ہیں.

"جس دن یہ سوئیاں ختم ہو گئیں. بس اُسی دن میری کوٹھی بھی لٹ جائے گی کیونکہ اس کے بعد میں ثبوت میں نہ رہ سکوں گا" چوپڑہ کہتا ہے. اور پھر شاید یہ سوچ کر کہ اب یوں تکلف میں آگے مزید سوئیاں ضائع نہیں کرنی چاہئیں. وہ جلد ہی گراموفون بند کر لیتا ہے اور اس کے بعد اپنے چاندی کے سگرٹ کیس میں سے ہمیں سگرٹ دیتے ہوئے اور ایک اپنے منہ میں رکھتے ہوئے اپنی کرسی ہمارے بہت قریب گھسیٹنے کے بعد جیسے کوئی راز دریافت کرنے لگا ہو. ہم سے پوچھتا ہے "آپ تو سب کچھ جانتے ہیں. کیا خیال ہے آپ کا کب تک یہ شورش رہے گی؟"

جب ہم اس سے یہ کہتے ہیں کہ یہ بات ہم نہیں جانتے. بلکہ کوئی بھی نہیں جانتا. تو اس کے چہرے پر افسردگی چھا جاتی ہے. "یہ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ وہ کام جو ہم نے خود شروع کیا تھا اب اتنا پھیل چکا ہے. کہ اب ہم بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ کب ختم ہو گا".

چوپڑہ یہ کہہ رہا ہے. "اپور ب میری طرف دیکھتا ہے. اور میں اپور ب کی طرف. مگر چوپڑہ اپنی رو میں کہے جا رہا ہے. "...... شاید اکتوبر کی چھ تاریخ تھی میں اپنے برآمدے میں صبح کے وقت بیٹھا بندوق صاف کر رہا تھا. کہ میرا نوکر دوڑا دوڑا میرے پاس آیا. اور کہنے لگا. کہ مہاراجہ بہادر سری نگر سے بھاگے آ رہے ہیں اور اس وقت ناشری نالے کے پاس سڑک کی خرابی کی وجہ سے رُکے ہوئے ہیں اور بہت پریشان ہیں.

اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہیں کھڑے کھڑے مہاراجہ بہادر نے راولپنڈی کے پناہ گزین سکھوں کو بلا کے یہ بھی کہا ہے کہ "خالصہ۔ راج ہاتھ سے جا رہا ہے بچا سکتے ہو تو بچاؤ۔ اس لئے اب جلد ہی ٹھوٹ میں بھی خون خرابہ ہونے والا ہے۔ اور واقعی اُسی دن ٹھوٹ میں بھی خون خرابہ ہو گیا۔ اس سے پہلے فساد کی یہ آگ ٹھوٹ سے پرے پرے تھی لیکن اس دن یہ یہاں بھی بھڑک اٹھی۔ اُس دن میں نے اسی برآمدے میں کھڑے کھڑے سامنے کی سڑک سے مہاراجہ بہادر کی کار جاتی دیکھی۔ اور ساتھ ہی شاہی سامان سے بھری ہوئی چنڈالیاں بھی۔ پھر یہ بھی سُنا۔ کہ جب وہ بازار میں سے گذر رہے تھے۔ تو وہاں دو ایک گولیاں بھی چلی تھیں۔ اس کے بعد ٹھوٹ مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ اور راولپنڈی کے ان سکھوں نے پہلے تو اُن کے مکان اور دوکانیں لوٹیں۔ اور اب جیسا کہ سب کہتے ہیں۔ کوئی بھی نہیں جانتا۔ کہ یہ مصیبت کب ٹلے گی یہ شورش کب ختم ہو گی؟"

ہمارے سگرٹ ختم ہونے ہی کو ہوتے ہیں۔ کہ کرنل فوراً ہمیں نئے سگرٹ پیش کر دیتا ہے اور پھر خود بھی اپنا پہلا سگرٹ پھینک کر۔ ایک نیا جلا کر۔ کچھ سوچنے لگتا ہے اور پھر کہتا ہے۔ "آپ لوگ یہاں اب کس سلسلے میں آئے ہیں۔ کیا امن قائم کرنے؟"

ہم ہاں کے انداز میں سر ہلا دیتے ہیں۔

"تو جان لو۔ کہ یہ ناممکن ہے" چوپڑہ بڑے وثوق سے کہتا ہے "یہ ناممکن ہے۔ مجھے میرا نوکر کہہ رہا تھا۔ کہ آپ کے ساتھ باقی کے سارے ہوم گارڈز مسلمان ہیں۔ مجھے سرکار پر بڑی حیرانی ہو رہی ہے۔ ایک طرف تو خود یہاں ٹھوٹ میں مسلمانوں کو ختم کرنے کو کہا۔ اور پھر اسی ٹھوٹ میں آپ لوگوں کے ساتھ مسلمانوں کو یہاں بھیج دیا۔ کہ جاؤ ہندوؤں کو سمجھاؤ۔ اور امن قائم کرو۔ اونہہ"

کرنل چوپڑہ کی ناک چڑھ جاتی ہے۔

اور اپورب جو اس گفتگو کے وقت میری موجودگی پر پریشان ہو رہا ہے کہتا ہے "لیکن ہمیں مہاراجہ نے تو نہیں بھیجا۔ ہم تو شیخ عبداللہ کے بھیجے ہوئے ہیں"

"اونہہ شیخ عبداللہ" کرنل چوپڑہ کی ناک بدستور چڑھی رہتی ہے "یہ سب غلط ہے اگر مہاراجہ یہ سمجھتا ہے کہ شیخ عبداللہ کو وہ اپنے ساتھ ملا کر حکومت کر سکے گا۔ تو یہ بھی غلط ہے اور اگر عبداللہ یہ سمجھتا ہے۔ کہ وہ کشمیری ہوم گارڈز میں مسلمانوں کی بھرمار کر کے اپنی ساکھ قائم کر سکے گا۔ تو یہ بھی اس کی بھول ہے اور نہرو تو اب بھی بچہ ہے"

کرنل چوپڑہ دفعتاً اپورب سے پوچھتا ہے "تم بھاکھڑی کے لڑکے ہو نا؟"

"ہاں"

کرنل کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ "وہ میرا دوست تھا"

پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے اس سے کہتا ہے "اور یہ تمہارا دوست ہے" اور اس کے بعد ذرا بزرگانہ سے لہجے میں گویا ہوتا ہے کہ چونکہ ہم دو نو کو وہ اپنا بہت قریبی سمجھتا ہے۔ اس لئے اس کا ہمیں مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ اگر ہم امن قائم کرنے کے لئے رہنا چاہتے ہیں تو ہرگز ہرگز یہاں نہ رہیں۔

"میرا نوکر مجھ سے آج ہی کہہ رہا تھا۔ کہ یوں بھی ٹھوٹ والے ان ہوم گارڈز کو بہت ناپسند کرتے ہیں۔ پھر ان مُسلوں کی وجہ سے اپنی جاتی سے بگاڑ کرنے میں فائدہ؟ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اب زیادہ عرصہ یہاں نہ رہو۔ اور میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ یہاں کے ہندو جلد ہی کوئی فساد بھی پیدا کرنے والے ہیں جن میں وہ سارے ہوم گارڈز کو پھنسانا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے آنے سے ان کے سارے پروگرام رُک گئے ہیں"

بہت رات گئے تک ہم کرنل چوپڑہ کی باتیں سنتے رہتے ہیں۔ پھر جب ہم وہاں سے رخصت ہوتے ہیں۔ تو دونو کے ذہن میں کرنل چوپڑہ کی باتوں سے اگرچہ ایک ہلچل سی مچی رہتی ہے۔ تاہم اس کا اظہار نہیں کرتے۔ ثبوت میں آکر میرے اور اپورب کے درمیان بھی آہستہ آہستہ ایک دیوار سی کھڑی ہو رہی ہے۔ ہم لاکھ اپنے آپ کو فرقہ بندیوں سے بلند رکھنے کی کوشش کریں لیکن ہمارا ہندو اور مسلمان ہونا اب ہمارے ذہن پر بھی چھانے لگا ہے اور باہمی رواداری کو قائم رکھنے کے لئے اب ہمیں خاصی جد وجہد کرنی پڑتی ہے۔ کیا ہم جو ثبوت کے ماحول کو سنوارنے آئے تھے۔ خود بھی اسی رَو میں نہیں بہنے لگے؟

بارش بند ہو چکی ہے۔ ہوا بھی بند ہے نکھرے ہوئے آسمان پر ستارے نکل آئے ہیں۔ ڈاک بنگلے کی طرف جاتے ہوئے راستے میں سڑک کے کنارے کی کسی چٹان پر آسماق کی تاروں بھری چھت کے نیچے کھلی ہوا میں تھوڑی دیر بیٹھنے کو بڑا جی چاہ رہا ہے لیکن نہ جانے کیوں اس وقت میں اپورب سے کچھ کہنے کی اپنے میں بالکل ہمت نہیں پاتا۔ وہاں بیٹھنے تک کو نہیں کہہ سکتا۔ اور اس لئے ہم چلتے جا رہے ہیں خاموش۔ چپ چاپ۔ لیکن اندر ہی اندر خیالات کا ایک طوفان لئے۔

ڈاک بنگلے میں ہمارے کمرے کے باہر رات کو گارڈ ڈیوٹی دینے والے دو ہوم گارڈز کھڑے پہرہ دے رہے ہیں اور ایک چیتھڑا سے کمبل میں لپٹا ایک چوکیدار اونگھ رہا ہے اندر آتشدان میں لکڑیاں جل جل کے بجھ چکی ہیں۔ میز پر پڑا ہوا ہمارا کھانا بھی ہمارا انتظار کر کر کے ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ ہم بغیر کھانا کھائے ہی اپنے اپنے بستروں میں۔ لحاف کے اندر گھس جاتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں۔ جیسے جسم کے اوپر ہم نے برف کی کوئی بڑی سی ڈلی رکھ دی ہو

زندگی کو لات مارنے کو جی چاہ رہا ہے۔ لیکن اپورب اس کے باوجود آج "لات مار اس زندگی پر لات مار" والا مصرع نہیں دہرا رہا۔

پھر اسی برف کی ڈلی کے نیچے سکڑے سمٹے۔ ہم آنکھیں بند کئے کسی اور دنیا میں چلے جاتے ہیں۔ سرما کی راتوں کو بوجھل نیند ہمارے پپوٹوں پر آگرتی ہے۔ آنکھوں کو بند کر دیتی ہے اور ہمیں دور کسی اور دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ اور پھر مدتوں بعد۔ صدیوں کے بعد یا شاید صرف چند لمحوں کے بعد۔ شاید رات کے کچھ گھنٹوں کے بعد۔ نیند کی یہ گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور ہم پر یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ ثبوت کا ایک اور اداس دن ہمارے اُٹھنے سے پہلے ہی طلوع ہو چکا ہے۔ ہمارے کمرے کا دروازہ کھُلا ہے آتشدان میں آگ روشن ہے اور اس کے پاس دو اوم پرکاش۔ ایک اودھم پور کا تحصیلدار۔ اور دوسرا اودھم پور کا وکیل اس طرح کی صورت بنائے بیٹھے ہیں جیسے وہ بڑی دیر سے بیٹھے ہوں۔ وکیل اوم پرکاش ہمیں جاگتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے شاعر شیلے کا ایک شعر دہراتا ہے۔ "جاگ سجنیا جاگ۔ اور اپنی آنکھیں کھول۔ تاکہ ان کی روشنی سے کائنات روشن ہو جائے۔ اور دنیا کو پتہ چل جائے۔ کہ صبح ہو گئی ہے"۔

اور تحصیلدار اوم پرکاش کہتا ہے بھئی اب تو اٹھو۔ بہت انتظار کروایا تم نے"

میں اور اپورب انہیں دیکھ کر ذرا حیران ہوتے ہیں۔ اور پھر مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اوم پرکاش نمبر ۱ سے میں اور اوم پرکاش نمبر ۲ سے اپورب بغل گیر ہوتا ہے۔ اور پھر اوم پرکاش نمبر ۲ سے اپورب میرا اور نمبر ۱ سے میں اپورب کا تعارف کرواتا ہوں۔

"کہو بھئی۔ خیریت تو ہے۔ کب سے آئے بیٹھے ہو؟"

اور وہ ہمیں بتاتے ہیں۔ کہ پچھلی رات ثبوت پر ہنگاموں کی ایک دنیا ٹوٹی۔ رات کو کسی نے حسن دین ڈرائیور کے مکان کو آگ لگادی۔ ایک طوفان بپا ہوا۔ سری نگر اور جموں تک تاریں گئیں۔ پھر ادھم پور سے یہ لوگ آئے۔ آگ بجھی۔ اور اس سارے دوران میں ہم سوئے رہے۔

"مگر ہمیں جگایا کیوں نہیں گیا؟"

"جگانے کی کسی کو اجازت بھی ہوتی۔ تمہارے پہرے دار تو کسی کو اس کمرے کی طرف پھٹکنے بھی نہیں دیتے تھے۔ کہتے تھے آرڈر نہیں ہے۔ اُس وقت بھی جب ساری دنیا آگ بجھا رہی تھی۔ تمہارے ہوم گارڈز سونی لاج میں بیٹھے یہی کہتے رہے کہ اس کا آرڈر نہیں ہے۔ کہ وہ سونی لاج سے باہر نکلیں۔ چنانچہ آگ بجھانے میں بھی انہوں نے کوئی حصّہ نہیں لیا۔ کیونکہ بقول اُن کے اِس کا اُنہیں آرڈر نہیں تھا۔ نجانے ان لوگوں کو کس چیز کا آرڈر ہے۔ اور کس کا نہیں"۔

اپورب کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتا ہے۔ من خوب می شناسم اور تو ہم خوب می شناسی کے انداز میں۔

اور تحصیلدار اوم پرکاش کہتا ہے یہی وجہ ہے۔ کہ ثبوت کے سارے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آگ تمہارے ہوم گارڈز نے ہی لگائی ہے اور اب ہندو ڈرے سہمے بیٹھے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں۔ یہ تمہید تھی۔ ایک غیر آباد مسلمان کے مکان کو جلانے کے بعد اب وہ نیا پینترا بدلیں گے۔ اور ہندوؤں کے آباد مکانوں کو جلانے کی باری آجائے گی" تو اتنا کچھ ہو چکا ہے۔

اپورب میری طرف دیکھتا ہے کہیں اُسے کرنل چہ پڑہ کی باتیں تو یاد نہیں آ رہیں؟

کہیں نہ وہ ان باتوں کی عملی تصویر دیکھنے کے بعد اب مجھے بھی یہ تصویر مع اس کے پس منظر کے دیکھنے کی دعوت تو نہیں دے رہا؟

"مگر تم کمرے میں کیسے پہنچے؟" اپورب پوچھتا ہے۔

تمہارے ہوم گارڈز نے بڑی مشکل سے ہمیں اب کہیں اندر آنے دیا۔ وہ کہتے تھے اب صبح ہو گئی ہے۔ اب کوئی ہرج نہیں۔ چنانچہ ہم اندر آگئے بھئی یہ فوجی پیچ اور یہ آرڈر کے قصے ہم سیدھے سادے سویلین کیا جانیں۔ سوچا۔ شاید اب آرڈر ہو گا"۔ تحصیلدار اوم پرکاش طنز میں ذرا بے تکلفی کا رنگ بھرتا ہے۔

اور تھوڑی دیر بعد جب للی آتا ہے تو وہ بھی اپنی باتوں پر کچھ ایسا ہی طنز اور بے تکلفی کا رنگ چڑھاتا ہے" اخاہ۔ تو صاحب جاگ اُٹھے۔ پرماتما نے ہماری بھی سنی۔ اب یہ جانیں اور ان کے ہوم گارڈز"۔

پھر ذرا سا سنجیدہ ہو کر وہ ہمیں یہ اطلاع بہم پہنچاتا ہے کہ "حالات بڑے مخدوش ہو رہے ہیں۔ سخت اندیشۂ فساد ہے اور بہت ممکن ہے آج کچھ گڑبڑ ہو جائے۔ کیونکہ ثبوت والے ہر جگہ یہی باتیں کر رہے ہیں۔ کہ یہ ہوم گارڈز یہاں امن قائم کرنے نہیں آئے بلکہ فساد کرنے آئے ہیں"۔

یہ بھی خوب رہی۔

اپورب میری طرف دیکھتا ہے۔ اور جب وہ میری طرف دیکھتا ہے تو مجھے اُس کی آنکھوں میں بہت کچھ نظر آتا ہے۔ ان میں بے بسی ہوتی ہے۔ لاچارگی ہوتی ہے۔ دردِ مشترک کا اظہار ہوتا ہے۔ شرکتِ غم میں الفت کے مستحکم کرنے کی پیش کش ہوتی ہے اور بزبانِ بے زبانی ہزاروں گفتگوئیں ہوتی ہیں۔

پراپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور آتشدان کے بالکل قریب ہو کر کوئلوں کی طرف اپنی پیٹھ کرکے اپنے دونو ہاتھ پیٹھ پر رکھ گئے۔ نچے جسم کو ایک خاص ادا کے ساتھ گرم کرنے لگتا ہے اور کمرے میں اب خاموشی ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ سوچ رہے ہیں کیا؟ مگر اس سے کسی کو غرض نہیں۔ بس سب کچھ نہ کچھ سوچ رہے ہیں۔

اُسی دن ٹھوت والوں کی سُنی جاتی ہے جس دین کا جلا ہوا مکان للّی کے اس عقیدے کا ایک ثبوت بن جاتا ہے کہ ٹھوت میں ہمارے ہوم گارڈز کا قیام کسی اندیشۂ فساد کی بنیاد ہے للّی کی سرگرمیاں اور ٹھوت والوں کی تاریں رنگ لاتی ہیں اور ہمارے ہیڈکوارٹرز سے ہمیں ایک تار ملتا ہے۔ کہ ہم تیار ہو جائیں۔ چونکہ بانہال کا راستہ بند ہے اس لئے جموں سے ہمارے لئے لاریاں آجاتی ہیں۔ کہ ہم اُن میں سوار ہو کر ٹھوت چھوڑ دیں اور جموں چلے جائیں۔ سری نگر نہیں جا سکتے۔ تو کم از کم ٹھوت میں ہرگز ہرگز نہ رہیں تاکہ ٹھوت کے لوگ وہ بانسریاں نہ بجا سکیں جن کے لئے ہماری موجودگی بانس کا کام دیتی ہے کسی اور جس دین کے مکان کے جلنے کے امکانات ختم ہو جائیں۔ اور ہم جو امن پھیلانے آئے تھے لیکن اندیشۂ فساد بن رہے تھے۔ یہاں سے چلے جائیں۔

اصولی طور پر ہمیں اداس ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ یہ ہماری نیتوں پر حملہ ہے۔ ہماری ہار ہے۔ ہمارے خلوص پر پردہ پوشی ہے۔ لیکن ہم پھر بھی خوش ہیں۔ ڈوگروں کی اس اندھیر نگری میں اگر ہماری چند ایک جانیں ختم ہو جائیں۔ تو بھی یہ کوئی عجیب بات معلوم نہ ہوتی یہی غنیمت ہے کہ اس کیچڑ سے ہم واپس تو سلامتی کے ساتھ جا رہے ہیں۔ ٹھوت میں جو ہو

باقی کے لوگ باتیں کرتے ہیں سنجیدہ باتیں آہستہ آہستہ لطیفے بنتی ہیں۔ پھر لطیفے شروع ہوتے ہیں۔ مگر ہم چپ ہیں۔ سوچ رہے ہیں۔ یا سُن رہے ہیں۔ یا شاید صرف سُن ہی رہے ہیں۔

تحصیلدار اوم پرکاش ایک لطیفہ سنا رہا ہے "سُنا ہے ایک کشمیری ہوم گارڈز ایک دن اپنی بندوق میں دس گولیاں بھرے اور گیارھویں بندوق کے چیمبر میں رکھے پہرہ دے رہا تھا کہ بندوق کا ٹرگر [illegible] جو اتفاق سے ذرا ڈھیلا تھا۔ اپنے آپ دب گیا۔ اور چیمبر والی گولی زّ سے چل گئی۔ جس پر بیچارے کا دل دہل اٹھا اور اُس نے بے اختیار بندوق پرے پھینک دی۔ اور پھر بازو ہلا ہلا کے اور کُود کُود کے چیخنے لگا ارے۔ کوئی اس کے قریب نہ آئے۔ پرے رہو۔ ابھی اس میں دس گولیاں اور ہیں۔ وہ بھی چلیں گی۔ اس لئے پرے رہو۔ پرے رہو۔ پرے رہو...... "

ہی ہی۔ ہی۔ ہی۔ کرتے ہوئے تحصیلدار اوم پرکاش یہ لطیفہ سنانے کے بعد ہم سے پوچھتا ہے "کیوں۔ کیا واقعی یہ بات ہوئی تھی؟" لیکن یہ دیکھ کر کہ ہم اس لطیفہ سے بالکل محفوظ نہیں ہوئے۔ بلکہ اپنے ہوم گارڈز کے خلاف اس داستان سرائی میں ہمیں اپنی ہتک کا بھی ایک پہلو دکھائی دے رہا ہے۔ وہ کھسیانہ سا ہو کر اوم پرکاش نمبر ۲ کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ للّی کی طرف بھی دیکھتا ہے اور پھر یہ دیکھ کر کہ دوسرے لوگ بھی ہماری خاموشی سے متاثر ہیں۔ اور داد دینے کے لئے کم از کم اس وقت تیار نہیں۔ اسی ایک لطیفے پر اکتفا کرتا ہے۔ اور پھر کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے اِدھر اُدھر یوں دیکھنے لگتا ہے۔ جیسے ماحول میں کچھ ڈھونڈھ رہا ہو۔ کوئی اور رشتے تلاش کر رہا ہو جس کے بارے میں گفتگو کی جا سکے۔ اب للّی بھی جیسے اپنے کسی اندرونی اضطراب کو دباتے ہوئے غیر اضطراری طور

چکا۔ وہ ہو چکا اور جو ہونا ہے وہ ہوتا رہے وہ ہو کے رہے گا۔ پھر اب ہم خواہ مخواہ خیالی عقیدوں اور آدرشی بلندیوں کے سراب میں اپنے آپ کو کیوں پریشان کرتے پھریں اس لئے ہم خوش ہیں۔

اور اسی لئے اگلی صبح جب کہ ہمیں روانہ ہونا ہے۔ بڑی مصروفیتوں کے ساتھ آ تی ہے۔ ہم جا رہے ہیں اور اس لئے پناہ گزین ہوٹل کے پچھلے بل ادا کئے جا رہے ہیں۔ ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔ اور اس امر سے بے نیاز کہ ہمارے لئے یہ کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی محض رسماً لقی سے کہا جا رہا ہے۔ کہ ہم پھر بھی آئیں گے۔ ڈاک بنگلے کے چوکیدار کے ساتھ مسکرایا جا رہا ہے۔ تاکہ وہ ہماری خوش اخلاقی سے متاثر ہو۔ اور ہمیں بعد میں مزید بدنام نہ کرے بستر باندھے جا رہے ہیں۔ اور چونکہ مہاراج کشن جو بھدرواہ میں کشمیری ہوم گارڈز کی ایک کمپنی کا کمانڈر ہے وہاں سے ایک بے ڈھنگی سی خچر پر سوار ہو کر یہاں آ پہنچا ہے اس لئے جلدی جلدی اس سے بھی باتیں ہو رہی ہیں۔

مہاراج کشن کہہ رہا ہے بھدرواہ میں سنگھ آ پہنچے انھوں نے مسلمانوں پر حملہ کیا۔ پھر پورے چھبیس گھنٹے تک باقاعدہ مورچہ بندی کے ساتھ لڑائی ہوتی رہی اور پھر گولہ بارود کی کمی کی وجہ سے فریقین نے اسے خود ہی بند کر دیا۔ ہندو شاید بند نہ کرتے۔ مگر انہیں وہ کمک وقت پر نہ پہنچی جس کا انہیں انتظار تھا۔"

"کونسی تھی وہ کمک؟" ہمارا دھیان سفر کی تیاریوں کی طرف ہے پھر بھی ہم پوچھتے ہیں

"ڈوگرہ ملٹری کی جس کا کپتان پیار چند ہے اور جو اب وہاں پہنچ چکی ہے۔ لیکن صرف اس لئے مسلمانوں پر حملہ نہیں بول سکتی۔ کہ وہ میرے مسلمان ہوم گارڈز سے ڈرتا ہے۔" مہاراج کشن کہتا ہے۔

"اب کیا حال ہے؟"

"بہت بُرا"

"وہ کیسے؟"

"اب وہاں ایک اور لڑائی ہونے والی ہے"

ہم چونک پڑتے ہیں۔

اور مہاراج کشن ہمیں بتاتا ہے کہ کپتان پیار چند وہاں علی الاعلان کہتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو گوشمالی دے گا اور اسے بھی مشورہ دیتا ہے بلکہ مجبور کرتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی بہانے سے اپنے ہوم گارڈز کو وہاں چلتا کرے ورنہ اس کی فوج کو پہلے ان ہی سے نپٹنا پڑے گا۔

"میں تم سے یہاں مشورہ کرنے آیا تھا۔ کہ اب میں کیا کروں۔ اور تم جا رہے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ اب میں حالات کا سامنا کیسے کروں۔ ایک آدھ دن میں میرے ہوم گارڈز کو بھدرواہ سے نکل جانا چاہیئے تاکہ وہاں کے مسلمان پیار چند کے منہ کا ذرا آسان لقمہ بن سکیں۔ ورنہ ان کے ساتھ ساتھ اُس کی فوج میرے ہوم گارڈز کو بھی ختم کر دے گی" مہاراج کشن کے لہجے میں بس عاجزی ہی عاجزی ہے "یقین جانو اس صوبے میں مہاراجہ بہادر کی جے کے ساتھ شیخ عبداللہ شیرِ کشمیر اور زندہ باد کہنے والا نعرہ نہیں چل سکتا"

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک دن پہلے جو باتیں میں نے اپورب سے کی تھیں۔ اور جن کی وجہ سے ہم میں بدمزگی سی پیدا ہونے لگی تھی۔ اب مہاراج کشن بھی دُہرانے کو ہے۔

اپورب بھی غالباً یہی محسوس کرتا ہے کیونکہ وہ اب مہاراج کشن کو اسی انداز میں گھور کے دیکھتا ہے جس انداز میں کہ اُس دن اس نے مجھے دیکھا تھا۔

لیکن مہاراج کشن اس گھورنے سے بے نیاز ہو کر کہے جا رہا ہے"........ اگر ہم دو

ایک دن اور وہاں رہے تو پیار چند کی فوج کے ساتھ ہماری لڑائی یقینی ہے۔ ابھی دو ہی دن ہوئے ہیں پیار چند نے میرے سامنے شیر کشمیر کو گالیاں دیں۔ اور کہا کہ اگر ہمارے مہاراجہ بہادر نے اُسے اس وقت حکومت کے کاموں میں دخل دینے کا اختیار دیا ہے تو صرف اس لئے کہ اس کے مسلمانی نام کا پردہ مسلمانوں کی آنکھوں پر پڑا رہے اور مہاراجہ کے سیاسی پروگرام میں آسانیاں رہیں۔ نہ کہ اس لئے کہ اس وجہ سے الٹا ہرج ہونے لگے۔ بلکہ پیار چند نے مجھے بھی بُرا بھلا کہا۔ اور کہا کہ میں بے وقوف ہوں جو اتنا بھی نہیں سمجھتا۔ کہ آخر ایک ہندو کو ان مسلمان ہوم گارڈز کا کمانڈر بنانے میں حکومت کی کیا مصلحت تھی؟..........!"

مہاراج کشن زہر اُگل رہا ہے اور اپورب غالباً یہ سوچ رہا ہے کہ اس زہر کے جراثیم اگر یوں ہی پھیلتے رہے اگر مہاراجہ کے بعد پیار چند اور پیار چند کے بعد مہاراج کشن میں بھی یہ سرایت کر گئے اور پھر ان کا اثر مہاراج کشن کے ہوم گارڈز تک بھی جا پہنچا تو پھر کیا ہوگا؟ پھر اس کی منزل کہاں ہوگی اور پھر جو طوفان اٹھے گا۔ وہ کون سی راہ اختیار کرے گا؟

اپورب اُداس سا ہو کر پھر سے سفر کی تیاریوں کی طرف دھیان دینا۔ اور میرے دھیان کو بھی اسی طرف لگائے رکھنا مناسب سمجھتا ہے۔ اور اس لئے ہم جلدی جلدی چائے پیتے ہیں پھر لاری میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور بھوت کی دو رویہ دکانیں ایک ایک کر کے ہم سے دور ہونے لگتی ہیں اور عین اس وقت نہ جانے کس نفسیات کے علم کے طفیل کچھ لمحوں کے لئے ٹھوت ہمیں پیارا معلوم ہونے لگتا ہے۔ وہ سکھ جن کے ہوٹل سے ہم آج تک کھانا کھاتے رہے تھے اپنی دوکان پر کھڑے ہاتھ ہلا کے الوداع کہتے ہیں سڑک کے ایک کنارے پر ہمیں مہاراج کشن بھی نظر آتا ہے۔ جو اپنی خچر پر پھر سے چڑھ بیٹھا ہے۔ اور جس کی

لمبی ٹانگیں خچر کے نسبتاً چھوٹے قد کے ساتھ چمٹ کر یوں دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے وہ بھی خچر ہی کے جسم کا ایک حصہ ہوں جیسے خچر چھ ٹانگوں والا کوئی جانور ہو عین اس لمحے میں میرے سینے میں ایک آرزو بیدار ہوتی ہے۔ اے کاش! ہم ایک دن ٹھوت میں اور رہ لیتے۔ مہاراج کشن سے گپ شپ ہی رہتی۔"

جلد ہی یہ آرزو پھر سے کہیں غائب ہو جاتی ہے۔ اب اس طرح کا ہر خیال آنی جانی بن رہا ہے ٹھوت پیچھے رہ گیا ہے اور اب میں بھی اس ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا ہوں جس میں صرف لاری کے انجن کا شور ہے۔ اور یا ہمارے ہوم گارڈز کے اس کشمیری گیت کا زیر و بم۔ جو وہ لاری کے پچھلے حصے میں بیٹھے گا رہے ہیں۔ اور جو غالباً محبت کا کوئی گیت ہے جو غم انگیز ہو۔ تو بھی خوشی کے موقعوں پر گایا جا سکتا ہے۔

ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

مقام ــــــ جموں

وقت ــــــ جنوری ۱۹۸۰ کا دوسرا ہفتہ

جموں وہ شہر تھا جہاں کے سورج کی سب سے پہلی کرنیں اُن ان گنت مندروں کے کلس پر پڑتی تھیں۔ جن سے ان کی چاندی جگمگا اٹھتی۔ اور جموں وہ شہر تھا جہاں سے شام کو سیالکوٹ سے آنے والی ٹرین میں بیٹھے ہوئے مسافر جب ستواری چھاؤنی کے سٹیشن سے گزرتے ہوئے ریل کی کھڑکیوں میں سے گردنیں باہر نکال کر جموں کی طرف دیکھتے تو پہاڑ کی چوٹی پر شہر کی روشنیاں دور سے ہزاروں۔ لاکھوں کروڑوں جگنوؤں کی مانند نظر آتیں۔ تو وہ منزل سے بے نیاز ہو جاتے۔ اور اُن کا جی چاہتا کہ بس گاڑی اب بے شک آگے نہ بڑھے۔ اس ستواری کے ارد گرد ہی رینگتی رہے کم از کم یہ دلکش منظر تو آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ پھر جموں وہ شہر تھا۔ جو اگرچہ شام کو پہنچنے والے مسافروں کو دُور سے جگنوؤں کی بستی نظر آتا تھا

لیکن اپنے حسن۔ اپنے وقار۔ اپنی رومانیت اور اپنی ایک الگ انفرادیت سی لئے ہوئے ہونے کی وجہ سے ایک انگریز سیاح کو ایک مرتبہ کسی عقاب کا گھونسلا بھی معلوم ہوا تھا۔ اور اپنے اِس خیال کے اظہار کے لئے اسے کشمیر کی ایک گائیڈ بھی لکھنی پڑی تھی۔ اور پھر جموں وہ شہر تھا جہاں کی نہر میں چناب کا پانی گرمیوں میں ہمالیہ کی پگھلی ہوئی برف لاتا جس کے کنارے بیٹھ کر لوگ گرمیوں میں آموں کی پوٹلیاں اور دودھ کی بوتلیں اس پگھلی ہوئی برف میں لٹکا دیتے اور پھر ان کی بے پناہ ٹھنڈک کے مزے لیتے۔ آموں کی یہ پوٹلیاں اور دودھ کی بوتلیں وزیر آباد تک سے آتی تھیں۔ کیونکہ وزیر آباد کا جموں سے فاصلہ کچھ ایسا تھا کہ لوگ صبح آکر سارا دن پگھلی ہوئی برف کے مزے لینے کے بعد شام کی گاڑی سے واپس جا سکتے تھے۔ پھر جب سردیاں پڑتیں نہر میں پگھلی ہوئی برف آنی بند ہو جاتی اور صرف چناب کا پانی ہی آتا تو شام کے دھندلکوں میں اور رات کی چاندنی میں پیار دل کی بستی کو لبھانے کے کھیل کھیلے جاتے۔ اور چناب کے اِس پانی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جاتا۔ جس میں ہمالیہ پر رہنے والے دیوتا وہ امرت گھول کر بھیجا کرتے تھے جو دلوں میں پریم کا رس بھر دیتا تھا۔ اور جس کی تاثیر سے چناب پنجاب کی سرزمین میں جا کے عشق و عاشقی کی بڑی بڑی کہانیاں جنم دینے کے لئے مشہور تھا۔ اور پھر جموں ہی وہ شہر تھا جہاں ڈوگری کا ایک شاعر دینو بھائی پنت رہتا تھا جس نے جموں کی پیاری باتیں کسی نہ کسی طور اپنی کسی نہ کسی نظم میں کہہ رکھی تھیں اور جس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی شاعری سے جموں کو اور جموں سے اپنی شاعری کو زندہ جاوید بنا دیگا

جموں کا یہ شاعر اب بھی جموں میں ہے۔ لیکن اب وہ شعر نہیں کہتا۔ وہ کہتا ہے کہ اب جموں اس کے سپنوں والا جموں نہیں رہا۔ پھر وہ شعر کیسے کہے؟ وہ کہتا ہے کہ سورج کی کرنیں اب بھی سب سے پہلے مندروں کے کلس پر ہی پڑتی ہیں۔ پر اب ان کی چاندی نہیں جگمگاتی۔ کیونکہ اب وہاں چاندی ہو تو جگمگائے۔ چاندی تو مہاراجہ نے اس ڈر سے اتروا کے کہیں دور بھیج دی ہے۔ کہ کہیں وہ لوگ جنہوں نے اسے سرینگر سے بھاگنے پر مجبور کیا تھا یہاں بھی آ پہنچیں۔ اور اسے یہاں سے بھی بھاگنا پڑے چنانچہ اس خیال سے کہ شاید اُس وقت اتنی فرصت نہ ملے۔ اس نے ابھی سے اس کا انتظام کر دیا ہے۔ اور اس لئے اب مندروں کے لنڈ منڈ کلس پر جب سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو شاعر کی شاعری کا چشمہ پھوٹنے سے پہلے اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اب شام کی ٹرین کے مسافروں کو ستواری چھاؤنی سے جموں کا شہر بھی جگنوؤں کی بستی نظر نہیں آتا۔ کیونکہ اب وہ مسافر ہی نہیں رہے۔ جو یہ منظر دیکھا کرتے تھے۔ اور اب وہ ٹرینیں ہی نہیں رہیں جو ایسے مسافروں کو لایا کرتی تھیں یہ ٹرینیں جو وزیر آباد اور سیالکوٹ سے آیا کرتی تھیں اب بند ہو گئی ہیں۔ کیونکہ اب سیالکوٹ اور وزیر آباد پاکستان میں ہیں اور ہندوستان جو جموں کا نیا آقا بننا چاہتا ہے۔ ان طول و طویل فاصلوں کے پیچ و خم سے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں کر سکتا جو ہندوستان کے کسی نزدیک ترین شہر سے بھی یہاں تک ٹرین لانا برداشت نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ بات بھی اب جاتی رہی ہے اور پھر عقاب کے گھونسلے والی بات بھی اب نہیں رہی۔ کیونکہ وہ لوگ جو کشمیر کی سیاحت کے لئے آتے تھے۔ اور کشمیر گائیڈ خریدتے تھے اور جنہیں لامحالہ یہ بات بھی پڑھنی پڑتی تھی اور پھر یاد رکھنی

پڑتی تھی۔ اب نہیں آتے۔ وہ بھی اب ان ٹرینوں اور فاصلوں کے مسئلوں میں پس کر رہ گئے ہیں۔ چنانچہ اب وہ نہیں آ سکتے۔ اس کے علاوہ وہ لوگ جو اس عقاب کے گھونسلے میں رہتے تھے۔ انہیں تو خیر مدت ہی سے اس کا علم تھا۔ کہ یہ محض ایک تشبیہ ہے۔ ورنہ اس گھونسلے میں کوئی عقاب نہیں رہتا۔ اس لئے انہوں نے کبھی اس کو اتنا اہم ہی نہ سمجھا تھا۔ یہ باہر سے آنے والے سیاحوں کی باتیں تھیں۔ یہاں کے رہنے والوں کے مسائل کچھ اور تھے۔ پھر وہ ان باتوں میں کیوں دخل دیتے۔ اب کشمیر کی وہ گائیڈ جس میں وہ جملہ محفوظ تھا جموں کے گنتی کے کتب فروشوں کی دکانوں کی کسی اندھیری کوٹھڑی میں پڑی سڑ رہی ہے۔ اور سوائے ڈوگری کے شاعر پنت کے شاید کسی اور کو یہ جملہ بھی یاد نہیں۔ اور جیسا کہ پنت نے مجھے بتایا۔ وہ بھی اسے بھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ فائدہ؟ ان دنوں گرمیاں بھی نہیں ہیں۔ اس لئے گرمیوں والی مہاہمی کو دیکھنے کا تو خیر خیال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن سردیوں والے کاروبار بھی اب سیاست کے نئے چکر میں آ کر پس گئے ہیں۔ اس سال چناب کے پانی میں ہمالیہ پر رہنے والے دیوتاؤں نے پریم امرت کے بجائے شاید کسی زہر کی بوندیں ٹپکا دی تھیں۔ کیونکہ اب کے اس کے کنارے پر پریم پیار کے کھیلوں کے بجائے کچھ اور اور قسم کے نرالے کھیل کھیلے گئے ہیں۔ اب جموں کی نہروں کے میل کی جگہ نہیں رہی بلکہ وہاں آج کل وہ ہندوستانی سپاہی گھومتے ہیں۔ جنہیں کچھ دنوں سے سرخ رنگ بڑا پیارا معلوم ہونے لگا ہے۔ یہ لوگ کچھ عرصہ پہلے تک پنجاب میں انسانی لہو سے سرخ ہولی کھیلتے رہے تھے۔ اور آج کل نہر کے شفاف پانی کو بھی رنگ دینے کے لئے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ اور چونکہ وہ سپاہی ہیں اور سپاہی ہمیشہ جان سے کھیلتا ہے

اس لئے نہر کو سرخ کرنے کا سب سے آسان طریق انہیں یہی نظر آتا ہے کہ یہاں بھی کسی کی جان ہی سے کھیلا جائے۔ چنانچہ یہاں آکر بھی وہ اپنا محبوب کھیل نہیں بھولے اس لئے وہ جو جموں کے ماضی کے پرستار ہیں۔ انہیں نہر پر بھی اپنی تسلی کا کوئی سامان نہیں ملتا۔

شاید یہی وجہ ہے۔ کہ اب دینو بھائی پنت شعر نہیں کہتا۔ اب جب میں ڈوگری کے اس شاعر سے ملا۔ تو اس کے پاس مجھے سنانے کے لئے کوئی نئی نظم نہ تھی۔ "میری شاعری کا جموں مر چکا۔ اب میں کس پر نظمیں لکھوں"۔ اور جب میں نے کہا "موت بذات خود بھی تو ایک موضوع ہے" تو وہ بولا۔ "مرثیے نہ آج تک لکھ سکا ہوں۔ نہ لکھ سکوں گا"۔ اور پھر ایک زہر خند اس کے ہونٹوں پر پھیل گیا۔

ہم اس وقت جموں کے مشہور پریڈ گراؤنڈ میں کھڑے تھے۔ پریڈ گراؤنڈ کے ایک حصے میں مقامی ہوم گارڈز لفٹ رائٹ۔ لفٹ رائٹ کر رہے تھے۔ اُن سے ذرا فاصلے پر لڑکیوں کی ہوم گارڈز کا ایک دستہ بھی نظر آ رہا تھا۔ ڈمی بندوقیں تھامے آنچلوں کو اپنے سینہ پر پھیلائے۔ ناپ ناپ کر۔ تول تول کر۔ پاؤں رکھتے ہوئے۔ جسم سنبھالے قواعد کرتے۔

پنت ان کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ جانتے ہو یہ گھبرائی ہوئی سی کیوں ہیں انہیں ڈر ہے کہ کوئی انہیں دیکھ کر "یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں • نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے" والا شعر نہ پڑھ دے۔

میں مسکرانے لگا۔

اور پنت بولا۔ کبھی مجھے اُردو کے بہت سے شعر یاد ہوا کرتے تھے پر اب سب

بھولتے جا رہے ہیں۔ بس لے دے کے صرف یہی ایک شعر یاد رہ گیا ہے اور شاید یہ بھی اب تک بھول جاتا۔ اگر میں ان لڑکیوں کو روزانہ یہاں پریڈ کرتے ہوئے نہ دیکھا کرتا۔ ہر روز جب میں یہاں سے گزرتا ہوں۔ انہیں دیکھتا ہوں۔ تو یہ شعر یاد آجاتا ہے"۔

مجھے یہ سن کر کچھ تسلی ہوئی۔ پنت نے شاعری چھوڑ دی ہے تو کیا ہوا۔ زندگی کے خلاف ہو گیا ہے تو کیا ہوا۔ زندگی پر کم از کم ہنس تو وہ اب بھی سکتا ہے۔

پنت کہنے لگا۔ "وہ جموں جو مر چکا۔ یہ پریڈ گراؤنڈ اس کا قبرستان ہے۔ یہ سامنے جو کچھ تمہیں نظر آ رہا ہے۔ سب ہیولے ہیں۔ بھٹکی ہوئی روحیں ہیں۔ جو زندگی کا تمسخر اڑانے یہاں آئی ہوئی ہیں۔ یہ پریڈ سب ڈھونگ ہے۔ لڑکے اس لئے پریڈ کر رہے ہیں کہ اس بہانے انہیں اور بندوقیں مل جائیں گی۔ اور وہ اپنے بھائیوں کو مارنے کا باقی ماندہ پروگرام مکمل کر سکیں گے۔ لڑکیاں اس لئے پریڈ کر رہی ہیں۔ کہ پریڈ کرنا اب فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ اور وہ لڑکیاں ہی کیا ہوئیں۔ جو فیشن میں پیچھے رہیں"۔

پنت تھوڑی دیر بعد بولا۔ "وہ جموں جواب ہے۔ یہ پریڈ گراؤنڈ اس کا شوکیس ہے۔ آج کے جموں میں جو کچھ ہے۔ اس کے نمونے تمہیں اس پریڈ گراؤنڈ میں مل جائینگے آج کے جموں میں صرف دو قسم کے ہی لوگ رہتے ہیں۔ وہ جو بندوقیں سنبھال کر تباہی کے خواب دیکھتے ہیں۔ اور جن کا لیبل ہے ہوم گارڈز۔ اور دوسرے وہ جو اسی طرح کی کسی تباہی کا شکار بنے۔ پر چونکہ سخت جان تھے۔ اس لئے بچ نکلے۔ اور اب یہاں آکر اپنے آپ کو پناہ گیر کہنے لگے ہیں۔ اور یہ دونوں اجڑی ہوئی انسانیت کے مرقعے ہیں"۔

اب پنت پریڈ گراؤنڈ کے ایک اور طرف دیکھنے لگا۔ دور ایک کونے میں کچھ ہندو پناہ گیر۔ ٹرنکوں۔ بستروں اور بکھرے ہوئے برتنوں کے انبار میں گرے پڑے تھے

انہیں غالباً ابھی تک کسی کیمپ میں جگہ نہ ملی تھی۔ پنت ان کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا "یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنی جان بے حد عزیز تھی۔ چنانچہ انہوں نے محض اپنی جان کو بچانے کے لئے انسانیت کی ساری اعلیٰ قدروں سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ اب اِن کی یہ کیفیت ہے۔ کہ ان کی بلا سے بُوم بسے یا ہُما رہے۔ انہیں کسی کا دکھ نہیں۔ کسی سے محبت نہیں۔ جو ہوتا ہے ہوتا رہے۔ انہیں ذرا سی سردی لگتی ہے۔ اور اِن کی قوتِ ارادی دم توڑ دیتی ہے۔ اور پھر وہ خود بھی دم توڑ دیتے ہیں۔ چونکہ موتیں زیادہ ہو رہی ہیں۔ اس لئے ایندھن دن بدن مہنگا ہو رہا ہے اور چونکہ ایندھن مہنگا ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ اپنے مُردوں کو پھینک دیتے ہیں۔ نہ ہم کسی کے۔ نہ کوئی ہمارا۔ اور اس لئے یہ اس کے وارث بننے سے مُکر جاتے ہیں۔ محض اس لئے کہ اسے جلانے کی زحمت سے انہیں چھٹکارا ملا رہے۔ اب بتاؤ۔ کیا تم اس شہر کو جہاں ایسے لوگ بس رہے ہوں۔ جموں کہو گے۔ اگر تم میری جگہ ہوتے اور تم نے یہ فیصلہ کر رکھا ہوتا۔ کہ تمہاری شاعری میں صرف جموں ہو گا تو کیا اب بھی شاعری کر سکتے؟ کیا اسے بھی تم جموں ہی سمجھتے؟ جہاں صرف ہوم گارڈز بستے ہیں یا پناہ گیر۔ اور جہاں کوئی انسان نہیں بستا۔"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں سوچ رہا تھا۔ پنت سچ کہتا ہے۔ یہ پریڈ گراؤنڈ اِس جموں کا قبرستان ہے۔ جو مر چکا۔ یہی وہ میدان تھا۔ جہاں آج سے دو ہی مہینے پہلے جموں کے سارے مسلمانوں کو جمع کیا گیا۔ انہیں قافلوں میں تقسیم کر دیا گیا اور پھر انہیں لاریوں میں لاد کر پاکستان کے رُخ ایک ایسے میدان میں لے جایا گیا جہاں پاکستان زندہ باد اور جے ہند کے جیکاروں کے درمیان بندوقوں کی ڈز ڈز ہوئی۔ کرپانیں اُٹھیں

تلواریں لہرائیں اور جموں کے مسلمانوں کا سب کچھ ختم کر دیا گیا۔ مال۔ جان۔ عزت۔

پنت کہنے لگا "معلوم ہوتا ہے۔ تم کسی سوچ میں پڑ گئے ہو۔ اگر تم نے یوں سوچنا شروع کیا تو مر جاؤ گے۔ میری شاعری سوچا کرتی تھی۔ اس لئے مر گئی۔ میں چونکہ ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے سوچتا بالکل نہیں۔ بس صرف دیکھتا ہوں۔ وہ دیکھو۔" اور وہ پریڈ گراؤنڈ کی ان لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جن کی وجہ سے پنت کو اُردو کا ایک شعر اب تک۔ یاد تھا۔

میں نے کہا۔ "پنت تم کہتے ہو اب شاعری نہ کرو گے۔ شاعر تو مجھے اب بھی زندہ دکھائی دے رہا ہے۔ پھر شاعری کیسے مر سکتی ہے؟"

اور وہ پہلے سے بھی زیادہ محزون لہجے میں کہنے لگا "میں نے کب کہا ہے کہ میں مر چکا ہوں۔ میں تو بڑا سخت جان ہوں اور ابھی بڑی دیر تک زندہ رہنے کے ارادے بھی ہیں۔ البتہ شاعری بڑی نازک تھی۔ جموں کے مرتے ہی مر گئی۔"

پنت نے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ذرا ایک طنزیہ انداز میں کہنے لگا۔ "دیکھو۔ سوچو مت۔ تم پھر سوچنے لگے ہو زندہ رہنا ہے تو اپنے دماغ کو سُلائے رکھو۔ اور صرف دیکھا کرو۔ اس پریڈ گراؤنڈ کو اور آج کے جموں کے اس شوکیس کو۔۔۔۔۔۔۔۔"

میں ہنسنے لگا۔

پریڈ گراؤنڈ جموں کا شوکیس ضرور ہے مگر یہ شوکیس نامکمل ہے اس میں آج

کے جموں کی تصویر کے نمایاں اجزاء تو نظر آ جاتے ہیں۔ تاہم پس منظر کی جزئیات دکھائی نہیں دیتیں۔ اور یوں یہ تصویر ادھوری رہ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر یہاں ان پناہ گیروں کی ایک جھلک تو نظر آ جاتی ہے جو کسی دور دیش کے رہنے والے ہیں اور جو جموں میں کسی نئے گھر کے بسانے کا خواب لے کر آئے ہیں مگر ان کا اس تصویر میں کوئی عکس نظر نہیں آتا جو یہیں کے رہنے والے ہیں اور پھر بھی پناہ گیر ہیں۔ جو یہیں جنمے پلے۔ بڑھے۔ جوان اور بوڑھے ہوئے اور جن میں سے اکثر اب بھی اپنے باپ دادا، پردادا کے بنائے ہوئے مکانوں میں رہ رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہاں یوں آباد ہیں۔ جیسے کسی پردیس میں ہوں۔ کسی اور منزل کے مسافر ہوں اور یہاں محض پناہ گیر ہوں۔ وہ پس ماندگان جو پاکستان جانے والے قافلوں میں نہ جا سکے اور وہ سخت جان جو ان قافلوں میں گئے۔ لیکن بدنصیبی کی ہزاروں ٹھوکریں کھانے کے بعد خون کے دریاؤں میں تیرتے ہوئے پھر یہیں واپس آ گئے۔ پریڈ گراؤنڈ میں کہیں نظر نہیں آتے۔ ان کا نیا مسکن محلہ استاد ہے۔ جموں کے سارے مسلمان محلے اب ویران ہیں۔ اور ان کے رہنے والے جو نہ مر سکے ہیں اور نہ ہی پاکستان جا سکے ہیں۔ اب سکڑے سمٹے ایک جگہ رہتے ہیں۔ یہ فریب خوردگانِ وفا ہیں۔ پھر بھی کسی بادِ وفا کے منتظر ہیں۔ زندگی سے ان کا اعتبار اٹھ چکا ہے پھر بھی زندہ ہیں۔ اور اس خوف سے کہ وہ زندگی جسے جوں توں کر کے وہ اب تک سنبھال سکے ہیں۔ کہیں اب ان کے ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔ وہ دوسرے پناہ گیروں کی طرح اِدھر اُدھر گھوم کر دوسروں کو اپنے غم والم کی کہانی سنا کر اپنے غمِ دل کا مداوا تک ..ش کرنے کی کوئی سعی نہیں کرتے۔ محلہ استاد والی پناہ گاہ سے کہیں باہر نہیں

جاتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جموں کا پریڈ گراؤنڈ ان کی کوئی نمائندگی نہیں کرتا۔ اس شوکیس میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ اور وہ جو آج کے جموں کی پوری تصویر دیکھنے کے مشتاق ہیں۔ انہیں خود ان کے پاس جانا پڑتا ہے۔

یوں بھی محلہ استاد ان دنوں خاصی اہم جگہ ہے۔ کیونکہ جموں میں مسلمانوں کے باقی سارے محلے اجڑنے کے بعد اب صرف یہی ایک محلہ رہ گیا ہے۔ جہاں مسلمان رہتے ہیں۔ اس لئے اب اسے سرکاری طور پر بھی جموں کے قابل دید مقامات میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اور ہر وہ بڑا آدمی جسے تقریر کرنا ہوتی ہے وہاں ضرور جاتا ہے۔ شیخ عبداللہ بھی۔ بیگم عبداللہ بھی۔ بخشی غلام محمد بھی۔ اور چونکہ مہاراجہ ہری سنگھ بھی ان دنوں وہ مردِ پشیمان بن رہا ہے۔ جس نے قتل کے بعد بظاہر قتل سے توبہ کر لی ہے۔ اس لئے وہ بھی اپنی وکالت کے لئے اپنی مہارانی کو تقریر کرنے کے لئے اکثر اسی محلے میں بھیجتا رہتا ہے۔ ان کے علاوہ بعض اور لوگ بھی یہاں اکثر آتے رہتے ہیں۔ جن میں سب سے نمایاں بخشی غلام محمد کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر کاشی ناتھ ایر ہیں۔ مسٹر ایر چمڑے کی چست جیکٹ پہنے۔ تازہ تازہ شیو کئے۔ رگھوناتھ بازار کی سب سے بڑی شراب کی دوکان سے ہوتے ہوئے ہر شام کو یہاں آتے ہیں۔ اور پھر محلہ استاد کے مختلف گلی کوچوں میں پھرتے ہیں۔ اور یہاں کے رہنے والوں کو تسلیاں دیتے رہتے ہیں۔ وہ ...... آپ لوگوں کی ساری تکلیفیں ہم دور کر دیں گے۔ راشن کا سارا انتظام ہو جائے گا۔ کپڑا بھی مل جائے گا لیکن دیکھئے نا۔ آپ بھی تو آخر سوچئے۔ کہ ہم اس وقت ایک جنگ لڑ رہے ہیں اس لئے اگر آپ کو کوئی شکایت ہو بھی تو آپ کو حکومت کے ساتھ ہمدردی کرنی چاہئیے۔

اور خاموش رہنا چاہیئے.......... یہ ٹھیک ہے۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ جموں میں اب بھی سنگھیوں کا زور ہے۔ مگر آپ کو گھبرانا نہیں چاہیئے۔ اگر سنگھی چھوکرے مندر سے پوجا کرنے کے بعد آپ کے محلے کے سامنے سے جلوس کی صورت میں گزرتے ہیں تو یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ جس پر آپ پریشان ہونے لگیں۔ آخر ہم کسی طرح کی مذہبی مداخلت تو نہیں کر سکتے نا۔ پھر مندر میں جانے سے کسی کو حکومت کیسے روک سکتی ہے؟.......... ہاں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن ابھی کچھ دن آپ اگر اذان دیئے بغیر ہی نماز پڑھ لیا کریں۔ تو زیادہ بہتر ہو۔ خواہ مخواہ کسی کو اشتعال دینے سے فائدہ؟ اور پھر اب آپ وہ بھی تو اقلیت میں گئے ہیں......" — پھر جب وہ سارے محلہ استاد کے دو ایک چکر کاٹ لیتے ہیں۔ اور بعض گلیوں کے سرے پر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ذرا ذرا رکنے کے بعد اور ادھر اُدھر پُر معنی انداز میں دیکھنے کے بعد واپس جانے لگتے ہیں۔ تو اُن کی باتوں کا رخ جانے کیسے ہمیشہ تہذیب و تمدن کے ٹھوس مسائل کی طرف پلٹ جاتا ہے۔ اور وہ مسلمانوں کے پردہ سسٹم اور اس کی برائیوں پہ اظہار خیال کرنے لگتے ہیں — "......... اگر آپ لوگوں میں یہ پردہ نہ ہو تو ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ سکتے ہیں۔ ہم لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ اور دو قوموں کی تھیوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا......." — اور پھر وہ دو قوموں کی تھیوری پر اور اس سے زیادہ مسلمانوں کے پردہ سسٹم پر لعنتیں بھیجتے اور ناک بھوں چڑھاتے ہوئے واپس چلے جاتے ہیں۔

اور پھر یہاں وہ ترقی پسند ادب بھی آتے ہیں۔ جن کا کام ادب سے زندگی کا رشتہ جوڑنا ہے۔ اور جو ہندوستان سے جموں کی اس منڈی میں اپنے لئے خام مواد لینے آتے ہیں۔ آپ راجندر سنگھ بیدی ہیں۔ اردو کے مشہور افسانہ نگار۔ اور آپ بھی اردو کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ رامانند ساگر اور آپ کے شبھ نام ہیں۔ وشنو پربھاکر اور رام چندر تیواری۔ آپ دونوں ہندی میں لکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ نوتیج ہیں۔ پنجابی میں کہانیاں لکھنے والے۔ اور آپ ہیں مسٹر مسچدیو۔ آپ خود کچھ نہیں لکھتے لیکن آپ کی بیوی اچلا ہندی میں بڑی اچھی اچھی کہانیاں لکھتی ہیں۔ وہ ان دنوں بیمار تھیں۔ اس لئے خام مواد حاصل کرنے کی اس مہم پر وہ خود نہ آ سکیں۔ اور اپنے پتی کو بھیج دیا۔ خوب۔ خوب۔ اور آپ؟ — آپ ادیب نہیں۔ گائیڈ ہیں۔ سرکاری مہمان خانے میں جہاں یہ ادیب لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کی رہنمائی کے لئے ان گائیڈ صاحب کو ان کے ساتھ کر دیا گیا تھا۔ تاکہ انہیں اپنے کام میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ چنانچہ اب یہ گائیڈ صاحب انہیں ایک خوب صورت سی کار میں بٹھا کر یہاں لائے ہیں۔ اور انہیں محلہ استاد کی سیر کروا رہے ہیں۔

"جی۔ یہاں سب مسلمان رہتے ہیں.......... جی ہاں یہ سب پاکستان کا پراپیگنڈا ہے کہ جموں میں اب کوئی مسلمان نہیں رہا اور سب مارے گئے ہیں۔ اگر سب مارے گئے ہوتے تو یہ لوگ بھلا کیسے زندہ رہتے..........

جی۔ یہ درست ہے کہ پاکستان جانے والے کچھ قافلے اتفاق سے راستہ بھول گئے اور ان پر حملہ ہو گیا۔ مگر حکومت اس وقت مجبور تھی...............

جی۔ وہ صرف غنڈہ گردی تھی۔ اور پھر انقلابات میں تو ایسی باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ایسے اتفاقات ہوتے ہی رہتے ہیں.......... جی۔ جی۔ آپ

نے ٹھیک کہا۔ اتفاقات ہیں زمانے کے۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔" اور یوں یہ سیر ہوتی رہتی ہے ۔ اب وہ اپنی اپنی نوٹ بکیں سنبھالے۔ گائیڈ صاحب کی یہ باتیں لکھتے جاتے ہیں۔ اور یوں ادب اور زندگی کا ناطہ جوڑنے والے چند ایک ادبی شاہکاروں کی بنیادیں پڑ جاتی ہیں۔ اور محلہ استاد کے بسنے والوں میں سے ہر ایک یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ لوگ کوئی بہت اہم سرکاری رپورٹ مرتب کرنے آئے ہیں۔ جس میں دخل دینے کا انہیں کوئی حق حاصل نہیں۔ چپ چاپ انہیں دیکھتے رہتے ہیں یا جب یہ لوگ ان کے قریب سے گزریں تو انہیں سلام کر دیتے ہیں۔ اور اُن کے ہزار ہا سخن ہائے گفتنی محض اندیشہ ہائے دور و دراز کی وجہ سے ناگفتہ رہ جاتے ہیں۔ اور ان کے دیدۂ حیران کی طرف کسی کی نظر نہیں جاتی۔

جس مکان میں مَیں ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہ بھی جموں کی اسی کائنات کا ایک جزو ہے۔ جو جموں کی کئی صدیوں کی تاریخ کو اپنے میں لپیٹے ہوئے ہے جموں کے باقی مکانوں کی طرح یہ مکان بھی مجھے ہر وقت ایک کہانی سُناتا رہتا ہے۔ جموں کے ماضی کی کہانی اور اس کے حال کی کہانی۔ رات کو اپنے کمرے میں اکیلے سوئے ہوئے اچانک میری نیند اُکھڑ جاتی

ہے۔ اندھیرے میں مجھے اپنے گرد و پیش کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ البتہ میرا تصور زمانے کے انتھاہ اندھیروں کو چیرتے ہوئے مجھے کسی دور کے زمانے کا ایک منظر دکھاتا ہے۔ جہاں مجھے نوّے برس کا ایک بوڑھا نظر آتا ہے۔ یہ بوڑھا اپنی جوانی میں وکیل تھا۔ اور اب بڑھاپے میں محض ایک مغنی ہے جو دنیا کی بے ثباتی پر روتا نہیں بلکہ اس کے گانے گاتا ہے۔ اور گانوں کے بہانے روتا ہے۔ گاتے ہوئے جب کبھی اسے پنچم سُر کے لئے اپنے پھیپھڑوں کو پھُسلا کے اپنی آواز کو اٹھانا پڑتا ہے۔ تو آواز پھٹ جاتی ہے۔ اور نقاہت کی اس کھینچا تانی میں۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ وہ رونے لگتا ہے اور اُس کا پوتا کیلاش ہنسنے لگتا ہے۔ اُسے اپنے دادا کے یوں گاتے گاتے رو دینے والے اِس تماشے میں بڑا مزا آتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اسے اپنے چھوٹے بھائی اپورب پر غصہ بھی آتا ہے۔ جو اس وقت بدھوؤں کی طرح کبھی اپنے روتے ہوئے دادا کو ٹکر ٹکر دیکھتا ہے اور کبھی اپنے ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے ہوئے بھائی کو۔ اور خاموش رہتا ہے۔ ہنستا بالکل نہیں۔ پھر اسی دوران میں جب کہ بڑھاپا اپنی بے بسی پر رو رہا ہوتا ہے۔ خود زندگی اپنی شکست پر رو رہی ہوتی ہے۔ اور وقت کے تقاضے زندگی کی بے بضاعتی کا یوں مذاق اُڑا رہے ہوتے ہیں۔ ایک ختم ہوتی ہوئی نسل اور ایک آنے والی پود کے اِس باہمی سلوک سے بے خبر اس نوّے برس کے دادا کے ان پوتوں کا والد جج بہاری لال اسی مکان کے ایک اور کمرے میں قانون کی کتابوں سے اٹی ہوئی بڑی بڑی الماریوں کے پاس بیٹھا دیوانِ حافظ پڑھتا رہتا ہے۔ "با مسلمان اللہ اللہ

باہمن رام رام"۔ اور اس کے بعد جموں کی ان راتوں میں سان راتوں کے اتھاہ اندھیروں میں ہی میرا تصور مجھے اس صبح کی بھی ایک جھلک دکھا دیتا ہے۔ جو ان دنوں یہاں ہر روز طلوع ہوتی ہے۔ اب "اس مکان میں نوّے برس کا کوئی دادا ہے۔ نہ دیوانِ حافظ پڑھنے والا کوئی والد۔ البتہ اس دادا کے پوتے اور اس والد کے بیٹے اب جوان ہو چکے ہیں۔ کیلاش اب اسی شہر جموں کا ایک پولیس افسر ہے۔ اور اس وقت اپنی یونیفارم پہنے بیلٹ لگائے اور پستول کو ذرا نمایاں انداز میں اپنے ساتھ لٹکائے کھڑے کھڑے ہی ناشتہ کر رہا ہے۔ اسے صبح صبح ہی کام پر جانا پڑتا ہے۔ اس کی مصروفیتیں جو بڑھ گئی ہیں۔ البتہ اپورب جو ان دنوں کشمیر ہوم گارڈز کی ایک کمپنی کا کمانڈر ہے۔ اور سارے صوبہ جموں کا ایک چکر لگانے کے بعد اب چھٹی لے کر آیا ہوا ہے۔ بڑے مزے سے کرسی پر بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا ہے۔ اور ساتھ ہی ریڈیو سے بھی چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے خبریں ہو رہی ہیں "......... آج مجاہدین نے کشمیر میں نوشہرہ کے قریب جھنب کے محاذ پر ہندوستانی سپاہیوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا.......... ہندوستانی جہاز ابھی تک میرپور اور مظفر آباد کے نہتے باشندوں کے دیہاتوں پر اندھا دھند بمباری کر رہے ہیں........... آج کی ایک اور تازہ اطلاع یہ ہے کہ......" کیلاش کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ "ہٹاؤ بھئی۔ دِلّی لگاؤ۔ یہ لاہور تو ہمیشہ یوں ہی بک بک کیا کرتا ہے۔" اور اپورب فوراً دِلّی لگا دیتا ہے اور پھر کرسی کی پشت کے ساتھ بڑے اطمینان کے ساتھ ٹیک لگا کر اور ٹانگیں پھیلا کے بیٹھ جاتا ہے۔ "آہ غالب پیارے غالب تم کیا کچھ نہیں کہہ گئے تم کیلاش کے لئے بھی تو ایک شعر کہہ گئے ہو اور کیلاش چونکہ

جموں شہر کا سپرنٹنڈنٹ پولیس ہے۔ اور اسے کاروبارِ سرکار سے ہی فرصت نہیں ملتی جو دیوانِ غالب دیکھے۔ اس لئے میں جانتا ہوں۔ کہ بھائی کی حیثیت میں مجھ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ میں اسے تمہارے دیوان میں سے وہ شعر دکھاؤں۔ جو تم اس لئے کہہ گئے تھے کہ ایسے موقع پر اسے سنا دیا جائے۔" پھر وہ بڑے ترنم کے ساتھ جھوم جھوم کے کہتا ہے

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی کم حوصلگی سے
یاں پر کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

اور پھر دوسرے مصرعہ کو دوبارہ ترنم کے ساتھ ہی دہرا کے وہ کہتا ہے کہ "اے بھائی کیلاش پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ کیا تمہیں یہ پریشانی ہو رہی ہے۔ کہ پاکستان کی یہ باتیں پاکستان کا یہ پراپیگنڈا رنگ لے آئیگا اور اس کی یہ فریادیں سات سمندر پار کی سلامتی کونسل سن لے گی ناممکن، ناممکن۔ غالب صاف کہہ گیا ہے۔ "یاں پر کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی۔" اور غالب کی زندگی جھوٹ ہو تو ہو مگر اس کا دیوان سارے کا سارا سچا ہے۔" کیلاش میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اور پھر اپورب سے کہتا ہے "واہ رے میرے شاعر بھائی۔" اور اس کا شاعر بھائی اپنی بیوی سے کہتا ہے "کرشنا۔ دیوان غالب کہاں ہے۔ ذرا لانا تو اسے۔" اور کرشنا جو کنیرڈ کالج لاہور کی گریجوایٹ ہے۔ فوراً اپورب کے کمرے سے دیوانِ غالب اٹھا لاتی ہے۔ اور بڑے پیار سے اپنے خاوند کو دیتے ہوئے بڑے بھولپن سے پوچھتی ہے "جی۔ میں پوچھتی ہوں یہ غالب کیا دیوانہ تھا۔ آپ جب کبھی اس کی کتاب مانگتے ہیں۔ اسے دیوانِ غالب کہتے ہیں۔" اپورب بڑی متانت سے کہتا ہے "نہیں دیوانہ نہیں تھا۔ بلکہ دیوان کدارناتھ کا بھائی تھا۔ اس لئے لوگ اسے بھی دیوانِ غالب ہی کہتے ہیں۔" کیلاش ہنسنے لگتا ہے اور کرشنا چونکہ اتنا سمجھ چکی ہے کہ اس سے اس کے پتی دیو نے کوئی مذاق کیا ہے اس لئے کہتی ہے "واہ آپ مجھ سے مذاق کرنے لگے۔ اب میں اردو فارسی کی باتیں کیا جانوں میرا اختیاری مضمون تو ہندی تھا

اب اپورب دیوان غالب کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے کہتا ہے جب بھی میں کرشنا کو دیکھتا ہوں۔ میرے لئے کشمیر کے اِلحاق کا سوال جیسے حل ہو جاتا ہے۔ اور میرا جی چاہتا ہے کہ کشمیر پاکستان میں شامل ہو۔ پاکستان کی کم از کم ایک خوبی ایسی ہے جو اُسے ہندوستان سے بڑھا دیتی ہے۔ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہو گی۔ لوگ غالب کو پڑھیں گے۔ اور کرشنا کو میں ایک مرتبہ۔ پھر بی۔ اے۔ کراؤں گا۔"

کرشنا کھسیانی بے حد کھسیانی ہو رہی ہے۔ اور کیلاش بھی جیسے اس قسم کی گفتگو کو کوئی بہت زیادہ پسند نہ کر رہا ہو۔ اپنی توجہ دوسری طرف کر دیتا ہے۔ چائے کی پیالی میز پر رکھ کر ٹوسٹ پر مزید مارملیڈ لگانے لگتا ہے۔ یا اپنی بیلٹ کو اپنی کمر پر ٹھیک سے کستا ہے البتہ کیلاش کی بیوی فضا کو پھر سے ہر ایک کے لئے یکساں کرنے کی کوشش میں پہلے سامنے کی دیوار پر لگی ہوئی مرحوم جج بہاری لال کی تصویر دیکھتی ہے۔ اور پھر کہتی ہے "ہمارے اپورب بھیا کی ساری عادتیں پتاجی ملتی ہیں۔ مجھے یاد ہے جب میں یہاں نئی نئی آئی تھی۔ تو وہ اپنی لائبریری میں بیٹھے ہمیشہ اردو فارسی کی کتابیں ہی پڑھتے رہتے تھے۔"

کیلاش کہتا ہے "ہاں۔ ان کی سب سے چہیتی کتاب تھی۔ دیوانِ حافظ"۔ کیلاش کو دیوان حافظ کا کوئی شعر یا اُسے پتا کا کوئی چہیتا شعر یاد ہو یا نہ ہو۔ کم از کم اتنی بات تو یاد تھی۔

لیکن اپورب آج صرف کرشنا کی طرف متوجہ ہے۔ کہتا ہے "بھئی اب ان دیوانوں کی زیادہ باتیں نہ چھیڑو۔ ورنہ یہ تو خیر کرشنا سمجھ ہی لے گی کہ دیوان حافظ بھی دیوان کیدار ناتھ کے خاندان میں سے ہی کوئی ہو گا۔ مگر اسے یہ لفظ "حافظ" خواہ مخواہ کچھ زیادہ ہی پریشان کر دے گا۔ اور وہ یہی سوچتی رہے گی۔ کہ یہ حافظ کہیں اُن مسلمانوں میں سے

کوئی ایک تو نہیں۔ جو قرآن زبانی یاد کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اندھے بھی ہو جاتے ہیں"۔

کرشنا کا منہ غصّے سے۔ شرم سے۔ اپنی بے بسی کے احساس سے اور اپنی اُس ذلت کے احساس سے جو اتنے لوگوں کے سامنے اُس کا پتی دیو کر رہا ہے۔ لال سُرخ ہو جاتا ہے اور وہ جیسے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کسی بہانے باہر نکل جاتی ہے۔

اور اس اندھیری رات میں۔ اپنے کمرے کی تنہائی میں لیٹے ہوئے میں سوچتا ہوں کیا اس مکان کے دوسرے کمروں میں لوگ واقعی سو رہے ہوں گے یا میری طرح اُن کی نیند بھی اکھڑ چکی ہو گی۔ اور میری طرح وہ بھی احساسات اور سوچ بچار کے ہاتھوں میں اس وقت کٹھ پتلی بنے ہونگے۔ کل کیا ہوا؟ آج کیا ہو رہا ہے؟ اور کل کیا ہو گا؟ میں سوچتا ہوں کیلاش جو بچپن میں اپنے دادا کے رونے پر ہنسا کرتا تھا۔ کیا اب بھی لوگوں کے رونے پر ہنسا ہی جاتا ہے؟ اور پچھلے دنوں جب پریڈ گراؤنڈ میں جموں کے مسلمانوں کے ایک انبوہ کو ذبح کرنے کے لئے اکٹھا کیا گیا تھا۔ اور جب مہاراجہ کی پولیس اور فوج انہیں مذبح میں لے جانے کے انتظامات کر رہی تھی تو کیلاش جو اب پولیس کا ایک بہت بڑا افسر ہے۔ ان رونی صورتوں کے درمیان کھڑا کیا کر رہا تھا۔ کیا انہیں لاریوں میں بٹھا کر مذبح پہنچاتے وقت بھی اپنی پرانی عادت سے مجبور ہو کر اُس کے ہونٹوں پر کوئی ہنسی ہی لہرا رہی ہو گی؟ اور اگر وہ اُس وقت واقعی ہنس نہیں رہا تھا تو پھر یہ کارِ سرکار انجام دیتے وقت آخر اس کے جذبات کیا تھے؟ یا وہ بھی اپنے کٹھ

دُوسرے ساتھی سرکاری افسروں کی طرح وہ بھی اپنے سارے جذبات مہاراجہ ہری سنگھ کے محل کے اُس کمرے میں بند کر چکا تھا جہاں سری نگر سے آنے کے فوراً بعد مہاراجہ نے اِن سب کو بلا کر ہاتھ سے جاتے ہوئے راج کو بچانے کے لئے کچھ ہدایات دی تھیں۔ اور مناسب ترین اقدام یہی جانا تھا کہ مسلمان رعایا کو ختم کر دیا جائے۔

اب جنوری کی اِس رات کو میری نگاہوں کے سامنے آج سے دو مہینے اور تیرہ دن پہلے کا ایک منظر اُبھر آتا ہے —— مہاراجہ ہری سنگھ سری نگر سے بھاگم بھاگ یہاں پہنچا ہے۔ پریشان حال۔ آشفتہ رو۔ اور گھبرایا ہوا۔ اور وہ بار بار ایک ہی جملہ دُہرا رہا ہے: "راج ہاتھ سے جا رہا ہے۔ راج ہاتھ سے جا رہا ہے۔" بہت دیر تک تو وہ یہ جملہ اپنے محل کے کمروں کی دیواروں کو سناتا رہتا ہے۔ پھر جموں کے گورنر چیت رام کو بلاتا ہے۔ ریاستی فوج کے بریگیڈیئر راوت کو بلاتا ہے۔ کرنل دھیرک رام کو بلاتا ہے۔ بھدرواہ کے علاقے کے خونخوار ذیلدار دھنتر سنگھ کو بلاتا ہے اور پھر ان کو بھی یہی جملہ سناتا ہے۔ دوستو۔ راج ہاتھ سے جا رہا ہے۔ راج ہاتھ سے جا رہا ہے۔ بچا سکتے ہو۔ تو بچاؤ۔"

اور پھر منظر بدلتا ہے —— اب راج کو ہاتھ سے بچانے کا پروگرام شروع ہے چیت رام سنگھیوں میں بندوقیں تقسیم کر رہا ہے۔ سنگی اپنے سیاسی گُرو پریم ناتھ ڈوگرہ سے آشیرواد دے رہے ہیں۔ بریگیڈیئر راوت اپنی فوج کے سپاہیوں میں پھر رہا ہے اور پھر جلد ہی کسی پراسرار انداز میں سارے ہندو سپاہی۔ اکا دُکا ہو کر اپنے ہتھیاروں سمیت مختلف علاقوں میں نکل جاتے ہیں۔ اور بریگیڈیئر راوت اپنے دفتر میں بیٹھا کاغذات پر لکھتا ہے کہ "اُن سپاہیوں کا خیال تھا کہ ان کے گھروں کو مسلمان

ان کو عدم موجودگی میں تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ اس لئے وہ بھیں Desert کر گئے ہیں"۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ مسکرا بھی رہا ہے۔ آج کرنل دھیرک رام اودھم پور میں ہے۔ اب وہ رام نگر جا رہا ہے۔ کل وہ پھر اودھم پور آئے گا۔ اس کے ساتھ کچھ سنگی ہیں۔ اور ایک جیپ ہے۔ اور جیپ اسے اڑائے اڑائے پھرتی ہے۔ دھنتر سنگھ کے پاس پرجا سبھا کا سرکاری پیڈ ہے جس پر وہ اپنے علاقے کے مسلمان نمبرداروں کو حکمنامے لکھ رہا ہے: "بحکم مہاراجہ بہادر ریاست جموں و کشمیر تحریر کیا جاتا ہے کہ تم اپنے علاقے کے سارے مسلمانوں کو ایک جگہ جمع کرو۔ سرکار نے انہیں پاکستان بھیجنے کا پورا انتظام کر دیا ہے بصورت عدم کارروائی......" اور مسلمان مختلف جگہوں میں جمع ہو رہے ہیں۔ اور پھر ڈزا ڈز ہوتی ہے۔ ان کے جسم کو ریاستی گدھوں اور ریاستی دریاؤں کی مچھلیوں کی خوراک بننے کے لئے رہ جاتے ہیں۔ اور اُن کی روحیں کسی آسمانی پاکستان کی طرف پرواز کر جاتی ہیں اور یوں ہاتھ سے جاتا ہوا راج ہاتھ میں لایا جا رہا ہے۔

اب مجھے اُن مسلمانوں کا خیال آتا ہے جنہیں ریاستی فوج اور ریاستی پولیس بنفسِ نفیس پاکستان پہنچانے کے انتظامات کر رہی ہے۔ وہ پریڈ گراؤنڈ میں کھڑے ہیں۔ اور انتظامات کرنے والوں میں کیلاش بھی مجھے کھڑا دکھائی دے رہا ہے۔ کیا کیلاش واقعی ان کے انجام سے واقف نہیں اور کیا کیلاش کو واقعی ان بے موت مرنے والوں پر کوئی ترس نہیں آ رہا؟

اور اب اپنے بستر پر بے چینی میں کروٹیں لیتے ہوئے میں سوچتا ہوں۔ کہ اس مکان میں یہاں کے ایک کمرے میں مَیں ہوں اور دوسرے کمروں میں کیلاش ہے۔ پُورن ہے۔ اور اُن کی بیویاں ہیں کیا یہ جان لیوا گھڑیاں۔ میرے ہی حصے میں آئی ہیں۔ اور کیا

الپورب جو آج سے کچھ ہی سال پہلے کیلاش کو اپنے دادا کے رونے پر ہنستے دیکھکر خود کبھی نہ ہنس سکتا تھا۔ اور ان دونوں کو دیکھتے ہوئے۔ دونوں کو شاید سمجھنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ اب کیلاش کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ اور کیا اب کیلاش کو دیکھ کر اُسے کسی بات کا خیال نہیں آتا۔ وہ کچھ نہیں سوچتا۔ اور کیا وہ قیامت جو جموں پر گذر گئی۔ کیلاش کی بیوی اور الپورب کی بیوی کو کبھی نہیں رلاتی۔ اور وہ کبھی کچھ نہیں سوچتیں؟

پر میں جانتا ہوں الپورب اور کیلاش کی بیویاں کچھ نہیں سوچتیں۔ کیونکہ ہندوستان میں بیویاں سوچا نہیں کرتیں۔ یہ کام ان کی پتی کیا کرتے ہیں۔ بلکہ اچلا کے پتی سسچدیو کی طرح اگر اس طرح کا کام کوئی انہیں کرنا بھی پڑے۔ تو بھی اپنے پتی کا سہارا لئے بغیر آگے نہیں بڑھتیں۔ یہ کام ہمیشہ ان کے پتی کرتے ہیں۔ یہاں بیویوں کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے پتی کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ اور اس کے ہر کام کو سراہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج کل کیلاش کی بیوی اپنا اولین فرض یہ سمجھتی ہے۔ کہ وہ شیخ عبداللہ کے اُن کارندوں کو۔ جو وقت کی کسی مصلحت کی وجہ سے۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت میں دخل درمعقولات کرنے لگے ہیں قطعی طور پر کوئی اہمیت نہ دے۔ اور شیخ عبداللہ کی حکومت کو۔ جسے شیخ عبداللہ عوام کی حکومت کہتا ہے۔ وہ واتلوں کی حکومت کہے۔ اور جہاں وہ اپنے اس خیال کا اظہار سنجیدہ طور پر نہ کر سکے۔ وہاں اسے ایک مذاق کے طور پر کہے اور اگر سننے والے واتل کا مطلب نہ سمجھ سکیں۔ تو انہیں یہ بھی بتا دے۔ کہ کشمیری زبان میں واتل بھنگی کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ سری نگر کے کشمیری گندے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے یہ لفظ بیحد موزوں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کیلاش کی بیوی کا یہ بھی فرض ہے۔ کہ وہ موقع بے موقع ہمیشہ ریاست کی فوج اور پولیس کی بے حد تعریف کرتی رہے۔ اور چونکہ ان کی کمان ابھی

تک براہ راست مہاراجہ ہری سنگھ کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے یہ بھی بتاتی رہے کہ اب اصلی حکومت تو ان ہی دو محکموں کے پاس ہے۔ اور باقی سب کے سب محکمے تو بس یونہی ہیں۔ دکھاوے کے لئے۔ اور شیخ عبداللہ کا منہ بند کرنے کے لئے۔ اور پھر شیخ عبداللہ کی یہ حکومت اور یہ امن امن کی رٹ ـــــ شیخ عبداللہ کی حکومت اور اس حکومت کے اختیارات کے بارے میں وہ واضح طور پر کچھ نہیں کہتی لیکن اپنے نامکمل جملوں مبہم اشاروں۔ اور طنزیہ مسکراہٹوں سے محفل میں جو تاثر وہ قائم کرتی ہے۔ اور اپنے ان زریں سیاسی خیالات کا اظہار کرتے وقت جس انداز میں کہ وہ شیخ عبداللہ کے چہیتے ہوم گارڈز کے ایک کمانڈر کی بیوی کرشنا کی طرف دیکھتی ہے اس سے بے چاری کرشنا کو اپنے فرائض کے سنبھالنے کا احساس بوکھلا دیتا ہے۔ اور وہ اپنی بی۔ اے پاس ذہانت کو پورے طور پر مجتمع کر کے باتوں باتوں میں یہ ثابت کرنا شروع کر دیتی ہے۔ کہ اگر کوئی شیر کشمیر ہے۔ تو شیخ عبداللہ ہیں۔ اور اگر کوئی قائد اعظم ہے۔ تو شیخ عبداللہ ہیں۔ اور ریاست میں اگر کوئی صحیح طاقت ہے۔ تو وہ صرف کشمیری ہوم گارڈز ہیں۔ اور کیا ہوا اگر جموں کے لوگوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ اور وہ جناح کے پروپیگنڈے میں آ کے ان کو صرف اس لئے واتل کہنے لگے ہیں۔ کہ وہ مسلمان ہیں"۔ اونہہ۔ یہ دو قوموں کی بھتوری تھیوری ــــ اور یوں ان دو پتنیوں کی دھرم پتنیوں کے فرائض ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتے ہیں اور پتی ورتا کے آدرش کا پالن ہونے لگتا ہے۔

اور چونکہ میں یہ سب کچھ جانتا ہوں۔ اس لئے جموں کی اس اندھیری رات میں جونہی مجھے ان کا خیال آتا ہے میں اس خیال سے کترا جاتا ہوں۔ اور اگر سوچتا ہوں۔ تو صرف کیلاش کے متعلق اور الپورب کے متعلق۔ کیا اس وقت وہ دونوں واقعی چین کی نیند

سو رہے ہوں گے؟ اور کیا اس جنون میں۔ انسانیت کے اس قبرستان میں رہتے ہوئے بھی تصور کا کوئی ایسا جھونکا نہیں۔ جو اُن کے قریب جا سکے۔ ان کی نیندیں اُن پر حرام کر سکے؟

میں بس یونہی سوچا کرتا ہوں۔ کیا میرا بھی وہی انجام تو نہیں ہونے والا جو پنت کی شاعری کا ہوا؟

اور اب مجھے پنت کی شاعری کا خیال آتا ہے۔ اور میں سوچنے لگتا ہوں۔ کہ شاید پنت کی شاعری ترقی پسند نہ تھی۔ جو یوں آسانی سے مرگئی۔ میرے ذہن میں یہ سوال بھی گونجتا ہے کہ کیا ترقی پسند شاعری اور ترقی پسند ادب واقعی سمجھے بغیر ہی ظہور میں آجاتے ہیں۔ ورنہ ان کا انجام بھی پنت کی شاعری کا سا کیوں نہیں ہوتا؟ ——— اور اب اپنے خیالات کے اس بے تکے پن سے پیچھا چھڑانے اور اپنے محبوب ترقی پسند فنکاروں کی عقیدت کو اپنے دل میں برقرار رکھنے کی سعی کرتے ہوئے میں اپنا دھیان کسی اور طرف لے جاتا ہوں۔ اب خیالات کے اس سلسلہ میں مجھے اپنی قریب ترین اِس محلہ استاد ہی دکھائی دیتی ہے۔

میرا تصور مجھے محلہ استاد میں لے جاتا ہے۔ اور چونکہ مجھ پر کوئی پہرہ نہیں۔ اور میرے ساتھ کوئی گائیڈ بھی نہیں اس لئے میں جہاں جی چاہے جا سکتا ہوں جس سے جی چاہے مل سکتا ہوں۔

سب سے پہلے میں ایک شناسا بڑھیا سے ملتا ہوں۔ جو کسی زمانے میں ریزیڈنسی روڈ پر رہا کرتی تھی۔ اور جو اب اپنا بہت سا سامان اپنے گھر میں بند کر کے' اُسے قفل لگا کے' اور چابیاں اپنے ازار بند کے ساتھ باندھ کے پہلے قافلے کے ساتھ پاکستان جا رہی تھی۔ کہ راستے میں حملہ ہوا۔ اس کے جوان بیٹے اور بیٹیاں اس کی آنکھوں کے سامنے مارے گئے۔ اور پھر بڑی مشکلوں کے بعد نجانے کہاں کہاں کے دھکے کھا کے وہ اس محلہ استاد میں پہنچی۔ اور اب سوائے گھر کی چابیوں کے اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ اور ان چابیوں کو وہ اس لئے استعمال نہیں کر سکتی۔ کہ حاکم لوگ اسے ریزیڈنسی روڈ کی طرف جانے نہیں دیتے کہتے ہیں۔ کہ وہ مسلمانی ہے۔ اور اگر اُسے کسی نے مار دیا۔ تو کون ذمہ دار ہوگا۔ اور اس لئے........ "بیٹا یہ لو کنجیوں کا گچھا۔ اور جس طرح بھی ہو۔ میرا مکان کھول کے اس میں سے مجھے ایک رضائی لا دو۔ کوئی پرانی سی ہو۔ میں اب بڑھاپے میں نئی رضائیوں کو اوڑھ کر کیا کروں گی۔ کوئی شوق تو ہے نہیں........ بس بوڑھی ہڈیوں کو ذرا سردی سے بچانا ہے۔ اور پھر بیٹے بیٹیاں مر گئے تو کیا ہُوا پوتے پوتیاں تو اب بھی سیالکوٹ میں زندہ ہیں۔ نئی رضائیاں وہیں سنبھالی رہیں ان کے کام آجائیں گی..." ——— میں اسے بتاتا ہوں۔ کہ "اماں۔ وہ رضائیاں اب خواب ہوئیں۔ کیونکہ میں خود اپنی آنکھوں سے تمہارے اُجڑے ہوئے مکان کو دیکھ چکا ہوں۔ اب لکے اندر کچھ بھی نہیں۔ اور اب یہ کنجیاں بھی بے کار ہیں۔ کیونکہ وہاں تالوں کا نام نشان تک نہیں۔ اور بڑے دروازے پر کسی نے چاک سے صاف الفاظ میں لکھ رکھا ہے۔ کہ چار دفعہ لوٹا گیا اب تکلیف نہ کریں"... مگر وہ جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو ہندوؤں کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا۔ نہ جانے استدلال کے کون سے اعجاز کے طفیل اب تک یہ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ کہ اس کا مکان ہندوؤں نے لوٹ لیا ہے...... "بیٹا سب یہی کہتے ہیں۔ پر میں کیسے مانوں۔ محلے کے سارے ہندوؤں سے میرے اتنے اچھے تعلقات تھے۔ ہم لوگ بہن بھائی بنے ہوئے تھے۔ مجھے تو کبھی اعتبار نہ آئے"۔

آفرین ہے لاعلمی کی اس نعمت پر اور خود فریبی کے اس انداز پر!

محلہ استاد میں ایک اور موڑ پر مجھے صوبیدار میجر ایوب نظر آتا ہے۔ اس کی نگاہیں ایک دو منزلہ مکان پر ہیں۔ اور وہ اس کے دروازوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا ہے۔ کہ محلہ دلپتیاں میں اس کا مکان بھی دو منزلہ تھا اور دوسری منزل کے کمروں کے لئے پلنگ اس نے کمروں کے اندر ہی بنوائے تھے۔ اور وہ اتنے بڑے تھے۔ کہ کسی صورت باہر نہ نکالے جا سکتے تھے۔ پھر جب اس کا مکان لوٹا گیا ہوگا۔ تو لٹیروں نے ان پلنگوں کو وہاں سے کیسے نکالا ہوگا۔ مجھے دیکھ کر وہ اپنی ساری کہانی سُناتا ہے اپنے استعجاب کا اظہار کرتا ہے اور پھر خود ہی کہتا ہے۔ کہ ایک ہی صورت ہو سکتی تھی۔ کہ وہ توڑ کے انہیں باہر لے گئے ہوں۔ پر اس طرح تو پلنگ بیکار ہو گئے ہونگے کیوں جی۔ کیا اتنے خوبصورت پلنگوں کو توڑتے ہوئے انہیں بالکل افسوس نہ ہوا ہوگا۔ اتنے بے دل وہ کیسے ہو سکتے تھے۔ پھر آپ کا کیا خیال ہے وہ انہیں کیسے لے گئے ہوں گے"۔۔۔۔۔۔ اور اس سارے محلہ اُستاد میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اسے یقین دلا سکے کہ وہ لوگ جنہوں نے پھول سے خوبصورت بچوں اور پھول ہی سی نازک عورتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور اُن کے دل نہ لرزے۔ ان کے نزدیک ان پلنگوں کی حیثیت ہی کیا تھی۔ پھر اب اُن کی بے دلی پر غور کرنے سے فائدہ؟ مگر نہ جانے وہ کونسی نفسیات کی گتھی ہے جو صوبیدار میجر ایوب کو اب بھی اپنے پلنگوں کی اہمیت کے پیش نظر اس مسئلہ کی بھول بھلیوں میں پھرا رہی ہے۔ اور وہ اب بھی سارا سارا دن محلہ استاد میں گھومتے ہوئے ہر دو منزلہ مکان کو دیکھتا رہتا ہے۔ اور سوچتا رہتا ہے اور ہر نو وارد سے اس مسئلہ کی وضاحت چاہتا ہے۔

جموں کی اس اندھیری رات میں اب میری ملاقات اپنے ایک پرانے دوست پروفیسر عزیز سے بھی ہوتی ہے۔ جو محلہ استاد کے ایک مکان کے بوسیدہ چھجے کے نیچے ڈرا سہما کھڑا دبی زبان میں مجھے اپنی کہانی سناتا ہے۔۔۔۔۔ "جب ہم پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ میں اپنی لاری سے نکل کر قریب ہی سرکنڈوں میں جا چھپا۔ میرے ہاتھوں میں میری تین سال کی بچی تھی۔ دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے بائیں ہاتھ پر جس سے میں نے بچی کو تھام رکھا تھا بجلی گری ہے۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد ان سرکنڈوں میں ہی کھسکتے کھسکتے کہیں سے میری بیوی بھی میرے پاس آ گئی۔ اور اس نے مجھے بتایا کہ میرے ہاتھ میں گولی لگ چکی ہے۔ اور میں بچی کی بجائے بچی کی لاش تھامے ہوئے ہوں جس میں سے انتڑیاں لڑھکتی ہوئی باہر آ رہی ہیں۔ میری بچی مر گئی۔ اور مجھے بچا گئی پر اس کے بعد بھی میں مر مر کے ہی بچا۔ میں اور میری بیوی کتنے ہی دن ایک میدان میں اپنے کئی دوسرے بچے کھچے ساتھیوں سمیت پڑے رہے۔ جہاں ہم سب تھوہر کے پتے سکھا کر ابال ابال کر انہیں پیتے رہے۔۔۔۔۔۔ اور اب میں ڈرا سہما محلہ استاد میں بیٹھا ہوں۔ اور سوچتا ہوں۔ کہ جس طرح بھی ہو سکے۔ کہیں اور چلا جاؤں۔ میری بیوی بھی کہتی ہے کہ اب اس دھوکے باز شہر کا پانی پیتے ہوئے اس کی کڑواہٹ اس سے کسی طرح برداشت نہیں ہوتی۔۔۔۔۔۔۔"

پروفیسر عزیز کی آواز مدھم ہو جاتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ اس کا چہرہ بھی میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور اب محلہ استاد ہی کے کسی اور کونے میں مجھے کوئی شخص جموں کالج کے ہر دلعزیز اور مقبول ترین پروفیسر رشید کا انجام سُنا رہا ہے۔۔۔۔۔۔ پروفیسر رشید پہلے قافلے میں تھے۔ اور انہیں اس وقت ٹائیفائیڈ تھا جب کسی نامعلوم

سے راستے کے چکر کاٹنے کے بعد لاریاں رکیں۔ اور مسافروں کا قتل عام شروع ہوا تو انہوں نے دیکھا۔ کہ ان پر ان ہی کے ایک راجپوت طالب علم کی تلوار لہرا رہی ہے تو انہوں نے اس سے کہا۔ کہ وہ بیمار ہیں۔ اور راجپوتوں کے متعلق تو مشہور ہے۔ کہ وہ بیماروں پر ہاتھ نہیں اٹھایا کرتے۔ اس پر اس نے فوراً اپنی تلوار اپنے ایک ساتھی کے حوالے کر دی۔ اور ہنستے ہوئے کہا۔ "پروفیسر صاحب۔ آپ مطمئن رہیئے۔ میرا یہ دوست راجپوت نہیں ہے۔" اور پھر اس کے دوست نے ہنستے ہوئے تلوار چلا دی اور یوں پروفیسر رشید اللہ کو پیارے ہوئے۔۔۔۔۔۔"

اور اب مجھ میں مزید سکت نہیں رہی۔ کہ اپنے تصور کے سہارے محلہ استاد کی مزید سیر کروں۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ اب دُور کہیں سے مجھے جموں کے پروفیسر شرما اور پروفیسر بی ڈی مل کی آواز آتی ہے۔ اپنے پرانے استاد اور اپنے پرانے ساتھی پروفیسر رشید کے بارے میں وہ کہہ رہے ہیں۔ کہ بھئی۔ وہ یقیناً پاکستان پہنچ گئے ہوں گے ہم نے یہاں سے تو لاری میں انہیں بڑی اچھی جگہ دلوا دی تھی۔ سنا تھا کہ راستے میں قافلے کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہوئی تھی۔ پر خیال ہے۔ کہ وہ یقیناً پاکستان پہنچ گئے ہوں گے۔ ان دنوں ذرا بیمار سے تھے۔ اب تک تو یقیناً تندرست ہو چکے ہوں گے۔۔۔۔۔"

آہ پروفیسر شرما! آہ پروفیسر بی ڈی مل!! اور آہ انسان تیری دیدہ دلیری!!! اور اب غم ہے۔ بے انتہا غم! اور کمرے کا اندھیرا میرے دل کا اندھیرا بن رہا ہے! اور میرا تخیل ٹھوکریں کھانے لگا ہے۔ وہ اب کہاں جائے۔ کہاں جائے؟ اور اسے جانا ضرور ہے کیونکہ اس کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں نہیں۔ نہ جانے اس وقت باہر کیا ہو رہا ہو گا؟ باہر سڑک پر سے کوئی فوجی ٹرک کھڑکھڑاتا ہوا گذر رہا ہے۔ اور رات جس کا

غرور اس کی خاموشی ہوتی ہے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ختم ہو رہی ہے۔ اور میرا تصور جو آج میرے پیچھے بری طرح پڑا ہوا ہے۔ مجھے جموں کے ایک خاندانی حکیم لالہ گوراندتہ مل سے جا ملاتا ہے۔ لالہ جی اس وقت آج کی تازہ خبروں پر تبصرہ کر رہے ہیں ــــ "قبائلی دن بڑھتے آ رہے ہیں۔ اور یہ سب محلہ استاد میں رہنے والے مسلمانوں کی بدذاتی ہے یہ سب جاسوسی کرتے ہیں اور اسی لئے میں کہتا ہوں۔ کہ اب حکومت اگر ان کو یہاں رکھنا ہی چاہتی ہے۔ تو ہندوؤں کو یہاں سے جانے دے۔ کم از کم صاحب جائیداد ہندوؤں کو تو اجازت دے دے۔ کہ وہ اپنی جائیداد لے کر ہندوستان کے کسی محفوظ کونے میں جا سر چھپائیں۔ اور اگر حکومت اتنی ہی گئی گذری ہے۔ تو ہم اپنا انتظام خود کر لیں گے ہم اپنا انتظام خود کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔"

لالہ جی اپنا انتظام خود کر رہے ہیں۔ اور میں اپنے بستر میں لیٹا سوچ رہا ہوں۔ کہ شاید اس وقت تک وہ اپنا انتظام خود کر چکے ہیں۔ اور یہ ٹرک جو یہاں سے کھڑکھڑاتا ہوا گذر رہا تھا۔ اس میں وہی بیٹھے تھے۔ اپنے ان نوٹوں کی ساری گڈیوں سمیت جو انہوں نے گوراپنساری سے لیکر خاندانی حکیم لالہ گوراندتہ مل بننے تک کی ساری منزلیں طے کرتے ہوئے اکٹھی کی تھیں! اور میں یہ بھی سوچتا ہوں۔ کہ ان گڈیوں میں سے کم از کم ایک گڈی تو ضرور ہی اس وقت اس ٹرک کے ڈرائیور کی جیب میں ہو گی اور اس میں اس ڈرائیور کے علاوہ اور بھی کئی حصہ دار ہوں گے۔ وہ جو آج کے جموں کے مائی باپ ہیں۔ جو ٹرکوں کا رات کے اندھیرے کا یہ کاروبار آسان کرنے کے لئے کرفیو لگا دیتے ہیں۔ جو اس کرفیو کی نگرانی کرتے ہیں۔ اور جو ان ٹرکوں کے ڈرائیوروں کے افسرانِ اعلیٰ ہیں۔ اور جن میں سب سے اعلیٰ افسر ہے میجر خزان سنگھ۔

میرا تخیل مجھے اڑا کر توی کے پار ستواری چھاؤنی کے ایک خیمے میں لے جاتا ہے۔ جہاں اس وقت میجر خزان سنگھ شراب کے نشے میں دُھت پڑا سو رہا ہے اب میں اپورب اور کیلاش کے مکان سے دور میجر خزان سنگھ کے پاس چلا جاتا ہوں

میجر خزان سنگھ سے میری پہلی ملاقات ستواری چھاؤنی میں ہوئی تھی۔ وہ کیلاش کا پرانا دوست ہے اور کیلاش نے ہی میرا اور اپورب کا اس سے تعارف کروایا تھا۔ دو تین دن پہلے کی ایک شام کو جب ہم اس کے خیمے میں داخل ہونے لگے۔ تو کیلاش نے ہمیں روک دیا۔ "بھئی ہم ہندوستانی فوج کے ایک افسر سے ملنے جا رہے ہیں۔ جو تمہاری ہوم گارڈز کو زنانہ پولیس کہہ کر ہنسا کرتا ہے اس لئے بہتر ہوتا۔ اگر تم اس وقت اپنی یہ یونیفارم اتار آتے۔ بہرحال اب کم از کم اپنی یہ مضحکہ خیز ٹوپیاں اتار کے جیب میں ضرور ڈال لو۔" لیکن پھر یہ دیکھ کر کہ ہم لوگوں کو اس کا یہ مشورہ پسند نہیں آیا۔ وہ مسکرانے لگا: "اچھا اچھا رہنے دو۔ دیکھا جائے گا" اور وہ ہمیں اندر لے گیا۔

میجر خزان سنگھ اس وقت اکیلا بیٹھا تھا۔ اور پی رہا تھا: "آخاہ۔ بڑے وقت پر آئے۔ آج جی چاہتا تھا۔ تمہارے اس کشمیر میں ذرا بیئر کو ہی آزمایا جائے۔ یہ ساتویں بوتل ہے۔ پیٹ پھٹنے لگا ہے۔ اور ان بوتلوں میں شاید الکحل تھا ہی نہیں"۔۔۔۔۔ یہی چکھو گے یا تمہارے لئے کچھ اور نکالوں۔ میرے پاس رم بھی ہے۔ اور وسکی بھی"۔

کیلاش نے انکار کر دیا: "شکریہ لیکن اس وقت موڈ نہیں۔ اور پھر میرے ساتھ میرا چھوٹا بھائی ہے"۔ کیلاش مسکرانے لگا۔ میجر خزان سنگھ نے ہمیں گھور کر دیکھا اور کیلاش نے ہمارا تعارف کروایا: "اپورب میرا چھوٹا بھائی۔ اور اپورب کے دوست" کیلاش نے میرا نام نہیں بتایا۔ شاید وقت کی مصلحت یہی تھی۔

میجر خزان سنگھ نے اب ہم دونوں سے باری باری ہاتھ ملایا۔ اور پھر کیلاش سے کہنے لگا: "تمہارا چھوٹا بھائی تو اچھا خاصا بڑا بھائی نظر آتا ہے۔ اور ان کے دوست بھی بظاہر کسی کے چھوٹے بھائی معلوم نہیں ہوتے۔ اس لئے بولو۔ رم یا وہسکی"۔

اور اس نے اپنی چارپائی کے نیچے پڑی ہوئی پیٹی میں سے دو بوتلیں ایک ایک ہاتھ میں تھام لیں: "بولو رم یا وہسکی؟"

وہ کاگ کھولنے ہی کو تھا۔ کہ کیلاش بولا "ارے رے۔ یہ غضب نہ کرنا۔ ذرا دیکھو تو۔ یہ دونوں کشمیر زنانہ پولیس کے افسر ہیں"۔

اس پر ایک قہقہہ اڑا۔ میجر خزان سنگھ کی نگاہیں ہمارے کندھوں پر جم گئیں۔ اور وہ بڑے انداز سے ہمارے پیپس کے ساتھ لکھے ہوئے حروف ذرا دبا دبا کے پڑھنے لگا: "کے۔ ایچ۔ جی۔ یعنی کشمیر ہوم گارڈز۔ خوب"۔

ہم بالکل کھسیانے نہ ہوئے لیکن میجر خزان بھی کھسیانہ نہ ہوا۔ بلکہ یہ کہہ کر کہ آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ بڑی بے تکلفی کے ساتھ ہم سے باتیں کرنے لگا۔ دنیا جہان کی باتیں۔ سب سے پہلے اس نے فوج کی سیاسیات پر روشنی ڈالی۔ اس ضمن میں ہندوستانی فوج کا مسلمان بریگیڈیر عثمان خاص طور پر زیر بحث آیا: "مانا کہ کشمیر کی اس لڑائی میں ہمارے ساتھ ایک مسلمان افسر کا نام پبلسٹی کے نکتہ نظر سے بہت اہم ہے اور خاص طور پر اب جب کہ یو۔ این۔ او میں یہ مسئلہ پیش ہو رہا ہے۔ یہ نام ہمارے لئے اور بھی مفید ثابت ہوگا۔ لیکن ہمیں پھر بھی یہ نہ بھولنا چاہیئے۔ کہ ہم اس وقت میدان جنگ میں ہیں۔ اور یہ لڑائی مسلمانوں کے ساتھ ہے"۔ میجر خزان سنگھ باتیں کرتے کرتے رک گیا۔ اور غالباً اپنے آپ کو اس نے ایک مرتبہ پھر یہ یقین دلا کر کہ ہم میں سے مسلمان کوئی نہیں

اُس نے پھر سے اپنی بات شروع کی۔ اور اس سلسلے میں ریاست کی باقاعدہ فوج میں جو مسلمان دستے تھے۔ ان کا حوالہ دیتے ہوئے، اور یہ بتاتے ہوئے کہ جب انہیں محاذ پر لڑنے کے لئے بھیجا گیا تھا تو وہ فوراً دشمن کے ساتھ جا ملے تھے۔ اُس نے بڑے پُرزور لہجے میں کہا۔ کہ "ایسی صورت میں آزمائے ہوئے مسلمان کو دوبارہ آزمانا کوئی دانشمندی نہیں"۔

بریگیڈیئر عثمان پر ناک بھوں چڑھانے اور اس بارے میں ستواری چھاؤنی کے دوسرے بہت سے فوجی افسروں کے ایسے ہی تاثرات بیان کرنے کے بعد اُس نے آہستہ آہستہ باتوں کا رُخ موڑ دیا۔ اور سیاسیات کے بعد اب اقتصادیات کی باری آگئی میجر خزان سنگھ کو کشمیر کی اقتصادی حالت جاننے کا بہت شوق تھا۔ اور وہ اُس انار دانہ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا بہت مشتاق تھا۔ جو آج کل جموں سے سری نگر جانے والی سڑک کے کنارے اُگے ہوئے انار کے درختوں پر ہی گل سڑ رہا ہے کیونکہ ٹھیکہ داروں کو انہیں وہاں سے کسی دوسری جگہ پہنچانے کے لئے لاریاں نہیں مل رہیں۔ میجر خزان سنگھ کو اس امر کا شدت سے احساس تھا کہ اس کے اُوڑی محاذ سے آنے والے ٹرک جو اسی راہ آتے ہیں۔ واپسی پر اکثر خالی ہوتے ہیں۔ "اگر ان میں یہ انار دانہ بھر کے لایا جائے۔ اگر ان میں یہ انار دانہ بھر کے لایا جائے تو ——" اور وہ کسی گہرے خیال میں جا پڑا۔ پھر اسی دوران میں رام بن کے اس گھی کا ذکر بھی آیا۔ جو وہاں کے ایمرجنسی آفیسر کے حکم سے کہیں باہر نہیں لے جایا جا سکتا۔ لیکن جس کے کنستر بیوپاری لوگ میجر خزان سنگھ کے طفیل فوجی ٹرکوں میں رکھ کے جموں لے آتے ہیں۔ اور پھر جموں سے کٹھوعہ تک لے جاتے ہیں۔ اور اس طرح کسٹم کی بھی بچت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ کسٹم والے

بھلا کون ہوتے ہیں۔ جو اپنی چوکیوں پر فوجی ٹرکوں کو روکنے کی جرأت کر سکیں —— کیا اسی طرح انار دانہ کی تجارت کو بھی آسان نہیں کیا جا سکتا؟" میجر خزان سنگھ کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ اُسے فوج کے ساتھ تجارت سے بھی کافی لگاؤ معلوم ہوتا تھا۔

جب ہم ستواری چھاؤنی سے واپس ہو رہے تھے۔ تو راستہ میں میجر خزان سنگھ کی کیلاش نے بے حد تعریف کی۔ اور کہا کہ میجر خزان سنگھ دوستوں کا دوست ہے اور بڑا ہمدرد آدمی ہے۔ توی کا پُل پار کرتے وقت جب ہم جو کی پر اپنا کرفیو پاس دکھا رہے تھے۔ ایک ملٹری ٹرک مخالف سمت سے آیا۔ اور بغیر رُکے تیزی سے ہمارے پاس سے گذر گیا جب ہم دوبارہ روانہ ہوئے۔ تو کیلاش نے میجر خزان سنگھ کی دوستوں کا دوست ہونے اور ہمدرد آدمی ہونے والی خصوصیت پر مزید روشنی ڈالی اور کہا۔ کہ ابھی ابھی جو ٹرک گذرا تھا۔ اس پر رائے بہادر ٹھاکر داس کے گھر والے پٹھان کوٹ جا رہے تھے۔ اور یہ سب میجر خزان سنگھ کی بدولت ہے"۔

اب اپنے بستر پر لیٹے لیٹے مجھے یہ ساری باتیں یاد آ رہی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ حکومت کے وہ اعلان بھی یاد آ رہے ہیں جن میں کہا جاتا ہے۔ کہ جموں میں جتنے باشندے ہیں۔ اس سے دوگنے فوجی صرف جموں کی حفاظت کے لئے ہندوستان سے منگوائے جا چکے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص حملہ آوروں کے ڈر سے جموں چھوڑتا ہوا پکڑا گیا۔ تو اسے غداری کی سزا دی جائے گی۔ اور اس کا یہ مطلب لیا جائے گا۔ کہ اسے فوج اور فوج کی طاقت پر اعتماد نہیں۔

میں سوچتا ہوں۔ جو کچھ حکومت کہتی ہے۔ شاید اسے وہی کہنا چاہیئے۔ اور جو کچھ میجر خزان سنگھ کرتا ہے۔ اُسے بھی شاید وہی کرنا چاہیئے۔ کیونکہ حکومتوں کا فرض ہے۔ کہ

وہ بلند بانگ دعوے کرتی رہیں۔ اور میجر خزان سنگھ جیسے حقیقت پسند لوگوں کا وجود بھی نہایت ضروری ہے۔ تاکہ کھوکھلی باتوں کا بھرم کھلتا رہے حقیقتوں کا اقرار ہوتا رہے۔ اور اگر اس بہانے بھاگنے والے سیٹھوں کی تجوریوں میں سے نکل کر میجر خزان سنگھ کی جیبوں میں پڑنے والی دولت میجر خزان سنگھ کو میجر خزانہ سنگھ بنانے لگے۔ تو یہ اس کے نصیب ہیں۔ اور مجھ ایسے اگر ان باتوں سے جلتے ہیں۔ اور اپنی نیندیں خراب کرتے ہیں۔ تو یہ ہماری نادانی ہے۔

اب کمرے کا اندھیرا جیسے میرے ذہن پر بھی پردہ ڈالنے لگتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ تخیل کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ بہت ہی آہستہ آہستہ وہ نیند جو میری آنکھوں سے بھاگ گئی تھی۔ پھر سے پلکوں کو آ ٹٹولتی ہے۔ چپکے سے آنکھوں میں آ بیٹھتی ہے۔ اور میں سچ مچ سو جاتا ہوں۔ اور پھر جب کافی دیر گذرنے پر بھی صبح نہیں ہوتی اور جب وہ وقت آتا ہے۔ جسے شاید صبح کاذب کہتے ہیں۔ تو میں اپنے کمرے میں الپورب کی آواز سنتا ہوں۔ ایک لمبا سانس لیتے ہوئے وہ کہہ رہا ہے "آہ۔۔۔۔۔ نہ چھوٹے مجھ سے حجروں میں بھی آدابِ سحر خیزی!" پھر یہ آواز میرے پلنگ کے بالکل قریب آجاتی ہے "بھئی اب اٹھو بھی۔ کیا ثبوت اور بانہال نے تمہیں میرے ساتھ ہی رت جگا سکھایا تھا۔ پھر اب آدابِ سحر خیزی سے یہ انحراف کیوں؟"

میں لحاف کے اندر ہی سے پوچھتا ہوں "کیا صبح ہو گئی؟"

اور الپورب بڑے جذباتی انداز میں جواب دیتا ہے کہ "وہ صبح جس کے ہم انتظار میں ہیں۔ جانے کب ہو۔ البتہ وہ صبح جلد ہی ہونے والی ہے۔ جس کے ابھرنے پر میں کرفیو نہیں رہتا۔"

اور جس کے بعد میجر خزان سنگھ کے کاروباری اوقات ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے ٹرک پٹھان کوٹ کی طرف جانے کی بجائے محاذِ جنگ کی طرف سامانِ رسد اور سامانِ جنگ لے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور میجر خزان سنگھ دوستوں کا دوست ہونے کا کم از کم اگلی شام تک کوئی ثبوت نہیں دے سکتا۔" میرے ذہن پر ابھی تک میجر خزان سنگھ کے ٹرک سوار تھے۔ اس لئے میں الپورب کے جذباتی انداز کو اپنے اس اظہار سے اور واضح کر دیتا ہوں۔

الپورب کہتا ہے۔ "معلوم ہوتا ہے۔ میری طرح تمہیں بھی یہ ٹرک چین کی نیند نہیں سونے دیتے۔" میں مسکراتا ہوں۔ مگر چونکہ اندھیرا ہے۔ اس لئے الپورب میری مسکراہٹ نہیں دیکھ سکتا۔ ان دنوں شہر میں بجلی پر خاصی پابندیاں ہیں۔ اور جموں کا بجلی گھر رات کے دس بجے سے لے کر صبح کے آٹھ بجے تک سارے شہر میں کہیں بجلی نہیں پہنچاتا۔ الپورب اب اندھیرے میں ہی ٹٹول ٹٹول کر ایک کرسی تلاش کر لیتا ہے اسے میرے پلنگ کے قریب گھسیٹ کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر سگریٹ سلگا کر کسی اور موضوع کی بجائے اس موضوع پر گفتگو کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہے کہ اندھیرے میں سگریٹ پینے کا بالکل مزہ نہیں آتا۔

اور ابھی اس موضوع پر وہ کوئی سیر حاصل بحث نہیں کر چکتا۔ کہ دفعتہً اسے کچھ خیال آتا ہے۔ اور وہ اندھیرے میں ہی ٹٹولتا ہوا وہاں جا پہنچتا ہے جہاں ٹیلیفون رکھا ہے۔ اور پھر مجھے اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جو وہ ٹیلیفون پر کسی کے ساتھ کر رہا ہے ——— "میں کیلاش ہوں۔ کیلاش چند سپرنٹنڈنٹ پولیس۔۔۔۔ جی ہاں مجھے اُس وقت سرکاری کام کرنا ہے۔ ہاں یو۔ این۔ او کے

لئے رپورٹ تیار کر کے بھیجنی ہے...... ہاں۔ اسی وقت۔ آج صبح ہی ...... کوئی حرج نہیں...... میں جانتا ہوں۔ کہ سارا محلہ روشن ہو جائے گا۔ مگر یہ ضروری کام ہے...... ٹھیک ہے..... ہاں۔ اسی وقت چاہیئے...... شکریہ......"

اور پھر کھٹاک سے ریسیور رکھنے کی آواز۔ اپورب کا ایک قہقہہ۔ اور اس کے بعد جھپاک سے روشنی کا ایک طوفان۔ اپورب بجلی گھر والوں کو ٹیلیفون کر رہا تھا۔ ان دنوں جموں کے ہر افسر کے وارے نیارے ہیں۔ اور پھر کیلاش کا نام۔ اور یو این او کا بہت بڑا نام ——

اب میں بستر پر اکڑوں بیٹھ جاتا ہوں۔ اور اپورب کے ساتھ سگریٹ نوشی شروع کر دیتا ہوں۔ سگریٹ پینے کا روشنی میں ہمیں واقعی لطف آ رہا ہے۔

دفعتاً رات کا غرور ایک دفعہ پھر ٹوٹتا ہے۔ باہر ایک اور فوجی ٹرک کھڑکھڑاتا ہوا گذر رہا ہے۔ یہ غالباً آج کی رات کا آخری ٹرک ہے۔ جو ایک اور صاحب جائیداد رام رکھا مل کو۔ یا دین دیال کو۔ یا کسی آڑھتی۔ بزاز یا صراف کو مع اُس کی دولت کے پٹھان کوٹ لے جا رہا ہے۔

اپورب دفعتاً مجھ سے پوچھتا ہے "جانتے ہو۔ آج کل کشمیر کے ہر محاذ پر ہندوستانی سورما مار کیوں کھا رہے ہیں" اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی جواب دیتا ہے۔ کہ "اِن سیٹھوں کی بزدلی کی وجہ سے اور آزاد ہندوستان کے میجر خزان سنگھ جیسوں کی وجہ سے" اور اِس کے بعد مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ مجھے بتاتا ہے۔ کہ آج کل میجر خزان سنگھ کا کاروبار بہت زیادہ پھیل چکا ہے۔ اور اس کے ٹرک اب اِن لکھ پتی اور کروڑ پتی لوگوں کو پٹھان کوٹ تک پہنچانے کے علاوہ

ممنوعہ علاقوں سے بیوپاریوں کا گھی باہر نکالنے اور راشن کا ناروا نہ بھر کر لانے میں بھی لگے ہوئے ہیں۔ اور اس لئے اتنے کاموں کے ہوتے ہوئے محاذِ جنگ پر رسد پہنچانے اور سامانِ جنگ پہنچانے والے کام کا سست پڑنا لازمی ہے اور اس صورت میں یہ بھی لازمی ہے۔ کہ محاذ پر برف اور سردی میں لڑنے والے سورما آگے کی جانب بڑھنے کی بجائے پیچھے کی طرف دھیان لگائے رکھنے کی طرف زیادہ مائل ہوں۔ اور جہاں تک ہم ریاستیوں کا تعلق ہے۔ سچی بات تو یہ ہے۔ کہ ہمیں جو اپنی قوتِ بازو سے زیادہ میجر خزان سنگھ جیسے پڑوسیوں پر آسرا لگائے بیٹھے ہیں اپنی کم ہمتی کی سزا کسی نہ کسی طور تو ملنی ہی چاہیئے۔"

اپورب کہتا ہے "کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے۔ ہمیں یہ سزا مل رہی ہے۔ اور پھر مجھے کبھی کبھی یہ بھی خیال آتا ہے۔ کہ وہ لوگ جنہوں نے ابھی تک اس سزا کو سزا نہیں سمجھا۔ انہیں اس سے بھی زیادہ سزا ملے گی۔ آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو پرسوں......"

تھوڑی دیر اپورب خاموش رہتا ہے۔ اور پھر کہتا ہے "میں سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ میں کسی قوم اور ملک کا لیڈر بھی نہیں ہوں۔ پر جموں کے صوبے میں گاؤں گاؤں پھرنے کے بعد اب یہاں آ کر مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے۔ کہ شاید یہ سب کچھ سراب ہے۔ اور شاید اب تک ہم قفس میں ہی گرفتار ہیں۔ اور ہماری یہ نئی جد و جہد اور بھاگ دوڑ محض ہماری خود فریبی ہے۔ یہ سب کچھ ایک ایسا آشیانہ بنانے کے لئے تنکے فراہم کرنے کی کوشش ہے۔ جو قفس کی تیلیوں کے اندر رہتا ہے۔

پھر اپورب بڑی دھیمی اور بڑی دکھ بھری آواز میں گنگنانے لگتا ہے —

مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر   کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

اور پھر وہ کہتا ہے "ہائے غالب۔ تو جس نے کہ یہ شعر کہا۔ سدا بہار ہے۔ تو ۱۸۵۷ء کے غدر کے زمانے میں بھی زندہ تھا۔ اور آج ۱۹۴۸ء کی جنوری کی اس دو تاریخ کو بھی زندہ ہے۔ پر اے کاش تو اس وقت جموں میں ہوتا"

غالب کے اس شعر کو وہ بڑی دیر تک گنگناتا رہتا ہے۔ اور کچھ سوچتا رہتا ہے اور پھر اُسے اُن ترقی پسند ادیبوں کا خیال آجاتا ہے۔ جو ہندوستان سے جموں کے اس انقلابی دور کی تاریخ مرتب کرنے کی غرض سے خام مواد ڈھونڈنے آئے تھے۔ اور وہ کہتا ہے "ناممکن ہے۔ ناممکن۔ آج کے جموں کی کوئی تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔ کیونکہ ہندوستان میں آج لاکھ راجندر سنگھ بیدی ہوں۔ رامانند ساگر ہوں۔ رام چندر تیواری۔ ٹیکھر اور نو تیج ہوں۔ اور اچلا کے ساتھ ساتھ اُس کی مدد کرنے کے لئے اُس کا پتی سچدیو بھی ہو۔ آج کے غم کی سچی تصویر کوئی نہیں کھینچ سکتا۔ آج کی سچی تصویر کوئی اہلِ درد ہی کھینچ سکتا ہے۔ اور ہندوستان میں اب کوئی اہلِ درد نہیں رہا۔ ہندوستان میں کوئی غالب نہیں رہا۔ ہندوستان میں صرف غالب کی قبر رہ گئی ہے۔ اور وہ اسپیشل ٹرین جس میں بند کر کے غالب کا دیوان ہندوستان سے پاکستان بھیجا گیا تھا۔ کوئی ہندوستانی نہیں لوٹ سکا۔ انہوں نے سب کچھ لوٹا۔ مگر یہ نایاب دولت نہ لوٹ سکے۔ اس لئے سب بے سود ہے......"

اور پھر اپورب مجھے ایک واقعہ سناتا ہے جن دنوں ہندوستان کے یہ مشہور و معروف ترقی پسند ادیب اپنی اس تاریخی مہم پر آئے ہوئے تھے۔ ایک دن اپورب کو بھی ان کے ساتھ پناہ گیروں کے اُس کیمپ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جو پرانے انڈسٹریل اسکول میں ہے۔ اس اسکول کے در و دیوار مصوری کے کمالات کا آئینہ ہیں! اور یہاں

آرٹ کے پرستاروں کے ذوقِ نظر کی تسکین کے لئے قدم قدم پر مصوری کے بڑے بڑے شاہکار نظر آتے ہیں۔ لیکن زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اب یہاں زندگی کے بعض دیگر انواع کے مرقعے بھی آگئے ہیں۔ فسادات کی وجہ سے جب یہ اسکول ویران ہو گیا۔ تو حکومت نے بہت سے بے گھر لوگوں کو عارضی طور پر یہاں آباد کر دیا۔ چنانچہ اب یہاں کی دیواروں پر اگر آرٹ بکھرا ہوا ہے۔ تو ان دیواروں کے پاس ہی اُجڑی ہوئی انسانیت کے بہت سے نمونے بھی موجود ہیں۔ اور یوں زندگی اور آرٹ بڑے انوکھے انداز میں ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں۔ اپورب کہتا ہے۔ کہ جب وہ ان ادیبوں کے ساتھ وہاں گیا۔ تو اُس نے دیکھا۔ کہ ان لوگوں کے لئے زندگی سے زیادہ آرٹ میں کشش تھی۔ اور جو زندگی۔ اور ادب کا ملاپ کروانے یہاں آئے تھے۔ اُن کے آرٹ کی نگاہیں زندگی کی تلخیوں کو دیکھتے ہی بدل گئیں۔ کیمپ میں داخل ہونے پر سب سے پہلے انہیں جس شے نے متوجہ کیا۔ وہ دیوار پر کی ایک تصویر تھی جس میں مصور نے ایک عورت کو ندی کے کنارے جھکے ہوئے اپنے گھڑے میں پانی بھرتے دکھایا تھا۔ تصویر میں اور چیزوں کے علاوہ عورت کی آنکھوں کی پلکیں خاص طور پر نمایاں تھیں۔ لیکن اب ان پلکوں سے بھی زیادہ نمایاں اس تصویر میں عورت کی وہ لمبی لمبی نوکدار مونچھیں نظر آ رہی تھیں۔ جو ان بے گھر لوگوں کے شوخ بچوں نے اپنے کوئلے کے قلم سے بنا رکھی تھیں۔ ان ترقی پسند ادیبوں نے جب زمانے کی ندی کے ساتھ بہنے والی زندگی کی حقیقت کا یہ رُخ دیکھا۔ تو انہوں نے اِسے ہی سب کچھ سمجھ لیا۔ اور پھر وہ ہنسنے لگے۔ اور اتنے ہنسے۔ کہ اب اُن کے قہقہوں میں اُس پناہ گیر عورت کی آواز دب کے رہ گئی۔ جو ان کے پاس کھڑی انہیں اپنی ایک بے حد نحیف ننھی سی بچی دکھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور اُن سے بار بار کہتی تھی "حضور۔ اس بچی کو دیکھئے۔ یہ ابھی چند دن پہلے

تک بڑی خوب صورت تھی۔ اب اس کیمپ میں آکر فاقوں نے میرا دودھ سکھا دیا ہے اور اس لئے یہ بھی دن بدن کالی۔ کمزور۔ اور بدصورت ہوتی جا رہی ہے۔ آپ شاید کوئی بڑے افسر ہوں گے۔ مجھ پر مہربانی کیجئے۔ اور ان کیمپ والوں سے کہئے۔ کہ یہ ہمیں راشن پورا دیا کریں۔ اور اگر یہ میری بچی کی خوبصورتی کو نہیں بچا سکتے۔ تو کم از کم اس کی زندگی تو اس سے نہ چھینیں ...." وہ کہتی رہی۔ پر ان ترقی پسند ادیبوں میں سے کوئی بھی اُس کی بات نہ سُن سکا۔ کیونکہ انہیں آرٹ کے ساتھ زندگی کے ملاپ کا پہلا انداز اتنا دلفریب معلوم ہوا تھا۔ کہ اس کے بعد وہ کسی اور طرف توجہ دے سکنے کے شاید موڈ میں ہی نہ رہے تھے۔ چنانچہ مظلوم زندگی انہیں پکارتی رہی۔ اور وہ صرف مضحکہ خیز زندگی ہی کو دیکھتے رہے۔ زندگی کی تلخی انہیں اپنا آپ دکھا کے اُن سے مدد کے لئے ہاتھ پھیلاتی رہی۔ پر وہ صرف اُسی زندگی کی طرف متوجہ ہو سکے۔ جو انہیں ہنسا سکتی تھی۔ شاید اُن میں اتنی ہمت ہی نہ تھی۔ کہ وہ زندگی کے آنسو بھی دیکھ سکتے۔ اور ان آنسوؤں کو اپنا سکتے۔

اپورب کہتا ہے: میں اُسی دن ہی جان گیا تھا۔ کہ یہ سارا معاملہ بس یونہی ہے۔ اور یہ اپنے نقادوں کی نظر میں خواہ لاکھ بڑے ہوں۔ اور ترقی پسند ہوں۔ پر میری نظر سے اُسی دن گر گئے تھے۔ جب میں نے انہیں انڈسٹریل اسکول میں دیکھا تھا۔ اور اس لئے میں سوچتا ہوں۔ کہ جبھی سے اس دور کی تاریخ شاید کبھی نہ کبھی جا سکے جیوں کی کائنات پر جو کچھ گذری۔ اور اس کائنات کے ذرے جو کچھ اس وقت بیان کر رہے ہیں۔ شاید اُنہیں سننے والا اس وقت پہنچے گا جب یہ ذرے بھی ناامید ہو کر خاک میں مل گئے ہوں گے اور پھر کون جانتا ہے۔ کوئی کبھی پہنچے گا بھی۔ یا نہیں..... کون جانتا ہے؟ ......"

اپورب بے حد ملول ہو رہا ہے۔

*

کمرے میں ایک بجلی کی روشنی پر باہر سے آنے والی روشنی آہستہ آہستہ غالب آنے لگی ہے۔ یہ صبح کے آثار ہیں۔ غالباً صبح ہو گئی ہے۔

"صبح ہو گئی ہے" میں کہتا ہوں۔

پر اپورب کہتا ہے: "نہیں صبح نہیں ہوئی۔ یہ جھوٹی صبح ہے۔ کیونکہ جب تک میجر خزان سنگھ اور اس کے ساتھی موجود ہیں۔ اور جب تک وہ سیٹھ موجود ہیں۔ جن کی وجہ سے خزان سنگھ کا وجود قائم ہے۔ صبح کبھی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ صبح اس وقت تک نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ ہمارے ادیب سرکاری مہمان خانوں میں رہ کر ادب کی تخلیق کرتے رہیں گے۔ گائیڈ کی آنکھ سے زندگی کی حقیقتوں کا مشاہدہ کریں گے! انسانوں سے زیادہ دیواروں کو اہمیت دیں گے! اور اسی میں خوش رہیں گے۔ کہ انہیں ترقی پسند کہا جاتا ہے اس وقت تک صبح کبھی نہیں ہو سکتی۔ اور دوست۔ وہ صبح ابھی بہت دور ہے۔ جس کا ہم تم انتظار کر رہے ہیں"

دور سے کیلاش کی آواز آتی ہے۔ وہ کسی نوکر کو ڈانٹ رہا ہے "بدذات۔ انہیں روز بتاؤ۔ پھر بھی بھول جاتے ہیں۔ ابھی تک میرے جوتوں پر پالش تک نہیں ہوئی۔ دیکھتے نہیں۔ کہ صبح ہو گئی ہے۔ اور مجھے کام پر جانا ہے"

کیلاش کی صبح ہو گئی ہے۔ لیکن اپورب کی صبح ابھی بہت دور ہے۔

فرنیٹر اکیچنج پریس لمیٹڈ میں
حکیم عبدالغنی پبلشر چوک نیا بازار راولپنڈی کے زیر اہتمام چھپا